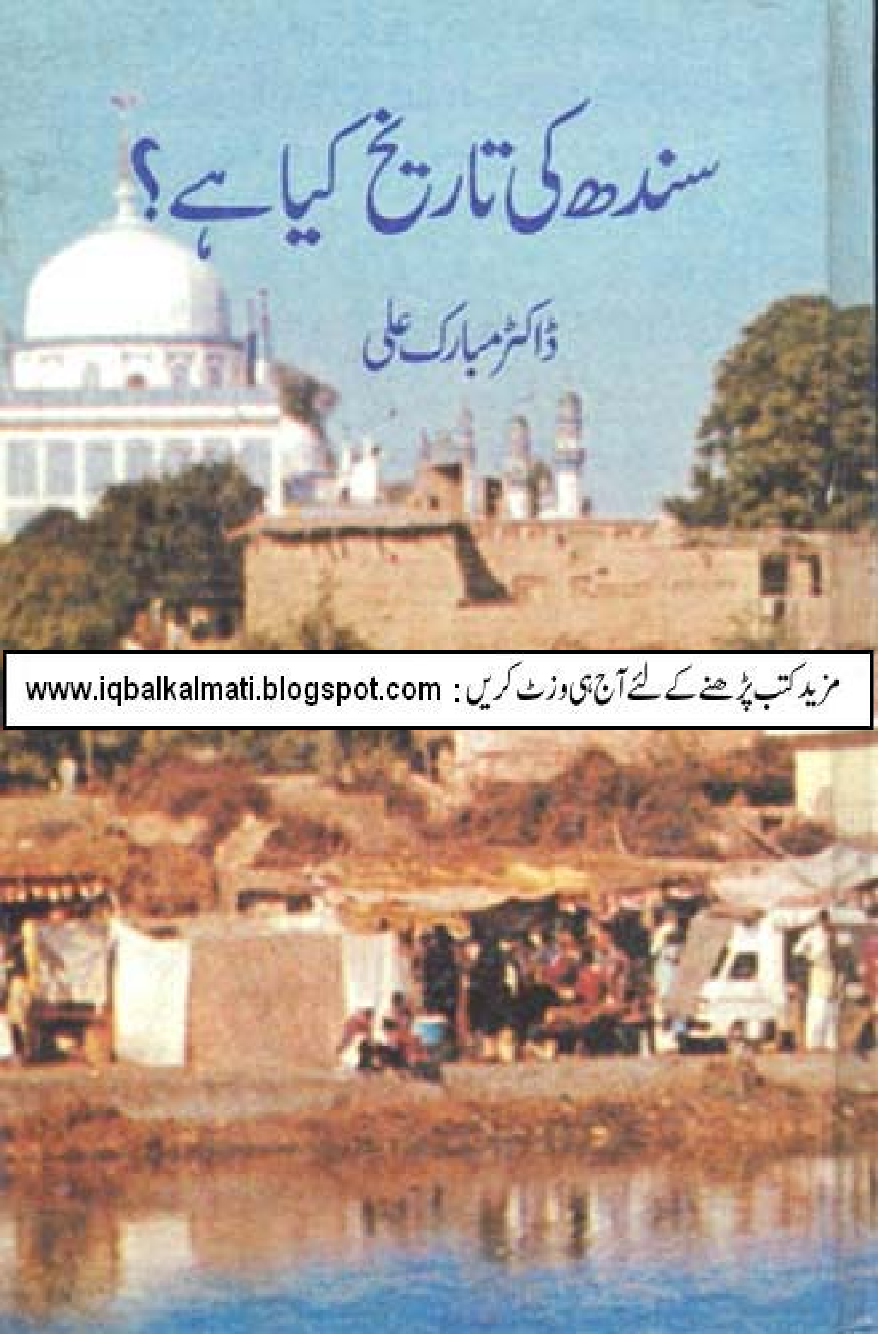


سندھ کی تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

مترجم: سردار عظیم اللہ خاں

تاریخ پبلیکیشنز
ٹیک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

An Urdu Translation of

"A Social and Cultural History of Sindh"

(Based on the Account of the European Travellers Who visited Sindh)

By: Mubarak Ali

نام کتاب : سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ

مصنف : مبارک علی

مترجم : سردار عظیم اللہ خاں

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : تاریخ پبلیکیشنز، لاہور

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : نین تارا

اشاعت : 2015ء

قیمت : -/600روپے

ملنے کا پتہ:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68 مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1, 37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

● لاہور ● کراچی ● حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

پروفیسر اعجاز قریشی

کے نام

فہرست

سندھ کا دورہ کرنے والے یورپی سیاح

1- پیڈرو باریتو ڈی رے زند(Pedro Barreto de Resende)بعہد سترہویں صدی عیسوی۔
2- سی۔ نیوپورٹ(C. Newport)1612ء۔
3- نکولس وٹنگٹن(Nicholas Withington)1612ء-1616ء۔
4- ایف۔ ایس۔ مانریق(F. S. Manrique)1640ء-1641ء۔
5- این۔ منوچی(N. Manucci)1659ء-1703ء۔
6- اے۔ ہملٹن(A. Hamilton)1688ء-1723ء۔
7- این کرو(N. Crow)1799ء-1800ء۔
8- این۔ ایچ۔ اسمتھ(N. H. Smith)1804ء۔
9- ایچ۔ ایلس(H. Ellis)1809ء۔
10- ہنری پوٹنگر(Henry Pottinger)1809ء۔
11- جیمز برنس(James Burnes)1827ء۔
12- چارلس میسن(Charles Masson)1830ء۔
13- آرتھر کونولی(Arthur Conolly)1830ء۔
14- الگزنڈر برنس(Alexander Burnes)1831ء۔
15- ولیم پوٹنگر(William Pottinger)1831ء-1832ء۔
16- ای۔ ڈلہوسٹ(E. Delhoste)1831ء-1832ء۔
17- جان ووڈ(John Wood)1835ء-1836ء۔

18- آر۔ایچ۔کینیڈی(R. H. Kennedy)1838ء-1839ء۔

19- ڈبلیو۔جے۔ایسٹ وک(W. J. Eastwick)1839ء۔

20- ٹی۔پوسٹن(T. Posten)1840ء-1841ء۔

21- آئی۔این۔ایلن(I. N. Allen)1841ء-1842ء۔

22- لیوپولڈ وون اورلچ(Leopold von Orlich)1842ء۔

23- رچرڈ برٹن(Richard Burton)1848ء-1878ء۔

24- ہوگو جیمز (Hugo James)1854ء۔

25- ایڈورڈ آرچر لانگلے(Edward Archer Langley)1858ء۔

حکمرانان سندھ

عہد مغلیہ میں سندھ

1737ء-1592ء

کلہوڑہ عہد

1782ء-1700ء

تالپور عہد

1843ء-1782ء

حیدرآباد کے تالپور حکمراں

میر فتح علی خان	1802ء-1782ء
میر غلام علی خان	1811ء-1802ء
میر کرم علی خان	1828ء-1812ء
میر مراد علی خان	1833ء-1828ء
میر نور محمد خان	1840ء-1833ء
میر نصیر خان	1843ء-1840ء

خیر پور کے تالپور حکمراں

میر سہراب خان	1784-1830ء
میر رستم خان	1830-1842ء
میر مراد علی خان اول	1843-1894ء

میر پور کے تالپور حکمراں

میر طرہ خان	1782-1829ء
میر علی مراد خان	1829-1837ء
شیر محمد خان	1837-1843ء

دیباچہ

سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ کوان یورپی سیاحوں کے بیانات کی روشنی میں ان کے بیانات وتاثرات کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ سیاحوں کے بیانات اوران کے تاثرات کوقبول کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس بات کو سمجھ لیا جائے کہ یہ دوسرے معاشروں اوران کی ساخت وسرگرمیوں کو اپنی روایات، اقدار اور تعصّبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے اپنے مختصر قیام کے عرصہ میں یہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی اندرونی تشکیل اوراس کے رجحانات کو پوری طرح سے سمجھ سکیں۔ مثلاً جہاں سندھ کے عوام کا تذکرہ ہوتا ہے تو امن کے بارے میں ان کے تاثرات یہ ہیں کہ یہ لوگ کاہل، سست اور نشہ کرنے والے ہیں۔ اب اگر کاہلی وسستی کے عوامل کو دیکھا جائے تو اس میں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ اگر کسی ملک میں پیداوار ضروریات سے زیادہ ہوں اور لوگوں کے بنیادی تقاضے آسانی سے پورے ہو جائیں تو وہ کام کو آرام سے پورا کرتے ہیں۔ فرصت کے لمحات کو سیر وتفریح یا بات چیت وگپ شپ میں گزارتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی پر حاوی نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ کام کو اپنی مرضی کے مطابق تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

کاہلی وسستی کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب لوگوں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں ملتا ہے تو وہ کام میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ اس صورت میں سستی وکاہلی ان کی مزاحمت کے طریقے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کی سستی وکاہلی کو اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

سیاحوں کے ان بیانات سے ہمیں اس عمل کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے شہر کس طرح سے پسماندگی وزوال کا شکار ہوئے، خصوصیت سے ٹھٹھہ وشکار پور کے زوال کو ان بیانات کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شہروں کے حالات سے اس وقت کی سیاسی وسماجی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

سیاحوں نے خصوصی طور پر لوگوں کے توہمات، اور مذہبی تعصّبات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر اس کو بھی حالات کے تحت دیکھنے کی ضرورت ہے۔ توہمات ہر اس معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں کہ جہاں علم ٹھہرا ہوا ہو، اور لوگ فطرت کی آفتوں اور حکمرانوں کے استحصال کا شکار ہوں۔ ایسی صورت میں لوگ ان توہمات

میں پناہ لیتے ہیں۔ اگر چہ اس بات کو سیاحوں نے بہت زیادہ اُبھارا ہے کہ سندھ میں ہندوؤں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا تھا، مگر اب تحقیق کی روشنی میں ثابت ہو گیا ہے کہ سندھ کے حکمرانوں پر یہ الزام غلط لگایا گیا ہے، کیونکہ سندھی ہندو عاملوں اور تاجروں کی جو سماجی حیثیت تھی وہ ان بیانات سے مختلف ہے۔

سندھ کے حکمرانوں کے بارے میں بھی سیاحوں کے یہ تعصّبات پوری طرح سے سامنے آتے ہیں۔ سندھ کے دربار کو مغل دربار یا ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے درباروں کی روشنی میں دیکھنا سخت غلطی ہے، کیونکہ تالپور حکمراں قبائلی سماج سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ان کے ہاں ادب، آداب اور رسومات میں وہ شائستگی نہیں تھی جو دوسرے درباروں میں تھی۔ برطانوی ہند سے جو سفارت کار آئے وہ دربار، حکمرانوں اور امراء کے بارے میں تعصّبانہ رویہ رکھتے ہیں، اور بار بار ان کے ہاں یہ اظہار بھی ہوتا ہے کہ سندھ کو فتح کرنا ان کے لئے آسان ہے کیونکہ میروں کے پاس نہ تو فوجی طاقت ہے اور نہ ان میں اتحاد ہے۔ ان سفارت کاروں نے سندھ پر قبضہ سے پہلے ہی سندھ کے بارے میں ہر قسم کی معلومات کو اکٹھا کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں اسے فتح کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود ان سیاحوں اور سفارت کاروں نے سندھی معاشرے کے ان اہم پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے کہ جو اکثر مقامی لوگوں کے لئے عام ہوتی ہیں، اور وہ انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہمیں ہمعصر تاریخوں میں ایسے مواد کی کمی نظر آتی ہے کہ جو سماجی و ثقافتی پہلوؤں کو اُجاگر کریں، اس لئے ان کے بیانات سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی نظر میں ہمارا امیج کیا تھا؟ کیونکہ دوسرا جس بے رحمانہ طریقہ سے تنقید کرتا ہے، ہم اس طرح سے خود کو نہیں دیکھتے ہیں۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ ان بیانات میں سندھ کی ایک منفی تصویر کشی کی گئی ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ چیلنج کا جواب دیا جائے۔ کیونکہ اس امیج کا اثر ابھی تک باقی ہے اور سندھ کے لوگ خود کو اس آئینہ میں دیکھ کر اپنے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔

آخر میں سردار عظیم اللہ ایڈووکیٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے محنت اور دلچسپی کے ساتھ اس چیز کو اُردو میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی

مارچ 2015ء

لاہور

پہلا باب

جغرافیہ

حدود

(1)

سندھ کا سارا علاقہ میر فتح علی خان، میر سہراب خان اور میر ٹھارہ خان کی حکمرانی میں ہے۔ اپنی حالیہ وسعت میں سندھ کی موجودہ حدود شمال میں دریا کے مغربی کنارے پر نوشور (Noshur) تک ہیں جو سکھر کے اوپر تیس میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے جو شکارپور سے چند میل ہی نیچے ہے (یہ دونوں مقامات معہ قلعہ بھکر کے بادشاہ کابل کے قبضے میں ہیں) شمال میں ہی دریا کے مشرقی کنارے پر اوباویرا (Obavera) تک اس کی حدود ہیں۔ یہ قصبہ بی بی گنڈی چوک(Bibi Gundi Chock) سے ذرا ہی اوپر کی طرف ہے جو بہادر خان کی جنوبی سرحد میں داؤد پوترا کے علاقے کے ساتھ ہے۔ مشرق میں ریگستان ہے۔ مغرب میں بلوچستان اور مکران کے پہاڑ ہیں اور جنوب میں بحر ہند ہے۔ اوپر بیان کردہ علاقے میں میر سہراب خان دریائے سندھ کے تمام مشرقی علاقے پر قابض ہے جو نوشور اور اوباویرا کے قصبے کے برابر صحرا کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ میر طرہ خان کا علاقہ اس ڈیلٹے کے مشرقی حصے میں ٹھٹھہ کے جنوب مشرق سے شروع ہوتا ہوا شاہ بندر اور نالہ سنکرا(Nulla Sunkra) سے گزر کر سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔ سب سے بڑا دریا جس کو اہل یورپ انڈس(Indus) کہتے ہیں اس کو ہندو لوگ ''سندھو'' کہتے ہیں۔ اس نام کا اطلاق اس پورے علاقے پر بھی کیا جاتا ہے جو مغرب کی جانب ہلی گاندھی(Hally Ghandhe) سے سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کو اپنی برتری کی بناء پر لار (Lar) بھی کہا جاتا ہے۔ (این کرو، صفحات 16-15)

(2)

ساحل سمندر کے ساتھ اپنی چھوٹی پٹی کی وجہ سے جو ایک سوتیں میل لمبی ہے، سندھ کو کسی مثلث کی شکل خیال کیا جا سکتا ہے، اپنی زیادہ سے زیادہ لمبائی میں یہ تقریباً پانچ سو میل ہے اور چوڑائی میں ایک سو پچاس میل سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کی سرحدوں پر مشرق میں کچھ یا کچ (Kutch) (جس سے اس کو دریائے نارہ (Narrah) اور دریائے گونی (Goonee) الگ کر دیتے ہیں جو سابقہ دریائے استواری (Estuary) کا حصہ تھے) اور ریگستان تھر ہیں۔ مغرب میں لس مکران (Lus Mukran) اور بلوچستان اور کچھ گنڈاوا (Kutch Gundava) ہیں۔ ان میں سے اول الذکر سے یہ علاقہ ایک اونچے پہاڑی سلسلے کی وجہ سے کٹ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کوہ دو یا تین مقامات کے علاوہ، نا قابل عبور ہے۔ اس کے شمال میں کوہ ہالا، ملک ڈیرہ جات اور صوبہ بہاولپور ہیں۔ دریائے سندھ اس کو تقریباً دو مساوی حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے جن میں سب سے زیادہ زرخیز اور پیداواری خطہ مشرقی کنارے پر ہے۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحہ 10)

(3)

صوبہ سندھ کے شمال میں صوبہ کچ گنداوا، ضلع شکار پور اور بہاول خان الملقب بہ داؤد پوترا کے علاقے ہیں۔ جنوب میں بحر ہند اور کچ بجے کا کچھ حصہ ہے۔ مشرق میں ایک صحرائے سیط ہے جو اسے اجمیر، مارواڑ، اودے پور، جودھپور اور بیکانیر وغیرہ کی ریاستوں اور صوبوں سے علیحدہ کرتا ہے اور مغرب میں صوبجات لاس وجھالاوان ہیں۔ سندھ کی مصر سے مماثلت بہت زیادہ ہے کہ مبصر حیران رہ جاتا ہے۔ ایک ہموار میدان جس کے اندر ہی اندر ایک عظیم الشان دریا بہتا ہے جو اپنے دونوں کناروں کے ملحقہ کناروں کو سیراب کرتا ہے اور پھر ایک طرف سطح زمین ایک ریگستان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دوسری خشک، چٹیل پہاڑوں کا جوز مین اور آب وہوا دونوں کے لحاظ سے فائدہ مند نہیں ہیں۔

صوبے کی قدرتی حیثیت ایسی ہے کہ یہ ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کی مغربی سرحد پر ہے۔ اس کا دریا اس طرف سے حملہ کے خلاف ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے اور یہی رکاوٹ ہماری ملکہ بحر حکومت کے لئے کچھ آسانیوں کی آئینہ دار بھی ہے۔ اگر کبھی اسے ہندوستان کی طرف بڑھتی ہوئی

مخالفانہ قوت کے خلاف فوجی کارروائی کی ضرورت پڑے۔ لہٰذا یہ بے حد سیاسی اہمیت کا علاقہ ہے۔ گجرات اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام انصرام دیگر علاقوں سے اس کا ملنا ہی تجسّس پیدا کرتا ہے اور اس کے تاریخ و جغرافیہ کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس کے موجودہ حکمرانوں کی تیس سالہ حکومت اور اس کی بے نظیر تنگ ظرفی اور مشکوک پالیسی نے اس مطالعہ کو تازیانہ لگا دیا ہے۔ میرے بلوچستان کے حالیہ مشاہدے نے مجھے سندھ کے متعلق بھی معمولی سی تاریخی تحقیق کا موقعہ دیا کیونکہ یہ اس کا متصلہ علاقہ ہے اور پھر دونوں علاقوں کے مقامی باشندے ہم نسل ہیں لہٰذا میں اپنے مطالعات کا خلاصہ یہاں اس اُمید پر پیش کر رہا ہوں کہ یہ حرفِ آخر نہیں بلکہ آئندہ محققوں کے لئے نقطہ آغاز ہوسکتا ہے جب میں نے ابتداء میں اپنے لمحات فرصت مطالعہ سندھ پر صرف کرنے شروع کئے تا کہ انہیں شائع کرایا جا سکے تو مقصد یہ تھا کہ سندھ کی مفصل تاریخ لکھوں گا، لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا کہ یہ تو ایک موٹی کتاب ہوگی اور میرے پاس صرف پچھلے دوسو سال کے معمولی مسودات تھے جو نامکمل تھے اور پھر اس کتاب کے دیگر موضوعات میرے ذہن پر اتنے مستولی تھے کہ میں نے اپنی یہ کوشش ترک کر دی اور اب اپنے محدود مبلغ علم پر ایسا شرمسار ہوں کہ اگر میں نے مختلف سابقہ ابواب میں ان مندرجات کا ذکر نہ کیا ہوتا تو شاید میں اس باب کو ہی حذف کر جاتا۔

سن عیسوی سے چوتھی صدی پہلے صوبہ سندھ کا یونانیوں کو پہلی دفعہ اس وقت علم ہوا جب فوج نے سکندر کے حکم پر بھارت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا لہٰذا اس نے ہر چہ بادا باد کہتے ہوئے اپنی کشتیاں دریائے سندھ میں ڈال دیں حتیٰ کہ وہ سمندر تک پہنچ گیا اس وقت پنجاب سے سمندر تک جن علاقوں سے وہ گزرا ان میں کئی حکومتیں موجود تھیں۔ ان میں شمالی ترین سگدی تھی جسے بھکر کا موجودہ قلعہ یا شہر بتایا جاتا ہے جو دریائے سندھ کے درمیان میں ایک جزیرے پر بنا ہوا ہے اور تقسیم شدہ دھارے کے دونوں کناروں پر سکھر اور روہڑی اس کے مضافات ہیں۔ آئین اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ بعد میں منصورہ کہلائی لیکن غالباً یہ محض ایک عارضی نام تھا جو ہندوؤں پر حاصل کی گئی ایک فتح کی یاد میں اس علاقے کے عربی فاتحین نے اسے دیا تھا۔ اب بھی یہ ایک اہم جگہ ہے گو قلعہ بندیاں خراب ہوچکی ہیں لیکن کوئی ایسی دستاویز موجود نہیں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ اسے موجودہ نام بھکر کب دیا گیا؟ 416ھ (1001ء) میں مجھے یہ ذکر ملا ہے کہ مشہور شہنشاہ محمود غزنوی نے اس پر قبضہ کیا اور چند سال پہلے اسے پچیسویں خلیفہ عباسی، القادر باللہ نے مقامی سرداروں کے حوالے کر دیا تھا وہ آخری

خلیفہ تھا جو موجودہ سلطنت ایران کے مغرب کی طرف کے بعض علاقوں پر بھی قابض تھا۔

سکندر نے سگدی کا مقام دوبارہ تعمیر کروایا اور ایک دستہ فوج چھوڑ کر ایک حکمران موسومہ بہ موسیکانوس کے علاقوں کی طرف چل پڑا، جنہیں یقینی طور پر موجودہ ضلع چندوکی سے شناخت کیا گیا ہے اور جو ان دنوں کے مورّخین کی صحت و صداقت کا واضح ثبوت ہے۔ میں نے پہلے ہی اس کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کو سیراب کرنے والے دریا کا ذکر کیا ہے اور ان قدما نے یہاں ایک وسیع جزیرہ کی تصویر کشی کی جو ایک ندی سے وجود پذیر ہوتا تھا جو خود دریائے سندھ میں دوبارہ جاملتی تھی اور اسے انہوں نے پراسیانے یعنی سرسبز کا نام دیا۔ اس کے صدر مقام کا نام واضح نہیں ہے لیکن ڈاکٹر انیول کا خیال ہے کہ یہ من نگر تھا جو دراصل میان نگر یا وسطی شہر کا نام تھا، لیکن مجھے اس کے بیان کردہ محل وقوع کی کوئی جگہ نہ مل سکی۔

ان دنوں صدر مقام لاڑکانہ ہے جو اپنے ہم نام دریا پر واقع ہے اور سندھی امیروں کے لئے نہایت اہم چوکی ہے، کیونکہ وہ اپنی سلطنت میں داخل ہونے والے سوداگروں سے پہلی دفعہ یہیں چونگی وصول کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کچ گنداوا کے بلوچوں کی مداخلت سے بچنے کے لئے یہیں ایک بڑی فوج متعین رکھتے ہیں۔

جب سکندر موسیکانوس کے پاس تھا تو اس نے دو سرداروں کے خلاف فوج کشی کی۔ انہیں آکسیکانوس اور سامبوس کہتے ہیں۔ موخر الذکر اول الذکر کی ریاست سے ملحقہ پہاڑی علاقوں میں رہتا تھا لہٰذا پتا چلا کہ وہ ان قبائل کا سردار تھا جو ان دنوں جھالاوان کے مشرق کے سلسلہ کوہ کے علاقوں میں رہتے تھے اور جو سہوان پر دریائے سندھ کو چھوتے ہیں۔

دراصل دریا کے مغرب کی طرف کوئی اور پہاڑ یا پہاڑیاں نہیں اور مشرق کی طرف ایک ہموار میدان ہے اور پھر کہیں صحرا پار کرنے کے بعد ہم ہندوستان کی راجپوت پہاڑیوں تک پہنچتے ہیں۔ ایک سردار کی شکست اور دوسرے کی موت کے بعد مقدونوی فاتح دریا کی طرف واپس آیا اور معلومات کے مطابق اس نے ایک کُھلا مقام تعمیر کیا ہے جسے میں واضح طور پر موجودہ سہوان کی جگہ پر خیال کروں گا جہاں قلعہ ایک اونچی پہاڑی پر ہے جہاں سے دریائے سندھ اور دریائے لاڑکانہ کے گھاٹوں پر نظر رکھی جاسکتی ہے اور اردگرد کے علاقوں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد بری اور بحری مہم ٹپالہ پہنچی جو دریا کی شاخوں کے ساتھ ڈیلٹا کے دہانہ پر تھا، لیکن قدیم بیانات کے مطابق اس کی پورے سندھ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور اسے ٹھٹھہ یا حیدرآباد سے منسوب کرنا

بالکل نامناسب ہے۔

ٹپالہ میں فوج کے قیام کے دوران سکندر اپنا کچھ بیڑہ لے کر دو دفعہ سمندر کو گیا اور ایرئین کے مطابق اس نے دریا کے صرف دو دہانے دیکھے۔ یہ قابل ذکر ہے کہ صرف یہی دو دہانے یعنی مشرقی اور مغربی ان تیس سالوں میں قابل جہاز رانی تھے اور اگر علی بندر پر پشتہ نہ بنتا جیسا کہ میں نے پچھلے باب میں لکھا ہے تو آج بھی صرف یہی دو دہانے جہاز رانی کے لائق ہوتے۔

جب صوبجات لاس ومکران سے فوج کے گزرنے کی ضروری تیاریاں ہوچکیں تو بحری بیڑہ نیارکس کی سرکردگی میں دے دیا گیا تاکہ وہ سمندر کے راستے بری فوجوں سے بابل میں آ ملے۔ اس بیڑے کا دریائی اور پھر ساحلی سفر راس اریس (اب راس موز، سندھ کا آخری مغربی مقام) تک میرے مقصد سے غیر متعلق ہے۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

آب وہوا

سندھ کی آب وہوا ان تمام علاقوں میں بہت زیادہ غیر موزوں ہے جو زیر آب آ جاتے ہیں اور اسی لئے ان علاقوں میں خاص طور پر ڈیلٹا اور اس کے آس پاس میں جب پانی اُتر آتا ہے تو مٹی کی سڑاند اور جزوی جمود شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی بدقسمتی کے کھاتے میں کچھ ایسی بیماریاں بھی ہیں جو یہاں کے مقامی باشندوں میں بھی پائی جاتی ہیں جیسے ملیریا، بخار، دمہ، دق، وجع المفاصل (Sheumatism) ہیں۔ یہ بیماریاں ہوا میں رطوبت اور گندگی کا نتیجہ ہیں۔ گرمی کے مہینوں میں سندھ میں سمندر کے قریب تو درجہ حرارت ہندوستان کے اکثر علاقوں کی طرح سے ہوتا ہے۔ لیکن جب تم شمالی جانب جاؤ تو یہ گرمی جان لیوا حد تک بڑھ جاتی ہے۔ ہر سال دو ماہ کے لئے سیوستان میں گرم ہوائیں اتنی تیز چلتی ہیں کہ قندھار کی جانب جانے والے راستے پر دن میں سفر کرنا ناممکن ہوتا ہے اور مسافروں کو اتنا مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ خیمہ زن ہو جاتے ہیں۔ سندھ میں سردیاں بھی بہت شدید ہوتی ہیں لیکن اس حد تک نہیں ہوتیں جتنی کہ گرمیاں حبس پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ (این کرو، صفحہ 17)

زمین

جب سیلاب آتا ہے تو ملک کی زرخیزی مصر کی زرخیزی کی طرح ہو جاتی ہے۔ یہ زمین

غیر یقینی حالت اور کم تر حیثیت کے تابع ہے۔ یہاں کا پانی اپنی واپسی، روانی اور مقدار میں تسلسل کی وجہ سے ماہ اپریل کے اواخر میں بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور ستمبر میں اُترنے لگتا ہے۔ اس سالانہ نعمت کا ذریعہ اس برف کے پگھلاؤ کو خیال کیا جاتا ہے جو شمالی علاقوں میں ہوتی ہے لیکن عموماً بارش کی آمد پر بھی یقین رکھا جاتا ہے، اور جب پانی سب سے اونچی سطح پر پہنچ جائے تو پھر اس کے اُترنے میں بڑی تیزی ہوتی ہے۔ جہاں سے دریا گزرے وہاں سے علاقے کی نوعیت کے مطابق دریا کی چوڑائی بھی بدلتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عام طور پر یہ دونوں اطراف میں اپنے کناروں سے آگے پانچ میل تک مزید پھیل جاتا ہے، اور بعض علاقوں میں تو بہت ہی زیادہ خصوصاً ڈیلٹا میں کہ جہاں زمین سپاٹ ہے وہاں پر اس دریا کی بہت سی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ سیوستان میں بھی ایسا ہی ہے کیونکہ وہاں پر پانی کو ملک کے کسی اور حصے کی نسبت عملاً زیادہ محنت اور بڑی فنکاری سے روکا جاتا ہے۔ ملک سندھ کے حصے جو اس زیر آبی کے فوائد سے محروم رہتے ہیں وہ اپنی زرخیزی کے لئے دیگر ذرائع پر انحصار کرتے ہیں۔ اس خطے میں مون سون کی آمد پر سندھ میں بعض اوقات تو موسمی برسات ہو جاتی ہے اور بعض اوقات وہ اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ دریا سے بہت دور دراز کے علاقوں میں بہت کم کاشت کیا جاتا ہے مگر ان علاقوں میں گھاس کی ایک بہت ہی اعلیٰ قسم پیدا ہوتی ہے۔ وہاں گھوڑوں، اونٹوں اور دیگر مویشیوں کے چرنے کے لئے مختلف قسم کی چراگاہیں ہیں جو اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ غریب ترین لوگوں کے پاس بھی اپنے اور اپنے خاندانوں کے روزگار کے لئے کافی مقدار میں مواقع موجود ہیں۔ لیکن خشک سالی کے برسوں میں جو اکثر یکے بعد دیگرے دو تین مرتبہ آتے ہیں ان جانوروں پر بڑی مصیبت آتی ہے۔

ملک کے جس علاقے کو دریا سے پانی مل جاتا ہے اس کی مٹی بہت اچھی قسم کی ہے لیکن کئی حصوں میں سے وہ دلدلی اور ریتیلی ہے۔ دریائے سندھ کے کناروں کے پاس کاشتکاری میں بہت کم محنت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جب سیلاب چلا جاتا ہے تو ابھی مٹی نرم ہی ہوتی ہے، چنانچہ کسان اناج پھیلا دیتے ہیں اور ان کی بوائی خود بخود ہو جاتی ہے۔ زمین جو پہاڑوں تک پھیلی ہوئی ہے بالخصوص حیدرآباد کے نیچے کی جانب وہ پتھریلی اور سخت ہے مگر اس کے بہت سے حصے قابل کاشت ہیں۔ (این کرو، صفحات 17-16)

دریا

(1)

میں یہاں کیپٹن میکس فیلڈ اور اپنے مشاہدات میں دوبارہ دریائے سندھ کا ذکر کروں گا اور اس کے ملحقہ اضلاع کا بھی اور ان معلومات کا بھی جو میں نے دیگر ذرائع سے حاصل کی۔ اس مشہور دریا کے متعلق کسی وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک براہ راست سیدھے خط میں سمندر تک بہتا تھا لیکن جغرافیہ ایشیا پر حالیہ تحقیقات نے اس غلطی کو دور کر دیا ہے اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ایسی روشنی ڈالی ہے جس کی پُر امید علم دوستوں کو بھی توقع نہ تھی۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دریا شمالی عرض بلد کے پینتیسویں اور چھتیسویں درجوں کے درمیان سے اُبھرتا ہے اور چھ سات درجے مغرب سے جنوب کی طرف چلتا ہے اور ان برف پوش پہاڑوں سے گزرتا ہے جو کشمیر اور تبت صغیر کو علیحدہ کرتے ہیں۔ طول بلد کے بہترویں (72) درجے کے قریب یہ ایک دم جنوب کی طرف مڑتا ہے کیونکہ کاشغر کے پہاڑ آ جاتے ہیں اور پھر یہ 33.55 شمالی عرض بلد میں واقع قلعہ اٹک تک اپنا راستہ جنوب اور جنوب مغرب کے درمیان تبدیل کرتا ہے۔ اٹک کے شمال میں اسے ابوسین (اباسین، دریاؤں کا باپ) کہا جاتا ہے اور پھر اسے رود اٹک کہتے ہیں حتیٰ کہ یہ پنجند سے مل جاتا ہے جو پنجاب کے صوبوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہیں یہ سندھ میں داخل ہوتا ہے اور اس کے بعد اسے محض دریائے سندھ کہا جاتا ہے اور دریا عموماً بمعنی سمندر لیا جاتا ہے جو اس کی جسامت کے پیش نظر استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

پنجند سے ملنے کے بعد مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جنوب، جنوب مغرب کی طرف بہتا ہے اور ایک سو ساٹھ تک اس میں کوئی پیچ و خم نہیں اور یہ سکھر، روہڑی اور بھکر (دریا کے وسط میں ایک جزیرے پر واقع) کے پاس سے گزرتا ہے۔ ان مقامات سے سترہ میل جنوب میں ایک شاخ اس کی مغرب کو جاتی ہے اور ایک چکر کاٹ کر قصبہ سہوان میں پچاس میل کے چکر کے بعد اصل دریا میں آ ملتی ہے۔ اس شاخ کے دو نام ہیں۔ قمبر گنڈی اور دریائے لاڑکانہ، قمبر گنڈی اس لئے کہ یہ اس نام کے قصبہ کے پاس سے گزرتی ہے اور ایک جگہ پر تو دس بارہ میل لمبی جھیل بن جاتی ہے جو براہوی پہاڑوں کے عین دامن میں واقع ہے اور جس کے کناروں پر ناقابل عبور جنگلات اور نے زار ہیں جن میں شیر اور دیگر وحشی جانور رہتے ہیں۔ ضلع چنود کی اسی شاخ سے سیراب ہوتا ہے اور امیروں کے علاقے میں زرخیز ترین

حصہ ہے۔اس سے انہیں آٹھ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔مشرق کی طرف بھکر اور سہوان کے قریباً وسط میں دریائے سندھ سے ایک معاون دریا، خیر پور آ ملتا ہے جو اسی نام کے قصبہ کی وجہ سے مشہور ہے اور جس میں موسم برسات میں درمیانے وزن کی کشتیاں چل سکتی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کا اصل نام درلی ہے جو میرے خیال میں اس کے ضلع دریلی میں سے گزرنے کی وجہ سے ہے جہاں اس میں دو اور نالے ملتے ہیں۔ایک صحرا کے کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے لیکن اس کا اصل راستہ اب ریت میں گم ہو چکا ہے اور دریائے خیر پور کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے۔

دوسری شاخ قلعہ سہوان کے عین مقابل ہے جہاں دریا ایک درمیانہ درجے کا جزیرہ بناتا ہے جو خشک موسم میں چراگاہ کا کام دیتا ہے لیکن پانی چڑھنے پر ڈوب جاتا ہے۔اس شاخ سے کچھ چھوٹی شاخیں پھوٹتی ہیں اور تیس چالیس میل کے علاقے کو سیراب کرتی ہیں جبکہ اصل شاخ خوب پُر آب ہوتی ہے گو یہ اکثر خشک رہتی ہیں۔اس کے بعد ہم شاخ پھلیلی کی طرف آتے ہیں جو اس جزیرے کو گھیرے ہوئے ہے جس پر حیدر آباد بنا ہوا ہے۔ یہ سب سے بڑی ندی ہے اور وجہ ظاہر ہے کیونکہ دریائے سندھ اس کی علیحدگی سے فوراً اوپر پہاڑیوں کے سرے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور مغربی کنارے پر بند ہونے کی وجہ سے اتنا تیز رفتار ہو جاتا ہے کہ مشرق میں راستہ ملتے ہی یہ اپنا فاضل پانی اس میں پھینک دیتا ہے۔

پھلیلی حیدر آباد سے دس میل جنوب مغرب میں اپنے اصل دھارے سے آ ملتی ہے، گویا اس کے پیچ و تاب سے یہ فاصلہ دو گنا سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔اپنے مشرقی ترین مقام پر یہ گونی کو علیحدہ کرتی ہے جو کسی وقت سندھ کے دہانہ عظیم سے ایک دفعہ مشرق کی طرف سمندر میں گرتی تھی لیکن 1799ء میں مرحوم امیر فتح علی نے علی بندر کے آر پار ایک بند بندھوا دیا جہاں اس کے وسط میں ایک جزیرہ تھا اور اب ایک طرف تازہ پانی اس سے ٹکراتا ہے اور دوسری طرف مد کی لہر اس سے ٹکراتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رفاہی کام (جو حکمران خاندان کا واحد کارنامہ ہے) کی تعمیر سے پہلے آب شور بارہ میل تک اوپر آ جاتا تھا اور موسم بہار کی عمدہ فصلوں کو برباد کر دیتا تھا جو اب چوطرفہ علاقہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

بند سے نیچے دریا کو لونی یا نمکین کہتے ہیں بمقابلہ گونی یا گنی بمعنی پُر تاثیر یا نفع رسان۔پھلیلی کی عام چوڑائی دو سو سے چار سو گز ہے اور گہرائی دو سو چھ فیدام (چھ فٹ) تک ہے۔گنی بہت تنگ اور پُر خطر ہے

اور مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہر موسم میں خشک ہو رہا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سال میں صرف چار ماہ تک حیدر آباد اور علی بندر کے درمیان کچھ وزنی کشتیاں چل سکتی ہیں جبکہ چند سال پہلے یہ دریائی آمدورفت سال بھر جاری رہتی تھی اور بہت سا تجارتی سامان اسی راستے سے صوبے کے مشرقی حصوں میں پہنچتا تھا۔

پھلیلی کے دریائے سندھ میں دوبارہ آ ملنے کے بعد دریا تھوڑا سا جنوب کے مشرق کی طرف بل کھاتا ہے لیکن جلد ہی اپنے جنوبی، جنوب مغربی رخ پر واپس آ جاتا ہے، اور ٹھٹھہ کے بعد مزید مغرب کی طرف ہو کر ایک دم بحر ہند میں داخل ہو جاتا ہے۔

میں ایک دم اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کوئی اٹھارہ میل سمندر سے ورے کچھ ندیاں علیحدہ ضرور ہوتی ہیں اور اِدھر اُدھر گھوم گھام کر اس میں آ ملتی ہیں لیکن وہ صرف کھاڑیاں ہی ہیں جو دریا یا مد کی کیفیت کے مطابق خالی یا مملو ہوتی ہیں اور ان پر گھنے جنگل ہیں۔

دریائے سندھ کے دھارے کی تیزی موسموں کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں خواہ وہ خشک ہوں یا تر اور جن علاقوں سے یہ گزرتا ہے وہ بھی اسے متاثر کرتے ہیں۔

میرے خیال میں ٹھٹھہ کے اوپر یہ رفتار عموماً ڈھائی اور چار میل کے درمیان فی گھنٹہ ہے۔اس سے نیچے اس پر مدوجزر کا اثر ہوتا ہے جو اسے بعض اوقات گیارہ بارہ میل تک بڑھا دیتا ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب سیلاب اور موسم بہار کا جوار بھاٹا ایک ہی وقت پر آئیں۔

اس دریا کی گہرائی کے متعلق بھی یہی باتیں سچ ثابت ہوتی ہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی صحیح ہیں لہٰذا میں نے ایک طویل پیراگراف لکھنے کی بجائے اس کی مختلف حالتوں کا جدول بنا دیا ہے جو اس مسئلہ کو واضح کر دے گا۔(ایچ۔ پوٹنگر)

زراعت اور زرخیزی

یہاں کی ساری ہی زمین زرخیز اور پیداواری ہے۔اتنی کہ جہاں پر سیلاب بہت زیادہ آتے ہیں وہاں پر کاشتکاری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سیلاب کے خاتمے کے بعد زمین پر بیج پھیلا دیئے جاتے ہیں جس کے بعد موسم بہار کی فصل خصوصاً گندم بہت بڑی مقدار میں خود بخود اُگ آتی ہے۔سندھ کے کسی بھی حصے میں زمین نرم کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یوں کاشتکاری

زیادہ بدترتیبی نوعیت کی ہوتی ہے اور ہر سال تین فصلیں کاٹی جاتی ہیں۔ یہاں کی زمین ایک سے زیادہ فصل کبھی کبھار ہی پیدا کرسکتی ہے، اور یوں سارا سال ایک ہی فصل خصوصاً جوار اور گنا کاشت کئے جاتے ہیں۔

کاشتکاری دراصل شمالی سندھ میں کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہاں پر دریا اتنے وسیع پیمانے پر پانی نہیں پھیلاتا جتنا کہ ڈیلٹے یا جنوبی علاقوں میں پھیلاتا ہے۔ بلکہ وہاں پر تو وہ اتنا پانی فراہم کردیتا ہے کہ مزید پانی کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور زمین سے فصل خصوصاً چاول بہت بڑی مقدار میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہاں پر موسم سرما میں تھوڑی سی کاشت کاری کرنی پڑتی ہے۔ شمالی سندھ کے بعض علاقوں میں خصوصاً سکھر کے گردونواح میں جو علاقہ بیس میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے وہاں پر پانی اس وقت بہت زیادہ آجاتا ہے جب دریا کی سطح بہت بلند ہوجائے۔ اس وقت وہاں بھی ڈیلٹائی علاقے کی طرح سے زراعت ہوتی ہے۔ سیہون اور اس سے آگے کے علاقوں میں دریا سے نکالی گئی نہروں کے ذریعہ کاشتکاری ہوتی ہے۔ یہ نہریں سیلابی پانی کو روکنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔

سندھ میں زراعت دو قسم کی ہے، ایک تو یہ کہ ایرانی چرخہ استعمال کیا جائے یا پھر دوسرا یہ کہ زیریں اراضیوں کی جانب نالے کھول کر پانی فراہم کیا جائے۔ پہلا طریقہ کسی اونٹ یا بیل کو استعمال کرکے کام میں لایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں دیگر کاموں کی نسبت یہ طریقہ زیادہ خراب ہے۔

بعض اوقات سندھ میں بھی پانی ہاتھوں سے اوپر اُٹھا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا مصر میں بھی ہوتا ہے جسے وہاں پر شدف (Shaduf) کہا جاتا ہے۔

دریائی سطح کی بلندی اور اس کے کناروں کی نزولی کیفیت کے حوالے سے سندھ بہت فائدے میں ہے کیونکہ اس طرح سے سیلابی پانی بڑی آسانی سے وسیع پیمانے پر پھیل جاتا ہے۔ اس وقت فوراً ہی دریا سے نکالی گئی شاخوں پر رہٹ لگا دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ قابل کاشت اراضیوں تک نہریں بھی بنائی گئی ہیں جو پورے ملک میں موجود ہے۔ گو کہ ان نہروں کی صفائی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی مگر پھر بھی ان سے کافی پانی فراہم ہو جاتا ہے جو عظیم زرخیزی کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پورے سندھ میں اسی طرح سے نہریں اور ان کی نکالی گئی شاخیں بنا کر زمین کو تیار کیا گیا ہے۔ مالیہ، تشخیص اور لگان کا سارا نظام کھیتی باڑی کی سہولیات پر منحصر ہے۔ اس طرح کے ملک میں تو یہ ظاہری سی بات ہے کہ محنت اور مزدور کی ضرورت تو صرف پیداوار کو مزید بڑھانے کے لئے ہی پڑسکتی ہے۔ لیکن

ان تمام ذرائع کی قدر نہیں کی جاتی اور نہروں کی جانب غفلت برتنے کی وجہ سے کافی زمین خراب ہو چکی ہے۔حکمران کبھی کبھار ہی صورت حال کی بہتری کے لئے محنت کرنے پر زور دیتے ہیں مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

جاگیردار جانتے ہیں کہ اپنی زمینوں میں ذرائع کاشتکاری بہتر بنا کر اپنی زمینوں کی حالت کیسے بہتر بنائی جاسکتی ہے۔ وہ اس پر کافی خرچہ کرتے ہیں اور سیلابی ریلوں کے بعد نہروں کی صفائی کے لئے مزدوروں کی بھرتیاں بھی کرتے ہیں۔ مزدوروں کے ذریعہ آبی نالوں کی صفائی کرنے کا کام صرف سندھ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ان کے ساتھ موسیقار بھی ہوتے ہیں جو اپنے ڈھول پیٹ کر اور بگل بجا کر مزدوروں کے جوش و جذبے کو اُبھارتے ہیں۔ان چیزوں کے بغیر ان سے محنت نہیں ہوسکتی لیکن ان چیزوں کے ساتھ نہریں کھودنے والے ہندوستان کے کسی بھی دیگر مقامی علاقوں کے مزدوروں کی نسبت بہتر کام کرسکتے ہیں۔ یوں وہ بارہ گھنٹے تک مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔اس کام کے لئے وہ پھاوڑا استعمال کرتے ہیں۔نہروں کی صفائی کا کام اس وقت کیا جاتا ہے جب دریا کی سطح پہلی بار اونچی ہوجاتی ہے (یعنی مارچ یا اپریل میں)۔

ہل چلانے کے لئے ایک اونٹ یا دو بیل استعمال کئے جاتے ہیں۔ان کے پیچھے ایک ہلکا سا لوہا استعمال کیا جاتا ہے جو زمین کو کھریدتا ہے۔ یہ کافی ہلکا ہوتا ہے اور ایک ہاتھ سے پکڑا جاتا ہے۔اس کے ذریعہ زمین ہموار کرنے کے بعد اس پر بیج ڈالے جاتے ہیں اور پھر اس پر لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا چلایا جاتا ہے جو گول ہوتا ہے۔فصل تیار ہونے کے بعد ایک چھکڑا تیار رکھا جاتا ہے تاکہ اس پر کٹی ہوئی فصل لاد کر بیچنے کے لئے لیجائی جائے۔

کاشتکاروں کو کٹائی کے وقت پیداوار کا ایک حصہ بطور معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سندھ میں عورتیں کھیتوں میں کام تو بہت زیادہ کرتی ہیں مگر ان کو معاوضہ مردوں کے مقابلے میں بہت کم دیا جاتا ہے۔(ٹی۔ پوسٹن، صفحات 88-83)

زرعی پیداوار

سندھ کے پھلوں میں کھجور، آم (بڑے میٹھے)، سیب (گھٹیا قسم کے)، انار، سنگترے، شہتوت، املی اور خربوزے شامل ہیں۔بعض تو اتنے اچھے ہیں کہ کابل اور قندھار کے پھلوں کا مقابلہ

کرتے ہیں، شکار پور کے نزدیک انگور، کیلے وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ حیدرآباد میں اور روہڑی کے مشرقی کنارے پر باغات بہت ہرے بھرے ہیں، گرمیاں شروع ہوتے ہی پورے ملک میں پھولوں کا سیلاب آجاتا ہے خاص طور پر گلاب کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ تمام طبقات بڑے بڑے طبقات کی ملکیت پر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان سب ہی باغات پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ شکار پور کے امیر ساہوکار اپنے باغات کی بہتری میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ صرف پھل اور پھول ہی کاشت کئے جاتے ہیں ورنہ سبزیاں تو باقاعدہ فصلوں کی طرح اُگ جاتی ہیں۔ سبزیوں میں پیاز، گاجر، لہسن، بینگن، کدو کی مختلف اقسام، پھلیاں اور مٹر وغیرہ شامل ہیں۔ عام طور پر یہ سبزیاں گندم یا جوار کے فصلوں کے کناروں پر بوئی جاتی ہیں۔ سندھ میں آلو بھی پیدا کیا جاتا ہے اور بڑے شوق سے خوراک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سندھ کے تمام طبقات اس حوالے سے کافی منفرد ہیں کہ وہ خوراک میں جانور یا سبزی میں سے کسی چیز کو خاص طور پر پسند نہیں کرتے۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 102-101)

مصنوعات

سندھ کی مصنوعات بہت کم ہیں اور اگر ان کے ماضی کو دیکھا جائے تو آج ان کی حالت بہت خراب ہے جس کا سبب ان کی سستی اور کاہلی کے علاوہ امیروں کی تنگ نظری بھی ہے جنہوں نے ہمیشہ صنعت کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ پہلے تو ٹھٹھہ میں لنگیاں بہت بڑی تعداد میں بنائی جاتی تھیں لیکن بعدازاں برطانوی کپڑے آنے سے یہ صنعت بالکل تباہ ہوگئی۔ علاوہ ازیں سندھ کی مصنوعات میں کچھ قالین، کھلونے، تلواریں، گھٹیا قسم کے سفید کپڑے، کمبل، بندوقیں، بندوقوں کے تالے اور نیل وغیرہ شامل ہیں۔ منڈی میں ان چیزوں کی طلب بہت کم ہے۔ حکومت کی جانب سے مقامی مصنوعات پر ٹیکس عائد ہے۔ جن اسباب کی بناء پر یہاں کی صنعت تباہ ہوگئی ہے انہی اسباب کی بناء پر یہاں کی تجارت بھی بہت کم ہوگئی ہے۔ مگر حال ہی میں برطانوی اور سندھی حکومتوں میں جو معاہدہ ہوا ہے اس سے لگتا ہے کہ تجارت میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے اعتماد کی بحالی سے یہاں کی تجارت نہ صرف پھر سے شروع ہو جائے گی بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوگا۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحات 25-24)

درآمدات و برآمدات

(1)

دریا بہت بڑا ہے۔ یہ سات دریاؤں سے مل کر بنا ہے جو ملک کے اندرونی علاقوں سے بہتے ہوئے نیچے آ جاتے ہیں جیسا کہ میں آگے بیان کروں گا۔ یہاں پر ہم نے بہت سے عربی اور فارسی بحری جہاز دیکھے جو کھجوروں، گھوڑوں، سچے موتیوں، موتی، بخورات اور یہودیوں کے مقدس پتھر بہت بڑی تعداد میں مکہ سے درآمد کرتے ہیں۔ اس کے بدلے میں وہ کالی وسفید شکر، مکھن، زیتون کا تیل اور ناریل لے جاتے ہیں جن کو ماہرین طب (nos Indica) (ہندوستانی پھل) کہتے ہیں۔ اس پیداوار اور اس کی خوبیوں کا میں آگے چل کر ذکر کروں گا۔ وہ سفید سوتی کپڑے اور مزین اشیاء کی کئی اقسام بھی برآمد کرتے ہیں جو اسی خطے میں بنتی ہیں۔ (این۔ منوکسی، صفحات 57-56)

(2)

سندھ سے برآمد ہونے والی اہم پیداواری اشیاء چاول، گھی، کھالیں، شارک فین (Shark fins)، پوٹاش (Potash)، شورہ قلمی (Salt petre)، اسیفیٹا ئیڈا (Assafetida)، ڈیلیم (Delium)، میڈر (Madder)، لوبان، ٹھٹھہ کے کپڑے، گھوڑے، نیل (Indigo)، اولی جینس (Oleagenous) اور دیگر بیج شامل ہیں۔ غیر ملکی منڈی کے لئے ملتان اور شمالی ممالک سے پھٹکری، مشک، زعفران، اور گھوڑے درآمد کئے جاتے ہیں۔ دیگر درآمدات میں ٹین، لوہا، سیسہ، اسٹیل، ہاتھی دانت، یورپی مصنوعات، صندل اور دیگر لکڑیاں، نیز ہندوستان سے تلواریں، خراسان وقندھار سے قالین اور خلیج فارس سے سوت، اور دیگر اشیاء شامل ہیں۔ سندھ میں آباد بڑے بنکار دراصل ملتانی تاجر ہیں۔ جو ملک میں امیر طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سندھ اور دیگر شمالی ممالک کے درمیان آمدورفت زیادہ تر دریائے سندھ کے ذریعہ ہوتی ہے جو سمندر سے تھوڑے فاصلے تک کے لئے چھوٹے بحری جہازوں کی کشتی رانی کے قابل ہے۔ اگرچہ راستے پر اکثر وبیشتر مسافر اور تاجر نظر آتے ہیں مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا سندھ سے قافلے باقاعدگی کے ساتھ ملتان اور کابل جاتے ہیں یا نہیں۔ (ایچ۔ ایلس، صفحہ 11)

کشتی رانی

(1)

الوداعی ملاقات کے بعد ہم 25-اگست کی صبح کو تین جمپٹیوں پر سوار ہو گئے جو امیروں نے مہیا کی تھیں۔ سامان کرائے کی کشتیوں میں رکھ دیا گیا اور ہم حیدر آباد سے پھلیلی میں جنوب، جنوب مشرق کی سمت میں روانہ ہوئے حتیٰ کہ گنی (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کا دہانہ آ گیا اور وہاں سے تیسری شام ہم گاؤں کدین پہنچ گئے جو گنی کی ایک شاخ کے آخری سرے پر واقع ہے اور چونکہ یہاں پانی کم تھا جس پر کشتیاں نہ چل سکتی تھیں لہٰذا ہم نے اپنا سامان اُتارا اور کچھ دن سیر و شکار میں گزار کر ہم سندھ کو کچھ سے جدا کرنے والی شور دلدلی زمین سے قلعہ لکھپت بندر کو چل دیئے جو کچھ کی مغربی حد پر واقع ہے اور یہاں 7- ستمبر کو پہنچے۔ سامان اور مقامی ملازموں والی کشتیاں گنی سے سیدھی علی بندر پہنچ گئیں جہاں سے وہ دوسری کشتیوں میں بمعہ سامان لونی دریا پر روانہ ہوئے اور بالآخر کچھ میں ہم سے آ ملے۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

(2)

دریائے سندھ جہازوں کی کشتی رانی کے قابل ہے۔ شمال میں کشمیر تک جو درجہ 32 عرض البلد پر واقع ہے وہاں تک چلا جاتا ہے۔ اس کی ایک شاخ مغرب میں کابل تک چلی جاتی ہے جبکہ دیگر شاخیں پنجاب، لاہور، ملتان، بھکر اور مشرق کے دیگر بڑے صوبوں اور شہروں تک چلی جاتی ہیں اور یہ سب ہی اندرونی کشتی رانی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ان کے جہازوں کو ''کشتیاں'' کہتے ہیں جو مختلف سائزوں کی ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی تقریباً 200 ٹن کا مال اُٹھا سکتی ہے۔ وہ نیچے سے سپاٹ ہوتی ہے اور اس کے دونوں اطراف میں کمرے بنے ہوتے ہیں جو دو قدم جہاز سے باہر کی جانب لٹکے ہوتے ہیں۔ ہر کمرے میں ایک باورچی خانہ اور بیت الخلاء ہوتا ہے جہاں سے گند براہ راست پانی میں گرتا ہے۔ یہ کمرے مسافروں کو کرائے پر دیئے جاتے ہیں۔ الگ حصوں میں بنائے گئے کمرے مال برداری کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ہر کمرے میں تالہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہر شخص کی اشیاء ہمیشہ تیار رہتی ہیں کہ جہاں کہیں کسی کو منڈی ملے وہ اپنا سامان اُتار لے۔ بلاشبہ اپنے تمام بحری سفروں کے دوران

میں نے اس سے زیادہ سفری سہولیات کہیں نہیں دیکھیں۔ وہ جہاز اس قابل ہیں کہ بہت سارے آدمیوں کو نہر کے بہاؤ کے مخالف سمت میں لے جائیں حالانکہ ہوائیں بھی ان کی مخالف سمت میں چل رہی ہوتی ہیں۔ اس طرح سے ٹھٹھہ سے لاہور تک کا سفر چھ یا سات ہفتوں میں طے کرتے ہیں لیکن لاہور سے واپسی میں 18 دن سے زیادہ نہیں لگتے، اور بعض اوقات تو 12 دنوں میں ہی یہ سفر مکمل ہو جاتا ہے۔ (اے۔ ہملٹن، صفحات 76-75)

جانور

(1)

سندھ میں تازہ پانی کی مچھلیوں کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے بہترین کارپ (Carp) مچھلی ہے جس کا مجھے ہمیشہ شوق رہا ہے۔ ان میں سے بعض بیس پاؤنڈ سے بھی زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔ بعض کو ہم ٹھٹھہ کے بازار میں زندہ بھی لے جاتے ہیں۔ سندھ میں کالی بھیڑیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ یہ بہت موٹی تازی ہوتی ہیں جن کے گوشت کا وزن 80 یا 100 پاؤنڈ ہوتا ہے۔ گو کہ سندھیوں کے گھوڑے چھوٹے قد کے ہوتے ہیں مگر سخت محنتی ہوتے ہیں۔ ان کے جنگلی شکاروں کے ضمن میں ہرن، بارہ سنگھے، خرگوش اور لومڑیاں ہوتی ہیں جن کا شکار کتوں، اور چیتوں یا Shoegoose کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مؤخرالذکر جانور لومڑی کے سائز کا ہوتا ہے جس کے کان بڑے بڑے ہوتے ہیں جیسے خرگوش کے کان ہوں اور شکل بلی کی سی ہوتی ہے۔ پشت اور اطراف خاکستر رنگ کی ہوتی ہیں جبکہ پیٹ اور سینہ سفید ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ جانور بہت نایاب ہے کیونکہ میں نے ایسا صرف ایک ہی دیکھا ہے جو امیروں کے پاس تھا۔

ان کے ہاں بڑی تعداد میں کبوتر، بطخیں، فاختائیں، پن ککڑی یا چھوٹی بطخیں (Teal)، وائڈ گان (Widegeon)، جنگلی ہنس پن ککڑی (Gurlews)، تیتر (Partridge) اور پولور (Polver) بھی ہیں۔ ہر شخص ان کا شکار کر سکتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ (اے۔ ہملٹن، صفحات 77-76)

(2)

سندھ میں جانوروں کا جائزہ لیا جائے تو ساحل سمندر پر اونٹ اور دریا میں مچھلیاں قابل ذکر

ہیں۔سندھ کے ہر خطے میں اونٹ بہت زیادہ ہیں جبکہ سمندر کے قریب نمکین دلدل میں بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ وہیں پر زرد پھولوں والی گھاس (Furze) اور جھاڑیوں کی کثرت وفراوانی بھی ہے جہاں سے ان کو وافر مقدار میں خوراک مل جاتی ہے۔ان کے رکھوالے دو یا تین روز تک دریائی سفر کے بعد ان کے لئے تازہ پانی حاصل کر کے لے آتے ہیں۔ دوسرے تمام جانوروں کی نسبت اونٹ زیادہ محنت مشقت کر سکتا ہے اور ہر قسم کی خوراک کھا سکنے کا عادی ہوتا ہے۔ جبکہ جو اندرون ملک میں پروان چڑھتے ہیں وہ نمکین گھاس کا چارہ نہیں کھاتے۔ کراچی سے قندھار کے مابین تمام زمینی بار برداری انہی جانوروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ایک ہی رات میں یہ چار یا پانچ یا چھ سو کا وزن اُٹھا کر پندرہ سے بیس میل تک سفر کر سکتے ہیں یہ بات ان کی جسامت اور رفتار کے لئے کافی فائدہ مند ہے۔ دن میں جب اہل قافلہ آرام کرتے ہیں تو ان کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ان میں سے بہت سے بوجھ تلے دب تک تھک جاتے ہیں۔ یہ رفتار میں گھوڑوں سے بھی زیادہ ہیں۔اس پر فائدہ یہ کہ یہ جانور دو افراد کو معہ ان کے کپڑوں اور کل سامان کے اُٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ان کو رہٹوں اور ملوں (Mills) میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جنگ کے دنوں میں ان پر چھوٹے پیمانے کے چول چھلے والے سامان لاد دیئے جاتے ہیں۔سندھ میں پیدا ہونے والے گھوڑے بہت مضبوط مگر چھوٹے قد کے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ملک اس جانور کے لئے ناموزوں نہیں ہے۔کئی مثالوں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس نسل کو اس جگہ اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔گھوڑیاں، گدھے اور بیل بھی انہی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور بہت زیادہ وافر مقدار میں ہیں۔اس ملک میں ہر طرح کا کھیل و شکار ہوتا ہے مگر بھیڑیوں کے علاوہ اور کوئی ایسا درندہ نہیں ہے جو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ان کی تعداد خاصی ہے۔اتنی کہ بعض اوقات تو کھلے میدان میں سوئے ہوئے بچوں یا آدمیوں کو ہی اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔گیدڑ تو اتنے پیٹو (کھانے کے لئے بےتاب) اور سخت ہوتے ہیں کہ تازہ فضا میں بیٹھے تمبا کونوشوں کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔سندھ کے جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے مگرمچھوں کو نہیں بھولنا چاہئے کیونکہ نہ صرف وہ بہت مشہور ہیں بلکہ ہر دو ہندو اور مسلمان اس جانور کی تعظیم کرتے ہیں۔ جانوروں کے حوالے سے یہ بات صرف یہیں پر قابل ذکر ہے کہ یہ جانور کبھی تو ایسے چشموں سے پانی پی رہے ہوتے ہیں جو سخت کھولتا ہوا ہو یا پھر ایسے تالاب میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ جس کا پانی بہت زیادہ ٹھنڈا ہو۔دریا میں بہت سے سمندری بلے اور اود بلاؤ بھی ہیں جن کی کھالیں کابل اور قندھار میں

بڑی مہنگی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔(این۔کرو،صفحات19-20)

(3)

یہاں سندھ کے اونٹوں کا سب سے پہلے ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ سندھ کے تمام علاقوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بلکہ مغربی علاقوں میں اور روہڑی کے علاقے میں تو ان کو سواری اور بار برداری کے لئے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ بار برداری کے لائق ایک اچھے اونٹ کی قیمت تیس سے چالیس روپے کے درمیان ہوتی ہے۔ سواری کے لائق اونٹوں کی قیمت 80 سے 100 روپے فی اونٹ کے حساب سے ہے۔ یہ قیمت حیدرآبادی روپے کی شکل میں ہے جو بمبئی کے روپے کی نسبت25فیصد کم ہے۔

ہندوستان کے مقابلے میں سندھ کے گھوڑے بہت ناقص ہیں۔ وہ چھوٹے قد اور بدصورت بھی ہوتے ہیں۔ یہ گھوڑے طبقہ اعلیٰ کے لوگ استعمال نہیں کرتے۔ ان کے گھوڑے ترکستان، خراسان اور کابل سے آتے ہیں۔ سندھ میں تمام گھوڑے سدھائے جاتے ہیں اور جو اس قابل نہ ہوں تو ان کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ البتہ وہ لمبے سفروں کے کام آتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ میں نے خیر پور اور حیدرآباد سے اپنے سفروں کا آغاز کیا تھا ان لوگوں نے دن میں کبھی اپنے گھوڑوں کے زین نہیں اُتارے یہاں تک کہ ہم صبح سویرے اپنے مقام پر پہنچ گئے۔ ان بے چارے جانوروں کو کھانے کے لئے اچھی خوراک بھی نہیں ملتی تھی، اور نہ ہی ان کی صفائی کی جاتی تھی۔ بیل، سانڈ، بکریاں اور بھیڑیں تو سندھ میں بہت ہی زیادہ ہیں۔ مؤخرالذکر کو دنبہ کہتے ہیں جو ہمارے ہاں کے کیپ شیپ (Cape Sheep) کے مشابہ ہے۔ کوٹہ پاچا(Kotapachas)یا پارہ (Para) دراصل ہرن کی قسم کا جانور ہے جو صرف امیروں کی شکارگاہ میں ملے گا۔ گدھے اور خچر عام ہیں۔ ہندوستان کی نسبت یہاں کے گدھے دراز قد ہوتے ہیں۔ امیروں کے ہاں بڑی تعداد میں کتے موجود ہیں۔ یہ کتے زیادہ تر شکاری کتے ہوتے ہیں۔(ای۔ڈلہوسٹ،صفحات15-16)

(4)

گھریلو جانوروں میں بیل، گھوڑے، خچر، گائے، بھیڑ، بکری، کتے اور گدھے شامل ہیں۔ سب

سے آخر میں اونٹ آتا ہے حالانکہ یہ بہت بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ گوکہ گائے اور گھوڑے کو یہاں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے مگر یہ بہت مفید اور محنتی ہوتے ہیں اسی وجہ سے ان کے مالکان ان کے ساتھ بڑا برا سلوک کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ ہمیشہ خراب حالت میں نظر آتے ہیں، گدھا اپنے حصے کا کام کرتا ہے اور اس سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اگر آپ ان جانوروں پر لدا ہوا بوجھ دیکھیں تو آپ کو بہت غصہ آئے گا۔ یہ جانور عموماً ہندوؤں کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ ان پر ہی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں جو کبھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوتے۔ سندھیوں کے ہاں اونٹوں کی بڑی ناقدری ہوتی ہے حالانکہ یہ جانور ان لوگوں کے بہت کام آتا ہے۔ جب سندھی کنویں سے پانی نکالنا چاہتے ہیں تو وہ اونٹ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے منہ میں کچھ پتے رکھ دیتے ہیں۔ وہ بیچارہ کنویں کے گرد گھنٹوں گھومتا رہتا ہے۔ اونٹ پالنے پر بہت کم خرچہ آتا ہے کیونکہ جب یہ جانور بیابان سے گزرتا ہے تو کئی روز کی خوراک اس کے اندر بھر دی جاتی ہے اور یوں وہ کسی بھی دوسرے جانور کی نسبت زیادہ لمبا اور تکلیف دہ سفر طے کر لیتا ہے۔ اس کا گوشت بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔

یہاں پر جنگلوں میں جو جانور رہتے ہیں وہ شیر اور چیتا ہیں۔ اول الذکر اب بڑی تعداد میں موجود نہ ہے کیونکہ سندھ میں قائم ہمارے اسٹیشن آفیسروں نے ان کے خلاف شکار کا لمبا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ (ایچ۔ جیمز، صفحہ 58)

مچھلی

دریائے سندھ سمیت دیگر تمام دریاؤں اور نہروں میں بڑی تعداد میں مچھلیاں موجود ہیں۔ مختلف مقامات پر ماہی گیروں کی (Fisheries) قائم کی گئی ہیں اور ہر مقام پر ماہی گیروں نے اپنے اپنے حصے مخصوص کر رکھے ہیں۔ روزانہ جتنی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں اس کا ایک تہائی بطور ٹیکس وصول کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے ایک ٹھیکے دار مقرر کر دیا گیا ہے۔ یوں ہر روز ہر ماہی گیر تین میں سے ایک مچھلی حکومت کو دیتا ہے۔ حکومت کے حصے کی مچھلیاں وہی ٹھیکے دار فروخت کر دیتا ہے اور رقم حکومت کو ادا کر دی جاتی ہے۔ یوں ٹھیکے دار حکومت کے ساتھ ایک مخصوص رقم کی ادائیگی کا معاہدہ کر لیتا ہے۔ ماہ اپریل، مئی اور جون میں دریائے سندھ میں ایک خاص قسم کی مچھلی پکڑی جاتی ہے جو پلہ مچھلی (Pulha Fish) کہلاتی ہے یہ عام مچھلیوں سے مختلف ہوتی ہے، یہ مچھلی اس دریا کے علاوہ اور کسی

دریا میں نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں ٹینچ (Tench) کی طرح کی ایک اور مچھلی بھی ہوتی ہے جسے دمبیا(Dumbia) کہتے ہیں۔ گوکہ یہ بہت بڑی ہوتی ہے مگر اس میں کانٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور یہ بے ذائقہ بھی ہوتی ہے۔

دریائے سندھ میں موری مچھلی (Moree Fish) بھی پائی جاتی ہے جو لمبی سی سرخی مائل مچھلی ہوتی ہے جس میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ شاکیلر (Shakiler) نامی مچھلی کا سر گول ہوتا ہے۔ یہ کھانے میں بہت پسند کی جاتی ہے کیونکہ اس میں زیادہ کانٹے نہیں ہوتے۔ کیٹ فش (Cat Fish) کی طرز کی کوگاہ (Kugah) مچھلی پسندیدہ خوراک میں شامل نہیں ہے۔ تہلی (Tehley) مچھلی تقریباً ایک فٹ لمبی اور دس انچ موٹی ہوتی ہے۔ اس میں دم سے لے کر پیٹ تک کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں اور بہت بے ذائقہ ہوتی ہے۔ ملی (Mully) یا جرکاہ (Jerkah) نامی مچھلی تقریباً 6 یا 8 فٹ لمبی ہوتی ہے اس کا سر بھی کتے کے سر کی طرح بڑا ہوتا ہے۔ گوکہ یہ بھی کھائی جاتی ہے لیکن یہ بہت خراب ہوتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے کئی قسم کی بیماریاں بھی لگ جاتی ہیں۔ کٹاری (Kuttaree) مچھلی تقریباً دو فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا منہ بڑا اور دو سینگ ہوتے ہیں جو اس کے منہ پر ہی ہوتے ہیں۔ بمبول (Bombul) یا ایل (Eel) مچھلی کافی وافر ہوتی ہے اس کا سائز بہت لمبا ہوتا ہے۔ کجواہ (Kajwah) یا ٹرٹل (Turtle)، پروپوسس (Propoises) اور میرے خیال میں تو کروکوڈلز (Crocodiles) نامی مچھلیاں بھی سندھ میں عام ہیں۔ (ای۔ ڈلہوسٹ، صفحات 17-16)

پلہ مچھلی

ہم ''پلہ'' کے موسم میں سندھ میں آئے تھے یہ ایک مچھلی کا نام ہے جو ماکرل مچھلی (Mackerel Fish) کی طرح سے لمبی ہوتی ہے اور اس کی خوشبو بالکل سلمون مچھلی کی سی ہوتی ہے۔ یہ صرف انہی چار مہینوں میں ملتی ہے کہ جب دریا میں پانی تیز ہو جائے یعنی جنوری تا اپریل۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مچھلی یہاں پر ایک مشہور بزرگ خواجہ خضر کے وسیلے سے آتی ہیں۔ اس مچھلی کو پکڑنے کا طریقہ دریائے سندھ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ ہر مچھیرے کے پاس ایک جال ہوتا ہے۔ جو اوپر سے کھلا ہوتا ہے اور قدرے سپاٹ ہوتا ہے۔ اس میں وہ خود لیٹ کر دریا میں چلا جاتا ہے اور کسی مینڈک کی طرح سے تیرنا شروع کر دیتا ہے، اور اپنے ہاتھوں سے راستہ تلاش کرنے لگتا ہے۔

جب وہ دریائے سندھ کے وسط میں پہنچتا ہے تو وہاں پر پانی کی دھار زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے جال کو براہ راست اپنے نیچے کر لیتا ہے، اور نہر کے ساتھ بہنا شروع کر دیتا ہے۔ اس جال میں ایک تھیلی بھی ہوتی ہے جو ایک کھمبے سے جڑی ہوتی ہے۔ اپنے کھیل کے خاتمے پر وہ اسے بند کر دیتا ہے پھر اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے اور اپنے جہاز میں لے آتا ہے۔ سینکڑوں بوڑھے اور جوان پلہ مچھلی کے شکار سے وابستہ ہیں۔ یہ مچھلی معہ دیگر مچھلیوں کے نہ صرف سندھ میں استعمال ہوتی ہے بلکہ نواحی ممالک میں بھی فراہم کی جاتی ہے۔ (اے۔ برنس III، صفحات 40-39)

سڑکیں

سندھ میں کوئی سواری موجود نہیں ہے پکی سڑکیں بھی کہیں موجود نہیں ہیں۔ عام روڈ دس فٹ چوڑے ہیں اور سڑکیں کچی ہیں۔ ان میں پانی آسانی سے جذب نہیں ہوتا جس کی وجہ سے سڑکوں پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور بارش کے بعد پھسلن ہو جاتی ہے۔ (ای۔ ڈلہوسٹ، صفحہ 17)

چھکڑے

خیر پور اور اس کے آس پاس چھکڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کی ساخت بہت بڑی ہوتی ہے یہ زیادہ تر جنگل کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں۔ میں نے دو یا تین اچھے قسم کے چھکڑے دیکھے ہیں لیکن وہ امیروں کی ملکیت ہیں۔ سندھی ہل اسی طرح کا ہے جس طرح کا علاقہ کچھ (Cutch) میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لمبا سا لکڑی کا ڈنڈا ہوتا ہے جس کے بھاری سرے پر لوہے کا ایک ٹکڑا جڑا ہوتا ہے۔ (ای۔ ڈلہوسٹ، صفحہ 17)

دیہات

(1)

سندھ کے دیہات جو دریا کے اس طرف ہیں وہ علاقہ کچھ (Cutch) کی طرف واقع دیہاتوں کی نسبت کافی خراب ہیں۔ یہاں پر عمارتیں پتھروں کے بغیر بنائی جاتی ہیں اور چھتیں ٹائلوں کی بنی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں پر صاف ستھری ہوا اور بڑا سکون ملتا ہے۔ یہاں پر دراصل نچلے درجے کی

جھونپڑیاں ہیں جو مکمل طور پر مٹی اور گھاس پھوس سے تیار ہوتی ہیں یہاں تک کہ وہ مساجد بھی کہ جہاں پر یہ لوگ عبادت کرتے ہیں وہ بھی اسی قسم کے سامان سے تیار کی گئی ہیں۔ ان کو محض ان کی اچھی زیبائش اور سجاوٹ کی وجہ سے جھونپڑوں سے بہتر کیا جا سکتا ہے۔ اسی صوبے کے اکثر باشندے گھاس پھوس کے بنے ہوئے ان جھونپڑوں (Hovels) میں رہتے ہیں جو ان کھیتوں میں ہی بنا لئے جاتے ہیں جن کو یہ کاشت کرتے ہیں۔ اکثر دیہاتوں کا کوئی نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنے مالکوں کے ناموں سے مشہور ہیں۔ کسی بھی ضرورت کی وجہ سے یا پھر خوراک و روزگار کے حصول کی ناکامی کی وجہ سے یہ رواج اس ملک میں عام ہو گیا ہے کہ پورے دیہات کی آبادی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کر جائے۔ (جے۔ برنس، صفحات 36-35)

(2)

ہم اس وقت شمالی سندھ میں موجود ہیں۔ یہ مصر کی سی زرخیزی کی طرح کا علاقہ ہے۔ مسٹر بل (Bull) تم یہاں پر یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ اُداس وادی امیر بننے کی کتنی اہلیت رکھتی ہے۔ زیریں علاقے کی نسبت یہاں پر دریا کی سطح کافی اونچی ہے اور اس ملک کی سطح کے برابر آتی ہے۔ نہریں زیادہ بہتر طور پر کھودی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے پانی ان میں زیادہ آسانی سے اُتر آتا ہے۔ گندے اور پھٹے واجاڑ جھونپڑوں کی جگہ یہاں ہر طرف تمہیں قدرے صاف ستھرے اور پُرسکون چھوٹے چھوٹے دیہات نظر آئیں گے جن کے اردگرد کھجوروں اور جوجوبی (Jujube) کے جھنڈ ہیں اور نیم کے درخت ہیں یہ سرسبز زمین بیلوں، گائے اور بکریوں سے بھری پڑی ہے۔ فصلیں اب کھیتوں کو خاموش کرنے لگی ہیں۔ کاشتکار اونچی آوازیں لگا رہے ہیں تا کہ بھوکے پرندوں کو فصلوں پر سے بھگا دیں۔ یہ لوگ چست، مصروف اور بڑے پھرتیلے ہیں۔ یہاں ہر شخص اس طرح سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے کہ جیسے اس کے آگے کوئی مقصد ہو۔ جب ہم ان دیہاتوں سے سوار ہو کر گزرے تو دیواروں کی اوٹ یا دروازوں کی درجوں سے عورتوں نے انگریزوں کو دیکھنے کی اپنی خواہش پوری کی۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں اور دانت سفید تھے۔ یہ چیزیں کسی بھی اجنبی کو اپنی جانب راغب کر لیتی تھیں۔ (آر۔ برٹن۔ اُداس وادی II، صفحات 39-238)

دوسراباب

لوگ

آبادی

(1)

سندھ کی آبادی کے حوالے سے کوئی بھی رائے تب تک قائم نہیں کی جاسکتی جب تک کے پورے ملک کا دورہ نہ کیا جائے، اوراس ضمن میں ایسی سرکاری دستاویزات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ جو دسترس میں نہیں ہیں۔ اس ملک کے مختلف علاقوں میں بعد ثلاثہ اور منظرکشی کے حوالے سے کافی اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایسے خانہ بدوش قبائل ہیں کہ جو مختلف چراگاہوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ سندھ میں آبادی بہت کم ہے جس کی خاص وجوہات حکومت کا دیوالیہ پن اور ہر طرح سے ملازمت اور روزگار کی حوصلہ شکنی ہے۔ صنعت کی مہارت اور دولت کی کشش نے بجائے فائدہ پہنچانے کے اُلٹا نقصان کو دعوت دی ہے۔ کاشتکاروں پر حکومتی افسران کی جانب سے بہت مظالم جاری ہیں۔ ٹھٹھہ کے بہت سے صنعتکار ہندوستان ہجرت کر گئے ہیں۔ اسی طرح سے لوگوں کی بڑی تعداد باہر کے علاقوں میں ملازمت تلاش کرتی ہے پھر ان میں سے چند لوگ ہی واپس لوٹ کر آئے ہیں۔ باقی وہیں رہ گئے۔ سندھی دارالحکومت حیدرآباد کا شہر اور قلعہ کی آبادی تیس ہزار کے قریب ہے۔ مشہور شہر ٹھٹھہ کی آبادی چالیس ہزار ہے۔ اس علاقے کی واحد بندرگاہ کراچی کی آبادی دس ہزار ہے۔ اس میں شاہ بندر اور لاہری بندر کے علاقے شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ علاقے ختم ہو چکے ہیں۔ ناموردی (Nomurdees) جو حیدرآباد کے نواح میں ہیں اور جوکی (Jokias) جو کراچی اور ٹھٹھہ کے درمیانی علاقے میں ہیں اور کرمتی (Kurmatties) جو لاہری بندر کے پاس آباد ہیں، یہ سب قبائل کل ملا کر آبادی میں بیس یا پچیس ہزار کے قریب ہیں۔ یہ لوگ پیشے کے اعتبار سے فوجی ہیں اور جوکی قبیلے

کے لوگ سندھ میں بحری جہازوں پر باربرداری اور دیگر امور کا کام کرتے ہیں۔ باقی آبادی میں گنوار اور بھشتی شامل ہیں۔ان کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے کیونکہ یہاں کے دیہاتوں کی آبادی بہت کم ہے اور کچھ ملاح بھی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک جانب کراچی اور حیدرآباد لاہری بندر تک کا علاقہ اور دوسری جانب پہاڑیوں سے گھرا ہوا یہ ملک بہت کم آباد ہے۔البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اگر یہاں کے حکمرانوں سے نجات مل جائے تو یہ ملک پھر سے آباد ہو جائے گا۔(این۔کرو،صفحات 22-21)

(2)

سندھ کی آبادی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میرے خیال میں جن علاقوں میں کافی آبادی ہے وہ دریائے سندھ کے کنارے پر آباد ہیں۔ بڑے شہروں میں نہ تو آبادی زیادہ ہے نہ ہی وہ شہر وسیع ہیں۔ دارالحکومت حیدرآباد میں تقریباً 20 ہزار افراد کی آبادی ہے۔لیکن شکار پور میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ ٹھٹھہ، کراچی اور خیر پور، ان سب میں 15 ہزار افراد فی شہر آباد ہیں۔ میر پور، ہالہ، سہون، لاڑکانہ اور روہڑی (معہ سکھر کے)، ان سب میں سے ہر ایک میں 10 ہزار ہیں۔ مٹیاری (Muttaree)، الہ یار ٹنڈو اور سبزل معہ پانچ چھ دیگر قصبات کے، ہر ایک میں پانچ ہزار افراد آباد ہیں۔ اس طرح سے یوں یہ ساری آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ جزیرہ نما میں تیس ہزار سے زیادہ کی آبادی نہ ہے۔ دریائے سندھ کے ہر دو مشرقی و مغربی کناروں پر بھی کم آبادی ہے کیونکہ دیہی علاقے زیادہ آباد نہیں ہیں، گو کہ یہ بڑے مشہور قطعات ہیں۔ یہاں پر دس لاکھ سے کم لوگ نہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک چوتھائی ہندو ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ہندو مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔(اے۔برنس III، صفحہ 227)

باشندے

(1)

سندھی باشندے مضبوط اور محنت کش نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ محنتی نہیں بلکہ تھکے ماندے ہیں۔ان کے قد لمبے اور رنگت گندمی ہے۔ یہاں کے امیر بہت زیادہ موٹے تازے اور چوڑے وجود کے ہیں۔اسی طرح سے ان کے دربار کے بہت سے بلوچی سردار اور افسران

بھی کافی دراز قد ہیں۔سندھی لوگ زیادہ تر مغرور، بے صبر، فریبی اور نیچ ہوتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ مکران اور ہندوستان کے درمیان ہونے کی وجہ سے یہ دو مخالف خصوصیات کے حامل ہیں یعنی ایک جانب تو ان میں بربریت ہے اور دوسری جانب قدرے تہذیب یافتہ ہیں، ان کی فطری صلاحیتیں اچھی ہیں اور ان کی طاقت ان کے اندر حوصلہ پیدا کرتی ہے۔مگران کے اخلاقی کردار کی بمشکل ہی وضاحت ہو سکتی ہے۔آج بھی ان پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں جنونیت، اوہام پرستی اور جبریت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔علاوہ اپنے عقیدے کی تبلیغ کے کوئی سرگرمی نہیں ہے۔عید منانے کے علاوہ اور کسی موقع کے لئے ان میں جذبہ نہیں ملتا ہے، کا ہل سیدوں کو کھلانے کے علاوہ اور کسی چیز کی آزادی نہیں ہے اور پرانے مقبروں کو سجانے کے علاوہ ان کا کوئی ذوق نہیں ہے۔(این۔کرو، صفحات 20-19)

(2)

شمالی سندھ کے اس سفر میں میں کاشتکاروں کے مفید مشوروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہر جگہ پر وہ مہمان نواز، سلیقہ شعار اور عقلمند نظر آتے ہیں۔ان کی زرخیز اور پیداواری زمین نے ذراسی محنت سے ہی ان کو تمام ضروریات زندگی فراہم کر دی ہیں۔مگر پھر بھی انہیں حکومت کے مظالم کی شکایات ہیں۔ان کے حالات بڑے اچھے تھے۔ان کے دیہات مٹی کے مکانات پر مشتمل ہیں اور سرکنڈوں کے جھونپڑے بنائے گئے ہیں یہاں کی آب و ہوا کے مطابق دیگر کسی تعمیراتی سامان کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔البتہ مساجد کی تعمیر زیادہ بہتر طور پر کی گئی ہے ان کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے مسلمانوں کو ان چیزوں سے بڑا لگاؤ ہے۔ ہر مسجد میں ایک مولوی اور کچھ خادم مقرر ہیں۔اس سال سردیوں کے موسم میں نمازیوں کے وضو کے لئے گرم پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوسری جانب ملکی انتظام میں بہت خامیاں ہیں سرداروں کے بھاڑے کے ٹٹو ہر جگہ نظر آتے ہیں مگر وہ ان کا بہت کم کرایہ ادا کرتے ہیں اور زور زبردستی سے کام لیتے ہیں۔گو کہ ان کے پاس اس چیز کا اختیار نہیں ہے مگر وہ پھر بھی ایسا کرتے ہیں کیونکہ ان کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ پڑوسی ممالک کی طرح یہاں کے بھی تقریباً سب ہندو تجارت سے وابستہ ہیں اور زیادہ سے زیادہ منافع کے پیچھے بھاگتے ہیں۔کوئی ہندو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تب تک نہیں جا سکتا جب تک کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے کسی مسلمان کو معاوضہ ادا نہ کرے۔سیّدوں کی بہت تعظیم کی جاتی ہے، اور ان میں سے اکثر

بہت معزز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی بھی سیّد بڑی بے خوفی کے ساتھ جرم کر سکتا ہے۔ ان کے اونچے گھرانے اپنے عزت و وقار کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کسی پڑوسی کے یا غیر سیّد کے گھر میں بھی جانا پسند نہیں کرتے۔ سندھ میں لاتعداد پیر یا اعلیٰ طبقہ کے روحانی راہنما موجود ہیں۔ سیّدوں اور فقیروں کی طرح ان کو بھی زمینیں دی گئی ہیں اور بعض اوقات تو پورا گاؤں دے دیا گیا ہے۔ ملک کا اکثر مالیہ ان کی امداد کے لئے مختص ہوتا ہے۔ سندھ میں لوگوں کی خیرات پر پلنے والے فقیر بھی بہت زیادہ ہیں۔ کوئی گاؤں ایسا نہیں کہ جہاں پر فقیر نہ ہو۔ یہ لوگ ہر شہر میں مل جاتے ہیں۔ ان کی رہائش گاہیں جو عموماً جھونپڑیوں یا سائبانوں کی شکل میں ہوتی ہیں ان کو نمایاں کرنے کے لئے ان کے اوپر جھنڈا لگایا جاتا ہے۔ یہاں پر تمبا کو نوشی کے لئے چلم استعمال ہوتے ہیں اور بھنگ کی تیاری کے لئے چرس اور عام استعمال کی چیزیں موجود ہیں۔ کئی فقیر اکٹھے رہتے ہیں اور کسی مشہور سیّد یا بزرگ کے مزار کے متولی بن جاتے ہیں۔ وہ امام حسین کو اپنا سرپرست اور ولی قرار دیتے ہیں۔ (سی۔میسن۔I، صفحات 80-378)

(3)

اب سندھ کی آبادی ہندوؤں، جاٹوں اور بلوچوں پر مشتمل ہے بلکہ آخری دو سے ایک تیسری نسل پیدا ہوئی ہے۔ ہندو ملک کے اصلی قابض تھے اور جاٹ ان ہندوؤں کی اولاد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا (دیکھئے جاٹوں کا بیان کچ گنداوا، باب ششم) وہ خالصتاً زرعی یا میکانکی ذہنیت کے لوگ تھے لہٰذا انہوں نے تحفظ جائیداد کے لئے بلوچوں کو اپنا لیا اور باہمی شادیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مقامیوں کی اکثریت ان شادیوں کا نتیجہ ہے۔ لفظ جاٹ بدنام ہو گیا اور اب ایک پست درجے کے پُرامن انسان کے لئے مستعمل ہے جو بیچارہ اپنے حقوق کی حفاظت بھی نہ کر سکتا ہو۔ سندھی محمود خان قلات کی رعایا کے دشمن ہونے کے باوجود اپنا ماخذ انہی کو قرار دینے پر خوش ہیں اور اپنے سرداروں کی انتہائی تعریف کرتے وقت اکثر کہتے ہیں کہ وہ اصل بلوچ ہے مجھے احساس ہے کہ کسی قوم کی کردار نگاری سیاح کے فرض کا ایسا حصہ ہے جس میں وہ اکثر غلطی کر سکتا ہے بالخصوص جب قوم کی خوبیاں بالکل انتہا تک پہنچی ہوئی ہوں لہٰذا میں پوری احتیاط کے ساتھ رائے زنی کرتا ہوں کہ موجودہ سندھیوں میں برائیاں ایک افسوسناک حد تک غالب ہیں۔ وہ لالچی ہیں، پُرفریب، ظالم، احسان فراموش اور حق وصداقت سے

بیگانہ لیکن ان کی صفائی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی موجودہ نسل ایسی حکومت کے تحت پروان چڑھی ہے جو اپنے استحصال، جہالت اور ظلم کی بنا پر دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے اور یہ تمام ممالک میں ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ لوگوں کا ذہن بنانا حکمرانوں کا کام ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سندھی کردار کے ان نقائص کو صرف اسی وجہ واحد سے منسوب کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اکثر معائب اس اخلاقی خباثت کا نتیجہ ہیں جو کم و بیش ایشیا کی ہر اس قوم کی آزادی اور سماج میں موجود ہے جس کا ہمیں معمولی سا بھی علم ہے۔ سندھیوں کے مبینہ محاسن سراسر جسمانی ہیں اور اگر ہم انہیں کلی طور پر بھی تسلیم کر لیں تو بھی وہ ان کے معائب کے مقابلہ پر چھوٹے ہیں۔ یہ زیادہ تر ذاتی بہادری، اجتناب، جفا کوشی اور اطاعت شعاری بتائے جاتے ہیں جو انہیں اکثر ہندوستانی فوجوں کی طرح کرائے کے بہترین سپاہی بننے کا اعزاز بخشتے ہیں۔ ان میں سے اکثر انہیں اپنے ہمسایوں اور آباؤ اجداد یعنی بلوچوں سے وراثتاً ملے ہیں، لیکن خواہ آب و ہوا کا اثر ہو، خواہ ظالمانہ حکومت کا قہر ہو، خواہ دوسری قوموں سے اکثر میل جول کا نتیجہ ہو۔ سندھیوں کے اندر یہ چیز موجود نہیں جو بلوچوں میں اب بھی موجود ہیں۔ عادات و اطوار میں وہ عموماً بڑبولے اور ناشائستہ ہیں، ذہن میں کند اور نااہل ہیں اور مہمان نوازی اور وفا کیشی میں بے لحاظ اور کورے ہیں۔ ان کی اکثریت سُنّی مسلمان ہے لیکن امیر اور کبیر دربار شیعہ ہیں۔

سندھی مرد سانولے رنگ کے ہیں لیکن مجموعی طور پر بیحد خوبصورت ہیں۔ وہ اہل ایشیا کے درمیانی قد و قامت سے بلند ہیں اور اچھے خد و خال اور قوی اعضا و جوارح کے مالک ہیں۔ سندھی عورتوں کا حسن مشہور ہے اور صحیح طور پر مشہور ہے۔ جب ہم ٹھٹھہ اور حیدرآباد میں سوار ہو کر باہر نکلتے تھے تو ہمیں اونچے طبقے کی عورتیں کبھی کبھار نظر آتی تھیں جو ہمیں دیکھنے کی شوقین تھیں لیکن رقاصاؤں کے طائفے جو اکثر ہمارے پاس مظاہرۂ فن کے لئے آتے تھے میں نے ان میں ایک بھی ایسی نہیں دیکھی جس کا چہرہ دلربانہ ہو یا اس کا جسم سمارٹ نہ ہو بلکہ اکثر یہ دیکھا کہ یہ دونوں صفات ان میں رچی بسی تھیں۔

مردوں کا لباس ایک کھلی قمیض، ایک شلوار جو ٹخنوں پر چنٹ دار ہو اور ایک روئی دار سوتی یا کپڑے کی ٹوپی ہے جس کے ارد گرد ریشم یا سونے کے پھول کاڑھے ہوئے ہوں۔ عورتوں کا لباس بھی ایسا ہی ہے لیکن ٹوپی نہیں اور وہ قمیض کے نیچے ایک ریشمی جیکٹ پہنتی ہیں، جو جسم کے مطابق ہو اور جس کے تسمے پیچھے بندھے ہوں۔ باہر نکلتے وقت وہ ساڑھی یا چادر پہنتی ہیں جس کا ایک پلو سر پر ہوتا ہے اور جس

سے وہ اجنبیوں کے سامنے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتی ہیں۔(ایچ پوٹنگر)

(4)

اس سرزمین کے باشندے دراز قد، سیاہی مائل رنگ کے حامل، وجیہہ اور مضبوط نسل کے لوگ ہیں۔لیکن ان میں ایسی کوئی ظاہری خاصیت نظر نہیں آتی جو ہندوستان میں کسی مخصوص ذات سے منسوب ہوتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے ہندوستانی سپاہیوں کی نسبت جسمانی لحاظ سے کم تر ہیں۔ پھر اس بات میں بھی شبہ ہے کہ آیا سندھی عورتوں کی جتنی تعریف ہوتی ہے کیا وہ اس تعریف کے لائق بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ میرے تحقیق کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ جتنی بھی خوش نظر رقاصائیں ہمیں ملیں اُن کا تعلق راجپوتانہ یا ملتان سے ہے۔

سندھ کی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ امیروں، سرداروں، بلوچوں، سیّدوں اور مختلف مسالک کے مذہبی راہنماؤں پر مشتمل ہے۔ان کو ہم مراعات یافتہ طبقہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا حصہ زراعت پیشہ اور دیگر مسلم قبائل پر مشتمل ہے جن کو جھیت (Jheets) اور بردی (Boordees) کہا جاتا ہے یہ سارے سندھ میں پھیلے ہوئے ہیں۔تیسرا حصہ ہندوؤں کا ہے۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کے تمام طبقات اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔جن کو میں نے مراعات یافتہ طبقہ کہا ہے وہ لوگ کلیتاً دوسروں کی محنت اور مشقت پر انحصار کرتے ہیں۔ پھر اس طبقے میں ان کے پاس کوئی جائیداد یا ذریعہ آمدن نہیں ہے وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں۔ یہ بات تعجب انگیز نہیں ہے کہ یہاں پر بعض لوگ جو بظاہر قابل عزت نظر آتے ہیں وہ گھوڑے پر سوار مسلح ہو کر اور تلوار و ڈھال پکڑے ہوئے خیرات مانگتے ہیں اور جب ان کو خیرات دینے سے انکار کر دو تو وہ بہت متشدد نظر آتے ہیں اور گندی زبان استعمال کرنے لگتے ہیں۔سندھ کے تمام مسلمان خاص طور پر بلوچی لوگ ترش مزاج، گستاخ، شورش پسند اور باہمی جھگڑوں کے عادی ہیں۔ جوتی (Juttee) اضلاع میں لوگ ہمیں کافی مہربان اور مہمان نواز ملتے ہیں۔مگر شہروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ جب ہمارے بعض لوگ پہلی بار سندھ میں اپنا راستہ بھول گئے تھے تو جھیت (Jheets) لوگوں نے ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔اگر ہم کسی مجلس میں ہر فرد کے داخلے کے وقت کل حاضرین کے احتراماً کھڑے ہو جانے اور ایک گھنٹے میں پچاسوں بار اس کی مزاج پرسی کرنے کو الگ رکھ دیں تو پھر تو سندھ کے لوگ سچی شائستگی سے

بالکل عاری ہو جاتے ہیں۔اعلیٰ طبقات اچھے لباس اور بھڑکیلے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔لیکن لوگوں کی بھاری اکثریت اتنی غریب ہے کہ ان کے کپڑے بمشکل ہی لباس کا مقصد پورا کر پاتے ہیں۔

سندھی کردار میں چھچھورے پن کو بڑا دخل ہے اور یہ چیز کم ترین طبقے سے اعلیٰ ترین طبقے تک سب میں پائی جاتی ہے جب ہمارا وفد حیدرآباد آیا تو بوڑھے امیر نے یہ کہلا بھیجا کہ اس کا خیال ہے کہ تحائف میں اس کے لئے جو چیزیں ہیں ان میں کچھ بلوری مصنوعات بھی شامل ہیں۔جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔اس نے کہا کہ ان کو بدل دیا جائے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زیادہ قیمتی اشیاء کے حصول کا خواہش مند تھا۔اس کو اس بات کی اطلاع کس طرح سے لگی یہ کہنا تو ناممکن ہے لیکن سفیر نے اس کو پیغام بھجوا دیا کہ یہ تحائف اپنی قیمت کی وجہ سے منتخب نہ کئے گئے تھے بلکہ اپنے مفید استعمال کو مدنظر رکھ کر لائے گئے ہیں اور یورپی مصنوعات کے نمونے ہیں۔ اس لئے عزت مآب کو یا تو یہ سارے قبول کر لینے چاہئیں یا پھر کوئی بھی نہیں لینا چاہئے۔ان بربری لوگوں کے ساتھ اس طرح سے معاملہ طے کر لینا ان کے ساتھ آئندہ ہونے والی گفتگو کو کامیاب بنانے میں بہت مئوثر ثابت ہوا۔

سندھی مسلمان اپنے مذہبی عقائد کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا۔ان کے تمام تر مذہبی اصول وضوابط پر سیّدوں،فقیروں اور دیگر مذہبی راہنماؤں کی اجارہ داری ہے جو پورے ملک پر قابض ہیں اور جن پر امیروں کا بھی اختیار نہیں ہے۔ ہندوستان کے برہمنوں کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور غالباً وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔وہ اپنے ہم مذہبوں پر ماضی میں بہت مئوثر اور غیر محدود اختیار کے حامل تھے مگر اب ایسا نہیں ہے۔لیکن پھر بھی وہ بعض معاملوں میں کافی صاحب اختیار ہیں۔ جبکہ سندھ کے سیّد کہ جن کے اختیارات بہت زیادہ لامحدود اور ظالمانہ نوعیت کے ہیں وہ مشرق کی سب سے زیادہ جاہل قوم سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔ملک میں ان کی املاک بہت زیادہ ہیں۔سہون،ہالہ،کنڈی اور دیگر مقامات پر ان کا پورا پورا قبضہ ہے یہاں پر سفری چنگیاں اور کسٹمز وصول کرنے کا ان کو مکمل اختیار ہے۔(ڈبلیو۔پوٹنگر،صفحات 55-51)

(5)

سندھ کے باشندے مسلمان اور ہندو ہیں۔اول الذکر میں سے بلوچیوں کا تعلق جنگجو نسل سے

ہیں۔ پھر جاٹ ہیں جو کاشتکار ہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت جن لوگوں پر بھروسہ کرتی ہے ان لوگوں کا پانچواں حصہ ہندوؤں اور جاٹوں پر مشتمل ہے۔ جاٹ دراز قد اور خوبصورت لوگ ہیں۔ دراصل یہ ہندو تھے اور کہا جاتا ہے کہ یہی اس ملک کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ ان کی عورتیں اپنی خوبصورتی اور پاکبازی وحیا سے پہچانی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق زرعی طبقے سے ہے اسی لئے وہ پُر امن اور خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ کاشتکاروں کے علاوہ شہروں میں بھی ہندو لوگ رہتے ہیں۔ مذہبی اور دیوانی تعلقات کے حوالے سے ان سے بہت برا سلوک کیا جاتا ہے مگر پھر بھی ملک کی دولت وتجارت زیادہ تر انہی کے ہاتھ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملک کی آبادی میں ان کی تعداد دس لاکھ افراد میں سے صرف دو لاکھ ہے۔ وہ اپنی داڑھیاں بڑھنے دیتے ہیں اور مسلمانوں کے سے صافے استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے ان ہی کے رسم و رواج اختیار کر لئے ہیں۔ ان کے ساتھ یورپ کے یہودیوں والا برتاؤ اور سلوک کیا جاتا ہے۔ گو کہ وہ خوبصورت ہیں مگر جاٹوں سے بھی زیادہ گندے غلیظ ہیں۔ بنکار ہونے کی حیثیت سے ان پر کافی اعتبار کیا جاتا ہے اور ان کی ہنڈیاں پورے ہندوستان میں قبول کی جاتی ہیں۔

جاٹ لوگ بیلوں، بکریوں اور اونٹوں کے ریوڑوں میں رہتے ہیں۔ اونٹ ان جاٹوں کے لئے بہت قیمتی اور مفید ہے بالکل اس طرح جس طرح کہ عربوں کے لئے گھوڑا ہوتا ہے۔

میانی (Miani) لوگ ماہی گیری اور کشتی رانی سے وابستہ ہیں۔ وہ جتنی تعداد میں ساحل سمندر پر رہائش پذیر ہیں اتنی ہی تعداد میں دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے بھی آباد ہیں۔ بعض کے پاس تو اپنی کشتیوں کے علاوہ کوئی رہائشی جگہ بھی نہیں ہے۔ ان کی عورتیں بھی مردوں کی طرح سے چوست اور طاقت ور ہیں۔ وہ ان کی محنت و مشقت میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ جب ان کے مرد ستا رہے ہوں یا تمباکو پی رہے ہوں اور ان کا بچہ پنگھوڑے میں سو رہا ہو تو وہی کشتی کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

بلوچی جو کل آبادی کا مشکل سے ہی دسواں حصہ ہیں وہ صحرائی آزاد باشندے ہیں۔ وہ حقیقت میں شمال مغربی پہاڑوں سے اُتر کر آئے ہیں۔ ان کی بہت سی عادتیں اور رسومات، موسوی قوانین سے مشابہ ہیں۔ ان کی زبانی اور تحریری روایات بھی یہی ہیں کہ وہ یہودی النسل ہیں۔ ان کے خدوخال بھی یہی اشارہ دیتے ہیں کہ وہ اسرائیل کے گمشدہ قبائل کی نسل ہیں۔ مثلاً شوہر کی وفات پر بھائی اس کی بیوہ سے شادی کرنے کا پابند ہے، اور مرحوم کے وارثان صرف اس کی اولاد ہوتے ہیں پھر یہودیوں کے

عام رواج کی طرح سے یہاں بھی ایک شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ وہ خود کو اس ملک کا ملک سمجھتے ہیں۔ اپنے اسلحہ، ڈاکہ زنی اور شکار سے ان کو بہت لگاؤ ہے۔ ان میں سے بہت کم زراعت سے وابستہ ہیں۔ تقریباً یہ سب ہی اونٹوں اور گھوڑوں پر سواری کرتے ہیں۔ ان کی جہالت اور غیر تہذیبی حالت کہ جس میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو تہذیب یافتہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر قبیلہ صرف اپنے سردار کا کہنا مانتا ہے۔ اگر کسی قبیلے کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو اونٹوں اور گھوڑوں پر ہر جانب پیغام رساں روانہ کر دیئے جاتے ہیں تا کہ تمام قابل اسلحہ بردار افراد کو جمع کیا جا سکے۔ یہ اونٹ اتنے محنتی اور تیز رفتار ہوتے ہیں کہ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاتی ہے کہ جب لارڈ کین (Lord Keane) اس ملک میں داخل ہوا تو میر نصیر کے ملکیتی ایک اونٹ نے پچاس اور ساٹھ جغرافیائی میل کا درمیانی فاصلہ دو روز میں طے کر لیا۔ ہر سوار اپنے اونٹ کی طاقت برقرار رکھنے کی غرض سے اس کو چاول، گھی اور نشہ آور ادویات دیتا رہتا ہے۔

بلوچیوں کے مکانات گندے اور تنگ و تاریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے دیگر لوگوں کے مکانات بھی ہیں۔ صرف سرداروں کے گھر زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں ان کو قالینوں سے سجایا جاتا ہے۔ عورتیں گھریلو امور سے وابستہ رہتی ہیں جبکہ مرد تمبا کو نوشی، شراب نوشی کے علاوہ سوتے رہنے اور بچوں سے کھیلتے رہنے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گو کہ بلوچی دراز قد نہیں ہوتے مگر وہ قوی ہوتے ہیں۔ ان کی رنگت بھوری ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں خوبصورت اور بڑی متاثر کن ہوتی ہیں۔ مرد ریشم یا سوت کی بنی ہوئی رنگین ٹوپی پہنتے ہیں جس پر سونے یا چاندی کا کام ہوا ہوتا ہے۔ کھلا کُرتا، پیلی یا سرخ سوتی واسکٹ، چوڑا پاجامہ، نوکیلے جوتے ان کا لباس ہیں۔ وہ ہمیشہ خنجر، تلوار، ڈھال اور تیر کمان سے مسلح رہتے ہیں۔ نہ تو وہ داڑھی بناتے ہیں اور نہ ہی بال تراشتے ہیں۔ وہ یا تو اپنے بالوں کو کندھوں پر پڑا رہنے دیتے ہیں یا پھر ان کو سر کے اوپر اکٹھا باندھ لیتے ہیں، ان کے ہاں داڑھی بڑی قیمتی شے ہے اور وہ اس پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ بوڑھے اور مذہبی وضع کے لوگ اس کو سرخی رنگ لگاتے ہیں۔ نیز آل نبیؐ کی طرح سے شیعہ لوگ کسی بھی رنگ پر سبز رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔ عورتیں چھوٹے پاجامے اور ایک ایسا لباس پہنتی ہیں جو زمین تک نیچے آتا ہے اور اوپر جسم پر چست سا ہوتا ہے۔ سر کے اردگرد ایک نقاب ہوتا ہے اور ان کے بال لمبی لمبی چٹیوں کی شکل میں بکھرے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار ہی اپنا لباس تبدیل کرتی ہیں اور اتنی گندی ہوتی ہیں کہ نہ تو ان کے کپڑے اور نہ ہی

ان کے چہرے پہچانے جاسکتے ہیں۔(ایل۔اورلچ۔I،صفحات91-95)

(6)

گو کہ یہ ملک بہت زرخیز ہے اور یہاں پر سبزیاں بڑی تیزی سے اُگتی ہیں مگر جیسا کہ یہ ملک سندھیوں کے قبضے میں ہے تو یاد رکھئے کہ روئے زمین پر ان سے زیادہ کاہل و سست نسل کوئی نہیں ہے۔ کئی لوگوں کی رائے ہے کہ ان کی کاہلی یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے ہے لیکن یہ سوال بحث طلب ہے۔غالباً غریب تر طبقات میں نشہ آور بھنگ اور حقہ کا عام استعمال بھی تو ان کی سست اور کاہل عادات کا سبب ہوں گے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑھئی کو ایک بورڈ صاف کرنے میں ہی آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ وہ آنے جانے والے لوگوں کو دیکھنے پر دھیان دیتا تھا اس کے بعد لکڑی پر ایک یا دو بار رندا چلاتا تھا۔ پھر نیچے جھک جاتا۔اس وقت ہمارا یہ محنتی دوست شاید حقے کا کش لگایا کرتا تھا، دس منٹ گزرنے کے بعد وہ پھر کام شروع کرتا۔ تین چار بار اس کوتراشنا بڑی بات تھی۔اس کے بعد بڑھئی کو خیال آیا کہ رات کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ یوں یہ لمبا کام ختم ہوا۔اس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور صبح تک کے لئے اپنی دوکان بند کردی۔ وہ صبح جو کچھ بھی آٹھ گھنٹے میں کرتا تھا وہی کام ایک یورپی چند منٹ میں کرلیتا ہے۔ جو شخص بھی ہندوستان میں زیادہ عرصہ قیام کرے اس کو اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہاں کے درزی بدتر تو نہیں ہیں البتہ برے ہیں۔کوئی نفع بخش کام کرنے کے ضمن میں وہ تمہارے پاجامے میں سے بٹن کاٹ کر نکال لے گا۔اس کی جگہ دوسرے لگا دے گا اور پھر بڑی نرمی کے ساتھ ''مالک'' کے ہاتھ میں اس کا بل تھما دے گا۔اینٹیں بنانے والے کسی ایک اینٹ کو اس کی جگہ پر لگانے سے قبل آدھا گھنٹہ تو اس اینٹ کو ہی گھورتے رہیں گے۔اتنے کاہل ساتھیوں کی موجودگی میں کوئی شخص تیزی سے ترقی کرنے کا کیسے سوچ سکتا ہے؟ یہ تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو تہذیب یافتہ بنانے کی غرض سے بہت بڑا اقدم اُٹھایا جا سکتا ہے؟ سندھی لوگ بڑے اچھے، دراز قد اور خوبصورت لوگ ہیں۔ ان کی رنگت سیاہی مائل ہے۔ان میں ہمت بالکل نہیں ہے۔البتہ میں نے ان میں خصوصاً شکاریوں میں کئی سخت اور اچھے عوامل بھی دیکھے ہیں۔امیر طبقے بہت مغرور ہیں مگر وہ اپنے ہم مرتبہ لوگوں اور یورپی افسران سے بڑی نرمی اور ملائمت سے بات کرتے ہیں۔ان کے خیالات میں اوہام پرستی کو بڑا دخل ہے ان کا اخلاق بھی سوالیہ انداز کا ہوتا ہے۔(جیمز۔I،صفحات55-56)

(7)

خاص سندھی لوگ دراز قد، مضبوط جسم کے مالک اور مغربی ہندوستان کے مقامی لوگوں کی نسبت زیادہ طاقتور اور لڑاکے ہوتے ہیں۔ دریائے سندھ کے پار جو اقوام آباد رہتی ہیں ان کے ساتھ نہ تو ان کے ہاتھوں کی ساخت ملتی ہے اور نہ ہی پیروں اور ٹخنوں کی مشابہت ہے۔ دراصل سندھی نسلی طور پر آدھے ہندوالنسل اور آدھے فارسی النسل ہیں۔ اول الذکر سب سے زیادہ نامکمل اور موخرالذکر کا کیشیائی قوم کے (Caucasian) میں سب سے زیادہ مکمل لوگ ہیں۔ ان کے خطوط اچھے ہیں۔ اس صوبے میں چھوٹی پیشانی اور سیدھے بال کہیں کہیں نظر آتے ہیں اعلیٰ طبقات کے درمیان داڑھی بہت خوبصورت لگتی ہے گو یہ فارس یا افغانستان والوں کی داڑھی کی نسبت کم تر نظر آتی ہے۔ گندمی رنگت سندھیوں کے کم ترقی یافتہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اُن میں اتنا حوصلہ موجود نہیں ہے۔ ان کے کردار میں پہاڑی قبائل کی بہادری اور محنت ومشقت دونوں کا رنگ موجود ہے۔ پھر وہ ہندو بنیوں اور صرافوں (Shroffs) پر بھی انحصار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس بیچارے کو ہر ممکن حد تک لوٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ سندھی سست اور کاہل ہے۔ گندا رہتا ہے اور نشہ کا عادی ہے۔ خطرے کے وقت وہ بڑی بدنام حد تک بزدل نظر آتا ہے۔ پھر جب اسے کوئی ڈر نہ ہو تو وہ گستاخ ہو جاتا ہے۔ اس کی سچ یا دیانتداری کا کچھ خیال نہیں ہے بس بیوفائی کا نمونہ بننے کے لئے زیادہ سے زیادہ صلاحیت کے حصول کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے بڑے بڑے پیشوں میں زراعت، ماہی گیری، شکار اور گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کی پرورش شامل ہے۔ (آر۔ برٹن۔ ریسز، صفحات 84-83)

(8)

سندھیوں کی اپنے ہی ملک میں سماجی حیثیت بالکل اسی نہج پر ہے کہ جو سیکسن (Saxon) لوگوں کی اس وقت تھی کہ جب نارمن (Norman) قوم نے انگلینڈ فتح کیا تھا۔ اسی لئے اس کی جسمانی برتری کا جو کچھ خیال پڑتا ہے وہ مغربی ہندوستان میں اوسط درجے کے اخلاق کے بالکل اُلٹ ہے۔ دراصل وہ ایک مفتوحہ قوم ہیں۔ ایک ایسی وادی میں رہ رہے ہیں کہ جس کی آب وہوا بہت گرم ہے، اور انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ ان میں جسمانی طاقت تو ہے مگر قوت ارادی

بالکل نہیں ہے۔ اسی لئے نہ تو کسی جملے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا ذہن آزادی اور حریت کی جانب مائل ہے۔ اب تو وہ اس توہین کا عادی ہو چکا ہے اور اس چیز نے اُس کی دماغی صلاحیت کو ختم کر دیا ہے، ان دونوں باتوں کی وجہ سے اس نے تو خود کو غلام ہی بنا دیا ہے۔

سندھیوں کے بڑے ذرائع آمدن زراعت اور مزدوری ہیں۔ اس صوبے میں ان کے پاس پیداواری زمین نہیں ہے، یہ قطعات اراضی ان نہروں کے کنارے ہیں کہ جہاں پر پانی کبھی کبھار ہی آتا ہے اور زمین پھٹ گئی ہے اور پانی بہنے لگا ہے۔ لیکن بلوچی جاگیرداروں اور ان کی افواج نے اپنے لئے سب سے زیادہ زرخیز اور پیداواری مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قابل رحم حالت تک غریب ہیں۔ میں نے پورے پورے خاندانوں کو سڑکوں اور شاہراہوں پر سے بڑی سادگی سے دانے چنتے دیکھا جو ان کو وہاں اتفاقاً مل جاتے ہیں۔

براعظم ایشیا کے اس حصے میں چند ایک ہی اضلاع ایسے ہیں کہ جہاں پر کاشتکار دیوالیہ نہیں ہیں۔ کسان اپنے کھیت کی نصف یا ایک تہائی پیداوار حکمران، امیر، گورنر یا کمشنر کو ادا کرتا ہے۔ تا کہ اپنے مشکل حالات کو بہتر بنا سکے۔ باقی دو تہائی پر اس کو اور اس کے پورے گھرانے کو نہ صرف سارا سال گزارہ کرنا ہوتا ہے بلکہ جب موسم آنے لگے تو اسی میں سے بیجوں کا خرچہ بھی نکالنا ہوتا ہے۔ یہیں پر مشکل آن پڑتی ہے۔ اول تو کسان بچت نہیں کر سکتا اور اگر وہ کر بھی لے تو وہ خود نہیں بچتا پس جب اسے بیج کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ہندو کے پاس جاتا ہے جو اس تباہ حال شخص کا وکیل اور مہاجن یا بنیا ہوتا ہے، اور پھر بڑی مشکل سے اسے سوگنا زیادہ قیمت پر مطلوبہ شے کی کم سے کم مقدار ملتی ہے جو آنے والی فصل کو اسی لمحے رہن کرنے کی شرط کے ساتھ دی جاتی ہے۔ یوں وہ برباد ہو جاتا ہے۔

سود وافر مقدار میں حاصل کرنے کے بعد بھی قرض خواہ جو کہ پڑھنا لکھنا اور حساب کرنا جانتا ہے وہ اپنے قرض دار کی جہالت سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور کھاتے کو کچھ اس طرح سے منتشر کیفیت میں تیار کرتا ہے کہ وہ صرف اسی کے لئے سودمند ہوتا ہے جو اسے سمجھ سکے۔۔۔۔ یعنی قرض خواہ خود۔ بے چارہ قرض دار درجن بار یا اس سے بھی زیادہ دفعہ تمام رقم ادا کرنے کے باوجود بھی قرض دار رہتا ہے۔ مقامی حکمرانوں کے دور میں، اور ہر نظام میں بھی، یہ اسی طرح سے رہا ہے۔ کیا برطانویوں کو بھی ایسا ہی کرنا ہو گا۔ جس جگہ صرف مقامی لوگ حکمران ہوں تو وہاں وہ بڑے بڑے ادارے قائم کرتے ہیں۔۔۔۔ جیسے پیداواری منڈیاں وغیرہ۔۔۔۔ ایسا ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ لوگ بڑی آسانی سے

کاشتکاروں کی مطلوبہ رقم کم کرا لیتے ہیں۔ بے تحاشا جنگ و جدل، ہنگاموں اور فتوحات نے بھی بہت اچھا اثر ڈالا ہے اور ہمارے لئے میدان ہموار کر دیا ہے۔

ہندو کا قلم ایسا ہتھیار ہے جس کے آگے اُداس سندھی کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں مشرقی سندھ میں سفر کر رہا تھا۔تو وہاں پر جو مقامی لوگ ہمیں ملنے آئے وہ ہر یورپی کو رحم دل حکمران خیال کرتے تھے۔ وہ ہمارے خیمے میں آ کر ہمارے ہیٹ اور جیکٹ کی تعظیم کرتے تھے۔ آخری ملاقاتیوں میں ایک خوبصورت شخص تھا جو ایک ہندو تھا مگر تھا گندا سا۔اس کے پاس ایک نظم لکھی ہوئی تھی جس میں اس کی شکایات درج تھیں جن میں کسی ناراض مسلمان مزارع کا ذکر بھی تھا جس نے قانونی معاہدے کے باوجود قرضہ واپس نہ کیا تھا۔

وہ خانہ بدوش سندھی جو مغربی پہاڑیوں میں آباد ہیں اور مشرقی سرحدوں کے صحراؤں میں رہائش پذیر ہیں وہ لوگ ان لوگوں کی نسبت زیادہ دراز قد اور محنتی ہیں کہ جو دریائے سندھ کے میدانوں میں آباد ہیں۔ خدوخال کے حوالے سے ان کو ان کے پڑوسی بلوچوں سے مشکل کے ساتھ اچھے بُرے میں تمیز کیا جا سکتا ہے۔ مؤخرالذکر بعض معاملات میں اپنی طاقت کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ان کے پیشوں میں ماہی گیری، شکار، گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کی پرورش شامل ہے۔ زراعتی لوگ البتہ اپنے چھوٹے چھوٹے قطعہ ہائے اراضی کاشت کرتے ہیں جو ان کو اور ان کے خاندان کو روٹی فراہم کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔(آر۔ برٹن۔اداس وادی۔I،صفحات 58-252)

(9)

بعض اوقات جب ایک سندھی مسلمان کسی سیّدانی سے شادی کر لیتا ہے تو ان کی اولاد گدو(Gaddo) کہلاتی ہے۔ گدو کے ہاں کسی سندھی مسلمان سے ہونے والی اولاد کمبیانی (Kambiani) کہلاتی ہے۔

ہندوستان کے عام مقامی لوگوں کی نسبت سندھی زیادہ لمبے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ان کی رنگت سیاہی مائل ہوتی ہے۔دانت چمکدار ہوتے ہیں۔جسمانی طور پر وہ مضبوط اور طاقت ور ہوتے ہیں لیکن سست اور کاہل ہونے کے علاوہ وہ لوگ بزدل، نشے کے رسیا، حددرجہ بداخلاق، گندے، غلیظ اور ناگزیر حد تک جھوٹے بھی ہوتے ہیں۔ان کا یہ کردار غالباً پہاڑی قبائل کے سخت ہاتھوں سے ہونے والے مظالم کے تجربات

حاصل کر کے ہوا ہے۔ وہ آخرکار اسی پر انحصار کرنے لگے ہیں کہ جنہوں نے انہیں تباہ و برباد کیا۔ عزت مآب میر علی مراد کو نہ تو کسی سندھی پر اعتبار ہے اور نہ ہی کسی بلوچی پر۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس کی ساری فوج غیر ملکیوں پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر پٹھان ہیں۔ اس کے علاوہ خراسانی، روہیلے اور ملتانی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ (ای۔ اے۔ لانگلے۔ II، صفحات 43-42)

خواتین

اپنی ظاہری شکل وصورت میں سندھی عورتیں مغربی ہندوستانی عورتوں کی نسبت زیادہ صاف رنگت اور اچھے خدوخال کی مالک ہیں۔ البتہ مؤخرالذکر اپنی کشش اور نزاکت میں ان سے برتر ہیں۔ ہمارے صوبے کے شمالی حصے میں حسین عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے خاص طور پر اعلیٰ طبقے کی عورتیں۔ ان کی تعلیم پر بالکل توجہ نہیں دی جاتی۔ چند ایک عورتیں ہی پڑھ سکتی ہیں اور اتنی ہی لکھنے والیوں کی تعداد ہے جو اپنی مقامی زبان میں کچھ لکھ سکتی ہیں۔ قرآن پاک کو سمجھے بغیر ہی پڑھایا جاتا ہے۔ کسی پورے شہر میں چار پانچ عورتوں سے زیادہ کوئی بھی فارسی کا صحیح ایک لفظ نہیں بول سکتا۔ پھر بھی کچھ عورتیں ایسی ہیں جو ضرورت پڑنے پر لڑکیوں کو پڑھا سکتی ہیں۔ تاہم وہ جو کچھ پڑھتی ہیں اس میں زیادہ تر کسی نامعلوم محبوب کے لئے کہے گئے اشعار ہوتے ہیں۔ پھر ان اشعار کا شعروں میں ہی جواب بھی دیا جاتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے سندھ میں مسلمانوں کا رویہ حد درجہ تعصب پر مبنی ہے۔ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی عورتیں بہت حسین اور چالاک ہیں، وہ ان کے سروں پر اپنے ہتھیاروں سے اس طرح وار کر دیتے ہیں۔ جیسے وہ ہتھیار نہ ہوں بلکہ قلم ہوں۔ اپنے طرز و اطوار میں سندھی عورت کو ہندوستانی عورتوں کی شرافت اور افغانی و فارسی عورتوں کی زندہ دلی درکار ہے۔ اس کو سماجی تعلقات سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ وہ حماموں میں بھی نہیں جا سکتی۔ اسے کھیل کود کا بہت شوق ہوتا ہے اور بڑی مہارت سے دھاندلی بھی کر سکتی ہے۔ ان عورتوں کے بڑے بڑے کھیلوں میں پاچی، تاش اور کوڑی کا کھیل شامل ہیں۔ بسا اوقات وہ ان کھیلوں میں اتنی جذباتی ہو جاتی ہیں کہ اکثر و بیشتر شدید جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ کوئی چیز داؤ پر بھی لگائی گئی نہیں ہوتی ہے۔ سندھی عورتیں اپنی زبان کے حوالے سے بہت خوش اطوار ہیں خصوصاً گالیوں میں، وہ اپنی جنس کے حوالے سے چند مخصوص الفاظ استعمال کرتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو مردانہ گالیاں بھی بکنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ سر کے اور بھنگ سے

تیار کی گئی مختلف اشیاء استعمال کرتی ہیں۔ نشے میں وہ ہمیشہ جرعات (الکوحل) استعمال کرتی ہیں ان میں سے اکثر نسوار پیتی ہیں اور تقریباً سب کے سب حقے سے تمبا کو کے کش لگاتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بناؤ سنگھار بھی بہت کرتی ہیں اور تفریح وخفیہ عشق لڑانے سے بھی دلچسپی ہے۔ مؤخر الذکر کا تو پورے ملک میں زور ہے۔ مثال کے طور پر کراچی جیسے چھوٹے سے شہر میں بھی سات کٹنی عورتیں موجود ہیں جن میں سے تین ہندو ہیں اور چار مسلمان ہیں۔ اس کام میں رواج کے مطابق یوں ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی بوڑھی عورت کے پاس جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ عورت دروازے بند کر دیتی ہے تا کہ کوئی اجنبی نہ آنے پائے پھر پانی اور حقے کی پیش کش کرتی ہے۔ اسی دوران میں وہ آنے والے کا نام اور دیگر احوال معلوم کرتی ہے۔ کافی گفتگو کے بعد آدمی اپنا مدعا بیان کرتا ہے اور اس کٹنی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کو کسی اچھی شادی شدہ عورت سے ملا دے۔ شروع میں تو وہ بوڑھی عورت قدرے ملائمت سے انکار کر دیتی ہے اور مختلف مسائل کا اظہار کرتی ہے۔ پھر وہ یہ کام کرنے کا ذمہ لے لیتی ہے مگر خرچہ کی ادائیگی پر زور دیتی ہے۔ بعدازاں اپنے ''لوازمو'' (یہ اصلاح اس موقع پر چند آنوں کے بطور ہدیہ ادا کئے جانے کے لئے استعمال ہوتی ہے) وصول کرنے کے بعد وہ کامیابی کی صورت میں اپنی رقم کی بابت سودا طے کرتی ہے اور کئی وعدے کر کے اپنے گاہک کو روانہ کر دیتی ہے۔ اگر اس کو صحیح رقم مل جائے تو وہ بعدازاں دونوں فریقین کو اپنے گھر پر ملنے کی اجازت دے دیتی ہے اور ان کے درمیان مختلف معاملات پر گفتگو کا اہتمام کرتی ہے۔ گو کہ یہ کام نفع بخش ہے مگر محفوظ ہرگز نہیں ہے۔ کٹنی بعض اوقات مایوس شوہروں کو اطلاع کر دیتی ہے جو شرمندگی کے بغیر ہی لکڑی کا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ یہ بوڑھی چڑیلیں بہت سے سنسنی پھیلانے والے معاملات میں ملوث ہیں جیسے نشہ کا کاروبار کرنا وغیرہ۔ اپنے شکار لوگوں کی خواہشات پوری کرنے کے لئے یہ عورتیں کئی نجس رسومات بھی سرانجام دیتی ہیں غالباً ان کے وعدوں اور خوشامدی زبان ہی وہ فطری جادو ہیں جو ان حیرت انگیز باتوں کو جنم دیتے ہیں۔ سندھ میں عورت خوشامد کی بہت شوقین ہے۔ اس کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یہ بات مشہور ومعروف ہے کہ کسی عورت کے لئے یہ بات کسی اعزاز سے کم نہیں کہ وہ کسی بڑے آدمی جیسے کاردار یا قاضی کے ساتھ دوستی کر لے۔ سندھی عورت اپنی ہندوستانی بہن کی نسبت زیادہ خوبصورت ہے مگر وہ خطرناک حد تک افغانی یا فارسی عورتوں سے کم بھی ہے۔ قابل ذکر جسارت کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً حکمران خاندان کے ایک رکن میر محمد کی بیویاں بہت حوصلہ مند ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ

کسی بوڑھی عورت کے ذریعہ انہوں نے زنانہ کپڑوں میں ملبوس کسی نوجوان بلوچ کو محل میں متعارف کرایا تھا۔ جب وہ عاشق زیادہ عرصہ تک وہاں پر نہ رہ سکا تو وہ فرار ہونے کی کوشش میں چھت سے گر پڑا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دربانوں نے بڑے خفیہ طریقے سے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ (آر۔ برٹن۔ ریسز، صفحات 299-296)

ہندو

(1)

مقامی باشندوں میں ہندو سب سے زیادہ محنتی اور ہوشیار ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں وہ تعداد میں صرف دو یا تین فیصد ہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی ختنہ نہیں کرتے۔ کچھ (Cutch) میں سندھ کی سرحد پر ایک بندرگاہ لک پور بندر (Lukpur Bunder) کے نام سے ہے۔ جب میر فتح علی خان نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی تو بہت سے ہندو اس جگہ بھاگ کر آ گئے اور اس شہر کو تجارتی حوالے سے شہرت عطا کی۔

ہندو ذات پات کے لحاظ سے بہت کم تر ہیں۔ یہ لوگ وِشنو اور شیو دونوں کی ہی عبادت کرتے ہیں۔ اپنے مذہب سے ناواقف ہیں اور اپنے مزاج میں کافی نرم خو ہیں۔ وہ گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ جو لوگ دربار میں ملازم ہیں وہ مسلمانوں کی طرح داڑھیاں رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی ہی طرح کے لباس پہنتے ہیں۔ (این۔ کرو، صفحات 22-21)

(2)

ہندوؤں کے بارے میں کہنے کو تو بہت کم باتیں ہیں۔ ان کے مسلمان بھائی ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں۔ نیز ان کی ظاہری حالت سے بھی ان کی ہتک و توہین کا اظہار ہوتا ہے۔ البتہ ان کی اس حالت سے ان کی لالچ، حرص اور آمدنی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنا تمام تر کاروبار بڑی رازداری سے چلاتے ہیں ہم نے ہر موقع پر ان کو ہمارے وفد کے ساتھ مالی معاملات میں فائدے کا خواہش مند پایا ہے ماسوائے ٹھٹھہ شہر کے۔ ان کو کسی بھی جگہ پر گدھے یا بیل سے زیادہ بڑی سواری پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح سے ان کو اپنے تہواروں سے لطف

اندوز ہونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ وہ لوگ ہندوستان سے، مندروں سے اور دیگر عوامی عبادت گاہوں سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔

جب بھی وفد کے خیمے میں ہندو لوگ مختلف اشیاء فروخت کرنے آئے تو امیروں کے سپاہیوں نے کہ جن کا مقصد سندھیوں اور ہمارے مابین اختلافات یا تنازعات کو ختم کرنا تھا، ہمیشہ ان ہندوؤں کو بلاوجہ مارنا پیٹنا اوران کی توہین کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ یہ ہمارے کہنے پر آئے ہیں مگران لوگوں نے پھر بھی کوئی پرواہ نہ کی اور بدسلوکی جاری رکھی۔ خیر پور میں ایک روز ریاستی وزیر فتح محمد غوری سفیر سے ملنے آیا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ قابل احترام ہندو ہمارے خیمے کے دروازے پر جھانکنے کی غرض سے آ گئے۔ وزیر نے اپنے ملازمین کو بلوایا۔ وہ سب لوگ خیمے میں جمع ہو گئے۔ تو اس نے کہا کہ ''ان ہندو کتوں کو نکال دو'' اور پھر ان کو مارتے پیٹتے بڑے ظالمانہ طریقے سے دھکیل دیا گیا۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحات 55-54)

(3)

ہندو پورے سندھ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بلوچیوں کے بنجر پہاڑوں میں صحراؤں میں اور میدانوں کے جنگلوں میں موجود چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں، غرض ہر جگہ آپ کو ایک ہندو اور اس کی تمباکو، کپڑوں اور دیگر اشیاء سے بھری ہوئی دوکان ضرور ملے گی۔ البتہ ان کی بڑی آبادیاں شمالی سندھ میں شکار پور اور جنوب میں کراچی کی بندرگاہ میں ہیں۔ اول الذکر شہر کا اس سمندر سے لے کر بحیرہ کیسپین (Caspian Sea) تک تمام ممالک میں تجارت پر بڑا اثر ورسوخ رہا ہے۔ ہندو تاجروں اور بنکاروں کے گماشتے وسط ایشیا کے اکثر حصوں میں نظر آتے ہیں اور یہ لوگ قندھار، قلات، کابل، خیوہ، ہرات، بخارا اور کسی بھی شہر کی تجارتی منڈی میں ہنڈیاں بنا سکتے ہیں۔ جب ان گماشتوں کو طلب کیا جائے تو وہ سندھ سے روانہ ہو جاتے ہیں اور برسوں تک وہیں پر رہتے ہیں اپنے خاندانوں کو ان وحشی اور بربریت پسند قبائل کے درمیان چھوڑ جاتے ہیں۔ کسی ہندو دلال یا گماشتے کو بیچ میں ڈالے بغیر ان ممالک کے کوئی سے دو مقامی باشندے بھی آپس میں کوئی سودے بازی نہیں کرتے۔ یہ دلال ایک بڑے سے کپڑے میں اپنا ہاتھ چھپا لیتا ہے اور فریقین سے بات چیت کرتا ہے اور مخصوص طریقے سے ہر ایک کے ہاتھ کو پکڑتا ہے۔ اس کپڑے کے ذریعہ انگلیوں کے دبانے کے عمل کو چھپا لیا جاتا ہے۔ اس

عمل سے قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ تعین جوڑوں کی شکل میں کیا جاتا ہے مثلاً دس انگلیاں سو کی شکل میں استعمال کی جاتی ہیں یا پھر جیسے بھی معاملے کی نوعیت ہو۔ یوں دیگر موجود لوگوں کو اس قیمت کا علم نہیں ہوتا کہ جس پر وہ شے فروخت ہوئی ہو یوں جس قیمت پر شے فروخت ہونے کی توقع ہو اس سے کم تر قیمت لگنے کے امکان کو رَد کر دیا جاتا ہے۔

کراچی جو سندھ کی بڑی بندرگاہ ہے وہاں پر اور دریائے سندھ اور اس کے پار کے ممالک میں بھی ہندوؤں کا اثر ورسوخ بہت زیادہ ہے۔ سندھ کے کسی اور علاقے کی نسبت یہاں پر انہیں بہت زیادہ تحفظ حاصل ہے۔ یہ لوگ امیروں کو اپنے تحفظ کے لئے معقول خراج بھی ادا کرتے ہیں۔ جو لوگ تجارتی امور میں مشغول ہیں وہ تو مکمل طور پر انہیں پر انحصار کرتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے ہندو کہ جن کی تجارت بہت وسیع ہے وہ نرخ ناموں میں اضافہ کرنے کا حکم بھی جاری کر دیتے ہیں، اور یہ صرف انہی کو ادا کیا جاتا ہے تا کہ ان کی تجارت چلتی رہے۔

سندھ میں ہندوؤں کی رنگت صاف ہے۔ چند ایک امیر ہندو شہروں میں بڑے آرام اور سکون سے رہتے ہیں لیکن غریب تاجروں کو گھٹیا ذات خیال کرتے ہوئے ان کے ساتھ یہودیوں کا سا سلوک ہوتا ہے۔ بعض علاقوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس طبقے کے ساتھ ہونے والے سلوک میں یہاں کے مقابلے میں بہت ہی کم فرق ہے۔ ملتان کے رواج کے مطابق یہ لوگ عموماً لمبی پگڑیاں پہنتے ہیں۔ تاہم ان میں سے اکثر غربت کی آڑ میں اپنی دولت چھپا کر رکھتے ہیں۔ سندھ میں ہندو عورتیں اپنے جسمانی خدوخال کے حوالے سے اچھی خاصی ہیں۔ لیکن تمام ہندو عورتیں صفائی اور رہائش کے حوالے سے مسلمان عورتوں کی نسبت زیادہ گندی ہیں۔ ان کے اور مسلمان عورتوں کے لباس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

سندھ میں ہندوؤں کا اتنا احترام نہیں کیا جاتا جتنا کہ ہندوستان میں ان کے ہم عقیدہ بھائیوں کا کیا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں رہتے ہوئے وہ اپنے رسم ورواج اور عادات کے حوالے سے آدھے مسلمان نظر آتے ہیں تاہم ان کے ساتھ سلوک بہت برا کیا جاتا ہے۔ ان کی ظاہری شخصیت گندی ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کو مسلمانوں سے برتر کرنے کے لئے جو اصول ذات پات اور مذہب کے بنائے گئے ہیں وہ یہاں پر مکمل طور پر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں البتہ سندھ میں ایک حوالے سے اس توہین آمیز گروہ کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی تجارتی اور مالی معاملات

میں گاہک کے ساتھ پوری دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔ سرداروں اور حکومت سندھ کے ساتھ تمام تر معاملات میں اسے شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے وگرنہ حزب مخالف کے غصے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف حالات میں کاروبار طے کرنے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے۔ سندھی ساہوکاروں کے اعزاز کا سب سے بڑا ثبوت وہ مقولہ ہے کہ ان کی ہنڈیاں شمال مغربی ممالک میں اور پورے ہندوستان میں نقد روپے کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی سندھ کا وہ طبقہ ہے کہ جسے ہم تحفظ فراہم کریں گے اگر یہ ملک کبھی تجارتی اہمیت کا حامل رہا ہے تو وہ صرف اور صرف انہی ہندوؤں کی وجہ سے رہا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے نقصانات کے خلاف طویل جدوجہد کرنی پڑی ہے، اور اس چیز کی سمجھ تو تب ہی آ سکتی ہے کہ جب انگلستان میں یہودیوں کی اس حالت پر نظر ڈالی جائے جو ہماری تاریخ کے مختلف عہدوں میں رہی ہے۔ مشکل حالات میں بھی ان لوگوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زیریں وادی سندھ اور افغان دروں کے پار ممالک کے مابین ہرات اور بخارا تک عظیم الشان تجارت جاری رکھی۔ ان میں تجارت کو فروغ دینے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کے فروغ کی خاطر ہی تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 66-65)

(4)

سندھ میں جو ہندو آباد ہیں وہ یا تو خود مہاجر ہیں یا پھر مہاجروں کی اولاد ہیں۔ یہ مہاجر ملتان یا دیگر شمالی ممالک سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے دو طبقات ہیں۔ لوہانہ (Lohanas) اور بھاٹیہ (Bhatias)۔ ماسوائے چند ایک استثناؤں کے سندھ کی تمام تر تجارت ان ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ جو اس ملک کے مالیہ کو رہن کر کے کثیر رقم بنا لیتے ہیں۔ امیروں کے عہد میں تو کم از کم یہی حالت تھی اور ریاست خیر پور میں آج بھی یہ کام ہوتا ہے یہاں پر حکمران کی ضروریات اس کو مجبور کرتی ہیں وہ مالیہ کی رقم رہن کر دے۔ ان مالیہ کا حق حاصل کرنے والوں کے لئے سودے بازی کے لئے یہ اچھا موقع ہوتا ہے۔ امیر کوئی بھی قربانی یا پھر رشوت دینے کو تیار ہوتا ہے۔ مسلمان شہزادے ابھی تک تحائف کا طریقہ استعمال کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی حالت ابتر ہے۔ پچھلے وقتوں میں جب سارا سندھ امیروں کے قبضے میں تھا تو بیچارے ساہوکار ان امیروں کے بہت دباؤ میں تھے۔ وہ بڑی محنت سے دولت حاصل کرتے تھے۔ اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ میر علی مراد بھی بڑی رغبت

دلا کر کچھ ہندولوگوں سے رقم حاصل کر لیتا ہے۔ اسے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کسی بھی قسم کے تشدد سے اس کے اپنے مفادات کونقصان پہنچے گا۔ میمنوں (Memuns) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سندھ میں کچھ (Cutch) سے آئے ہوئے ہندو ہیں۔ ان لوگوں کی بہت عزت وتوقیر کی جاتی ہے۔

لوہانو ہندوؤں کا طبقہ اپنے مختلف پیشوں کے حوالے سے دو بڑے طبقات میں تقسیم ہے۔

1- عامل یا حکومتی ملازمین۔

2- ساہوکار، تاجر وغیرہ۔

اول الذکر نے مسلمانوں کے اطوار اختیار کر لئے ہیں۔ وہ سندھی ٹوپی پہنتے ہیں، لمبی داڑھی رکھتے ہیں اور دھوتی استعمال کرتے ہیں۔ وہ صرف سر کے بال صاف کرتے ہیں۔ البتہ وہ سنت کے مطابق مونچھیں صاف نہیں کرتے۔ مذہبی پہچان کے لئے تلک لگاتے ہیں۔ پیراہن یا قمیض پہنتے ہیں جو بائیں جانب سے کھلی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ختنہ نہیں کرتے اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھاتے یا شادی کرتے ہیں۔ یہ لوگ وہی خوراک کھاتے ہیں جو سرسدھ برہمن (Sarsudh Brahmins) کھاتے ہیں۔ مسلمانوں سے گوشت خریدتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں کسی کی جان لینا بری بات ہیں۔ ان کی شادیوں میں عموماً 500 سے 600 روپے کے درمیان خرچہ آتا ہے۔ وہ مشکل سے ہی دوسری شادی کرتے ہیں وہ بھی تب کہ جب پہلی بیوی بانجھ ثابت ہو جائے۔ لوہانو کی ذیلی ذات خدا آبادی(Khudabadi) میں اگر کوئی عورت شروع میں ہی بیوہ ہو جائے تو متوفی کا بھائی اس سے شادی کر لیتا ہے۔ ابتدائی رسومات میں منگنی شامل ہے جو کسی سرسدھ اور موسیقار کی شمولیت سے سرانجام پاتی ہے اس میں ان کی بیویاں ہی شامل ہوتی ہیں۔ مرد دلہن کے باپ کے ساتھ معاہدہ کر لیتے ہیں اور عورتیں عورتوں کے ساتھ مل کر تمام معاملات طے کر لیتی ہیں۔ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا لیتے ہیں۔ وہ لوگ کسی اچھے شگون کے روز کچھ مٹھائی، ناریل اور چند روپے دولہا کی بہن اور بھاوج کو بھیجتے ہیں۔ اس کے بعد شادی کی رسومات طے کرنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ رسومات 9 دنوں سے 30 دنوں کے اندر پوری کی جاتی ہیں۔ کافی باتیں طے ہوتی ہیں برہمن اور گرو مختلف فارمولے پڑھتے ہیں اور آخر میں دلہن اپنے شوہر کے گھر لے جائی جاتی ہے۔

ہندو مسلمانوں کی مقدس رسومات کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا کہ خود مسلمان کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ امیروں نے بعض ہندوؤں پر زور دیا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر دیں یہ بات بہت

تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اگر کسی نے دوران گفتگو لفظ ''رسول'' استعمال کر دیا ہے تو خیال کیا جاتا تھا کہ اس نے نبی کریمؐ کا نام لیا ہے اور اسے مسلمان ہونے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ دفتری اندراجات میں یہ بات موجود ہے کہ خیر پور کے میر منشی نے گاؤں رسول آباد کا اصل نام کبھی تحریر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اسے وزیر آباد لکھا ہے۔

ریاست خیر پور میں میر کی ملازمت میں بہت سے ہندو ہیں، لیکن وہ سب ہی سندھی ٹوپی پہنتے ہیں اور اس حد تک مکمل طور پر مسلمانوں کا لباس اور اطوار اختیار کر لیتے ہیں کہ بمشکل ہی پہچانے جاتے ہیں۔ سندھ کے ہندو مشکل سے ہی ذات پات کی تفریق کی پرواہ کرتے ہیں۔ دراصل حالات نے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ان باتوں کو ترک کر دیں۔ ان کی رنگت قدرے صاف ہے۔ بعض تو بڑے شہروں میں بڑے ہی آرام سے رہتے ہیں لیکن ہر بازار میں عام بنئے اسی گھٹیا پن سے گزر اوقات کرتے ہیں جو نظر آتا ہے۔ وہ لوگ بہت کوتاہ شخصیت کے حامل ہیں اور مسلمانوں کی نسبت ان کی رہائش گاہیں بھی گندی ہو جاتی ہیں۔ ہندو عورتیں عموماً وہی کچھ پہنتی ہیں جو مسلمان عورتیں پہنتی ہیں۔ ہندوستان کی نسبت سندھ میں ہندوؤں کا طبقہ کافی کم تر درجہ کا حامل ہے۔ البتہ یہ بات پورے انصاف سے کہی جاسکتی ہے میں ان سے جب بھی ملا ہوں تو سندھی ساہوکاروں میں سے جس سے بھی مجھے لین دین کا واسطہ پڑا اس نے پوری دیانتداری سے کام لیا ہے۔ بلاشبہ کاروبار میں ان کی ایمان داری ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔

دریائے سندھ کے شمال مغرب میں آباد ہندو، ہندوستان میں آباد اپنے بھائیوں کی نسبت ذات پات اور مذہبی معاملات میں کم شدت پسند ہیں۔ غالباً یہ اس سلوک کا نتیجہ ہے کہ جس کا سامنا انہیں مسلمانوں کی جانب سے کرنا پڑا ہے۔ مجھے سندھ میں چند ایک ہی ایسے برہمن اور گرو ملے ہیں کہ جن کو شکار پور میں اپنے تہوار منانے کی آزادی حاصل ہے۔ البتہ برطانوی حکومت کے زیر انتظام اضلاع میں یہ پابندیاں ہٹا دی گئی ہیں، اور میر علی مراد تو اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ ان لوگوں کی پوری طرح سے حوصلہ افزائی کرے جو اسے جنگ کے لئے طاقت فراہم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے مختار کار اور دیگر بڑے بڑے اور بہت قابل اعتماد ملازمین ہندو ہی ہیں۔ خیر پور کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد میں مشکل سے ہی یہ لکھنے کی ضرورت ہے کہ ان ہندوؤں میں میر منشی کشن داس، اس کا بھائی بشن داس اور اس کے بھتیجے اور بیٹے بھی شامل ہیں۔ کشن داس بڑا

قابل آدمی ہے اور اس کا بھائی اپنی صلاحیتوں میں اس سے تھوڑا سا ہی کم ہے۔ تمام طبقات ان کی عزت کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ کسی بھی ہندوستانی دربار کے مشکوک ماحول میں انہی کو سب سے زیادہ ایماندار خیال کیا جاسکتا ہے۔(ای۔اے۔لانگلے۔II، صفحات 81-75)

(5)

آگے چلنے سے پہلے میں تمہیں خاص شکارپور کے ہندوؤں کے بارے میں بتاتا چلوں۔ یہاں کا ہندو کوتاہ قد ہے، پھٹی ہوئی سیاہ آنکھیں، جھریاں پڑے ہوئے پپوٹے، کانٹے دار ناک، موٹے ہونٹ، پھولے ہوئے گال اور پھر لالچ وحرص نے اس کی حالت ایسی بنا دی ہے کہ ہر دیکھنے والا اسے فوراً شناخت کرلے گا۔ اس کے لباس میں سفید رنگ کا عمامہ، واسکٹ شامل ہے۔ وہ اپنے کندھے پر دوہرا زنار باندھتا ہے۔ سفید رنگ کا کوٹ پہنتا ہے۔ اپنی ذات کا مخصوص نشان استعمال کرتا ہے جو اس کی پیشانی پر نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی مالا ہوتی ہے جو ترس وترحم کا نشان ہوتی ہے پھر اس کے کان پر ایک سرخ قلم بھی نظر آتا ہے۔ ہر پہلو سے یہ شخص مشرقی تاجر نظر آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا ہے، اور وہ تو اس میں ایک پیسہ بھی اضافہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ پہاڑی علاقے میں کوئی زرخیز علاقہ خریدنے کے بھی قابل ہے۔ اگر کوئی پہاڑی شخص اس کے کپڑوں کی دوکان پر پہنچ جائے تو وہ اسے مال فروخت کرکے ہی دم لیتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کے پاس سے گزرے تو بمشکل ہی وہ اس کی موٹی توند اور بڑی بڑی مونچھوں پر نظر ڈالے بغیر گزر سکتا ہے۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں جو اس کے منہ کے دونوں جانب ڈھلکی رہتی ہیں۔

شکارپور تقریباً 1617ء میں قائم ہوا۔ اس شہر کی جغرافیائی نوعیت تجارتی لحاظ سے بہت اہم تھی اسی لئے یہ جلد ہی ہندوستانی اور خراسانی تجارتی قافلوں کا ٹھکانہ بنا۔ اس کے اردگرد کی اراضی کافی زرخیز اور پیداواری نوعیت کی حامل رہی ہے۔ اس بات کے ثبوت کے طور پر نہر آج بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ جو اس سے ملحق ہے۔ جو دریائے سندھ سے نکالی گئی ہے۔ 1786ء میں جب افغان بادشاہ تیمور شاہ نے کلہوڑہ حکمرانوں کی جگہ تالپور بلوچ امیروں کو سندھ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی تو اس نے دریائے سندھ کے تمام مقامات کی نسبت شکارپور کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہوئے ہندوؤں کو اس شہر

میں بلاخوف وخطر آباد ہونے اور تجارت کرنے کی دعوت دی۔ یہ لوگ عموماً لوہانہ اور بھاٹیہ ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ذاتیں سندھ اور جنوبی پنجاب میں عام ہیں۔

چونکہ یہاں پر کوئی صنعت نہیں ہے اور اگر ہیں بھی تو بہت کم ہیں اس لئے شکار پوریوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بنکاری امور پر صرف کی ہیں۔ اسی لئے نصف صدی کے عرصے میں یہاں والوں نے اپنا کاروبار ایشیا کے وسیع تر حصے پر پھیلایا۔ چین سے ترکی تک اور استراخان سے حیدرآباد دکن تک شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہو کہ جس میں کوئی شکار پوری یا اس کا گماشتہ موجود نہ ہو۔ اگر تم اپنا سفر شروع کرنا چاہو تو تمہیں چاہئے کہ شکار پوریوں کی ہنڈیاں حاصل کر لو جو کہ چھ ماہ کے سفر کے دوران فوراً ہی ہر جگہ پر کیش کروائی جا سکتی ہیں۔

وہ دستاویز کہ جس سے شکار پوری بنکار اپنا کام چلاتے ہیں وہ ہنڈی کہلاتی ہے۔ یہ ایک مختصر سی دستاویز ہوتی ہے جو مخصوص الفاظ میں تحریر کی جاتی ہے۔ اسے بنک کے نوٹ پیپر کے مربع یا چوتھائی حصے پر تحریر کیا جاتا ہے جو اس طرح سے ہوتی ہے:

''1/4-1 خدائے برتر ہی سچا ہے

1- قابل احترام کی خدمت میں، آپ سلامت رہیں، خوش رہیں، برادر من جیسومل۔

2- شکار پور سے، کشورداس کی تحریر: سلام قبول کیجئے۔

3- جناب، مزید عرض یہ ہے کہ میں آپ کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ کی ہنڈی تحریر کر رہا ہوں اور ہندسوں میں بھی 1000 روپے تحریر ہیں نصف جن کے پانچ سو روپے ہوتے ہیں اور اس کے دوگنے کرنے سے ایک ہزار روپیہ روپے ہو جاتے ہیں۔ مورخہ فلاں تاریخ فلاں ماہ کی بسال فلاں سن بکرمی۔ حامل ہنڈی کو اتنے دن کے اندر کابل میں مذکورہ رقم ادا کر دی جائے۔ رقم اسی جگہ کی کرنسی کی شکل میں ادا کی جائے۔

مورخہ سن بکرمی وغیرہ وغیرہ۔''

اس دستاویز پر کچھ خفیہ نشانات ہوتے ہیں کہ جو جعل سازی کی روک تھام کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان نشانات سے صرف تحریر کنندہ اور مرسل الیہ ہی واقف ہوتے ہیں۔ مسٹر بل (Bull) اب تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کاغذ کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا کتنا مفید ہوتا ہے۔ تم جس ملک میں سفر کر رہے ہو تو وہاں پر اس سے حاصل ہونے والی ایک اشرفی بھی ناگہانی موت کی صورت میں قیمتی ہوگی۔

شکار پور کے ہندوؤں میں یہ رواج ہے کہ گھر میں تجارتی امور سیکھنے کے بعد اور مالیاتی

تعلیم کے حصول کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے کسی کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں۔ جب پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے تو شوہر سفر کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اور بڑے جذباتی انداز میں اہل خانہ سے رخصت لینے کے بعد کسی دور دراز کے ملک کو روانہ ہو جاتا ہے۔ غالباً اس کی نیت ہی یہ ہوتی ہے کہ تقریباً نصف زندگی وہاں پر گزارے گا۔ جہاں کہیں بھی گاہک اس کو پکارے وہ پہنچ جاتا ہے خواہ اسے بدوعربوں یا بخارا کے جنونیوں یا ظالم ایرانیوں کے ہاں ہی کیوں نہ جانا پڑے یا پھر ان برفیلے پہاڑوں میں جہاں پر ہندوؤں کو مار ہی ڈالا جاتا ہے۔ اگر لکشمی دیوی کی مہربانی ساتھ رہے تو وہ مجبوری کی حالت میں بھی اچھا خاصا سیاسی اثر ورسوخ پیدا کر لیتا ہے۔ وہاں پر اس کے کپڑوں کے گودام یا پھر ہیرے جواہرات اور اس کی حساب کتاب کرنے کی صلاحیت اور دولت اس کو اس ملک کے بادشاہ یا گورنر کے ہاں اثر پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے اور اس کی ایمانداری اس وقت بہت کام آتی ہے جب اسے مالیہ جمع کرنے پر مقرر کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اس کی زندگی کے عمدہ ترین سال گزر جاتے ہیں۔ بعدازاں وہ گھر واپس جانے کا سوچتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے آبائی وطن میں کسی اچھے ہندو کی مانند اس کی بھی راکھ دبائی جائے۔ تاہم کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کا گھر جوں کا توں حالت میں ہوتا ہے۔ ورنہ اب تو یہ مشکل سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔

شکار پور میں عورت کی خوبصورتی کا بڑا چرچا ہے۔ عورتیں خوبصورتی کی مثال ہوتی ہیں۔ ان کے انداز بہت خوب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ بیابان اور پہاڑوں سے آئے ہوئے افراد کو جو یہاں پر اپنے گھوڑے کپڑے اور خشک میوے فروخت کرنے اس زیریں علاقے میں آجاتے ہیں وہ ان کے شیدائی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس شہر میں تمہیں ادھ ننگے اور مخبوط الحواس فقیر بھی نظر آئیں گے۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔ II، صفحات 276-270)

ہندو عورت

(1)

مردوں کے مقابلے میں ہندو عورتوں کے خدوخال زیادہ اچھے ہیں۔ اکثر عورتیں بہت جاذب النظر اور صحیح جسامت کی حامل ہیں۔ ان کی زلفیں بہت دلکش اور کندھے چوڑے چکلے ہیں۔ ان

کی کھال بڑی شفاف ہوتی ہے جو اکثر گلابی رنگت کی وجہ سے چمکتی نظر آتی ہے۔مگران کا حسن عارضی ہوتا ہے۔اگران کو وافر مقدار میں خوراک ملے اوران سے بہت زیادہ کام بھی نہ لیا جائے تو یہ سب کی سب ہی موٹی تازی ہو جائیں۔ہلکی پھلکی ورزش،کھلی فضا میں گزر بسر اور غیر مصنوعی زیبائش جس میں ایسا سفید نقاب بھی شامل ہے جو پورے سر کو ڈھانپے ہوتا ہے،ڈھیلی ڈھالی چولی جس سے سینے کو چھپایا جاتا ہے،لمبا اور چوڑا پیٹی کوٹ (Petticoat) اور بعض اوقات چپلوں کی ایک جوڑی۔بس یہی ان عورتوں کا لباس ہوتا ہے۔

ہندو عورتیں کم تعلیم یافتہ ہیں اور کم ہی ہنستی کھیلتی ہیں یعنی مسلمان عورتوں کی نسبت یہ برت (روزے) زیادہ رکھتی ہیں۔پانی کم پیتی ہیں اور عشوہ گری (جھوٹی محبت) سے بھی وابستہ ہیں۔یہ عورتیں کانوں میں دھات کے چھلے، ناک میں بھاری نتھ اس کے علاوہ کلائیوں، انگلیوں،ٹخنوں، ایڑیوں میں بھی زیور پہنتی ہیں، گلے میں ہار ہوتا ہے اور بازوؤں میں ہاتھی دانت کے چھلے بھرے ہوتے ہیں۔عزت کے تحفظ،سخت جسمانی محنت اور مردوں کے زیر نگرانی رہنے کی وجہ سے یہ عورتیں اچھی محنتی اور پُرخلوص بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔مشرقی عورت میں پائی جانے والی خاصیت یعنی اولاد کی محبت ان میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔کسی ہندو عورت کے لئے اس کا بچہ ہی سب کچھ ہے۔اس کی پیدائش سے ہی وہ دن رات اسے کبھی اپنے سے جدا نہیں کرسکتی۔اگر یہ عورت غریب ہے تو وہ اسے اپنے کولہے پر اٹھائے کام کرتی رہتی ہے اور اگر یہ عورت امیر ہے تو اسے اپنی آغوش میں لئے ساری زندگی گزار دیتی ہے۔اگر بچہ صحت مند ہے تو اس کا وقت آٹا گوندھنے میں اور اس کے ہاتھ پیر کو سیدھا کرنے (Straightening) میں گزرتا ہے، اور اگر بچہ بیمار ہے تو وہ اس کی خاطر برت (روزہ) رکھنا شروع کر دیتی ہے اور اس کی نگہداشت کرتی رہتی ہے۔وہ اس کے سر کی بلائیں اتارے بغیر کبھی اسے مخاطب بھی نہیں کرتی۔یہ محبت تو تب بھی ختم نہیں ہوتی جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور اب اس کی حیثیت کھلونے کی سی نہیں رہتی۔ساری زندگی اس کا رویہ بچے کی جانب ایسا ہی رہتا ہے۔اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مشرق میں کوئی لڑکا ماں کی محبت کے بغیر ہو، اور اس میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جب یہ مشرقی لوگ گالم گلوچ پر اُتر آتے ہیں تو سب سے پہلے ایک دوسرے کی ماں کو ہی گالی دیتے ہیں۔

مسٹر بل (Bull) یقین جانئے کہ اس معاملے میں تہذیب کا حال بربریت سے بالکل الٹ

ہے۔ ہمارے ہاں والدین دوسرے چکروں میں پڑ گئے ہیں مثلاً بچوں کی کم عمری میں ہی ان پر توجہ نہ دیتے ہوئے دولت یا مسرت کی خواہش کرنا، تربیت کے دنوں میں بچوں کو نرسری (بچے پالنے کے ادارے) میں ڈال دیا جاتا ہے یا پھر اسے اس حال میں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ساتھیوں میں گزارے۔ اس کے بعد جوانی آتی ہے تو اس میں اسے اسکول اور کالج میں جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ پھر پیشے سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد شادی ہو جاتی ہے یوں پھر سے ایک ''نوجوان خاندان'' بس جاتا ہے۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔I، صفحات 49-247)

بنیا

بنیوں کو تھوڑی ہی تعلیم ملتی ہے۔ چند ایک مذہبی عقائد اور رسومات وغیرہ سیکھنے کے بعد اسے کسی گرو یا اسکول ماسٹر کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ اسے حروف تہجی لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے اور اسے ان اندراجات کے چھپے ہوئے معانی سے آگاہ کرتا ہے جو اس کے باپ کی کتابوں میں درج ہوتے ہیں۔ اس میں صرف جمع، تفریق، تقسیم، ضرب وغیرہ بتائے جاتے ہیں۔ پھر اسے کاروبار کی رسمی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان نشانات سے زیادہ خشک چیز اور کوئی شے نہیں ہوتی جو اس حساب کتاب کو پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ یہ مختصر نویسی کا طریقہ ہوتا ہے جس میں صرف ابتدائی حروف علت ہی استعمال ہوتے ہیں اور ہر حرف میں درجن بھر مختلف حروف صحیح مخفی ہوتے ہیں۔ اس طرح سے اس کی تعلیم مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ دوکان پر آ جاتا ہے جہاں پر (اگر آپ اجازت دیں تو) ہم اسے دھوکہ دہی اور لین دین کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ وہاں پر وہ ظلم و زیادتی کرتا ہے اور پھر وہ تجارتی امور میں بڑی روانی کے ساتھ کمالات دکھاتا ہوا امیر بن جاتا ہے۔

مسلم حکمرانوں کی نااہلی اور جہالت کی وجہ سے عاملوں یا حکومتی افسران کا ایک طبقہ وجود میں آیا ہے جو بہت زیادہ مئوثر ہے اور یہی طبقہ سندھ میں ہندوؤں کا سب سے زیادہ قابل احترام طبقہ ہے۔ وہ لوگ اپنی پوشاک کی وجہ سے اپنے ہم مذہبوں سے ممتاز کئے جا سکتے ہیں۔ درباری آداب کے تحت انہیں داڑھیاں منڈوانے پر بُرا بھلا نہیں کہا جاتا۔ نیز انہیں پگڑیاں پہننے کی بھی اجازت ہے۔ اب وہ ماتھے پر تلک نہیں لگاتے اور نہ ہی وہ مونچھیں رکھتے ہیں، آج کے دور میں گو پرانے رواجات ختم ہو گئے ہیں مگر پھر بھی وہ سندھی ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ ریشم کے کوٹ کے نیچے قمیض پہنتے ہیں ان کی رنگت

قدرے صاف ہے اور اجسام بہتر ہیں۔ دیکھنے میں اچھی نسل کے معلوم پڑتے ہیں اور اپنے بھائیوں کی نسبت گوشت کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ مٹھائیاں اور مکھن بھی استعمال کرتے ہیں، مگر زیادہ اچھے کپڑے نہیں پہنتے۔

کسی عامل کی ادبی استعداد زیادہ وسیع نہیں ہوتی۔ لڑکپن میں ہی اسے کسی مسلمان اخوند یا مُلّا کے پاس بھیج دیا جاتا ہے جو اسے سندھ اور ہند کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات میں رائج فارسی زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا سکھاتا ہے۔ فارسی بولنے میں اس کا تلفظ بالکل ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کوئی برطانوی باشندہ فرانسیسی زبان سیکھنے کے بعد اسے انگریزی لہجے میں بولتا ہے۔ وہ اسم اور فعل میں فرق کئے بغیر ہی زبان کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے وہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ الفاظ میں تمیز نہیں کرتا۔ اسی طرح سے بیہودہ الفاظ بھی بول ڈالتا ہے۔ بعض اوقات وہ سندھی محاورے بھی استعمال کرتا ہے۔ وہ فارسی زبان کی خوبصورتی سے بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ یوں مخصوص الفاظ کا اپنی مادری زبان میں لفظی ترجمہ کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے اس کی گفتگو میں روانی نہیں ہوتی۔

الفاظ اور جملوں کا وافر ذخیرہ حاصل کرنے کے بعد ایک عامل درخواستوں، خطابات اور خط و کتابت کا علم حاصل کرتا ہے اور کتب کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ چیز ہمارے ہاں ''Complete Letter Writers'' کے عنوان سے پڑھائی جاتی ہے۔ وہ مختلف ہدایات کو، ابتدائیہ و اختتامی الفاظ و جملوں کو زبانی یاد کرتا ہے۔ جیسے جناب مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ''اور معززین میرا اعزاز ہے کہ اسی طرح سے اسے اعلیٰ درجہ کے مالک اور ادنیٰ درجہ کے مالک کے لئے الفاظ کے استعمال کا بھی پتہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کسی شاعر یا کسی عاشق کی اتباع کرتا ہے تاکہ اپنی آزاد خیالی پر مبنی تعلیم کا ثبوت پیش کر سکے۔ اس کی تعلیم چند ریاضیاتی اصولوں کو سیکھ لینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔''

اس کے بعد کسی دوست یا رشتہ دار کی مدد سے ہمارا عامل کسی دفتر یا حکومتی آفس میں کلرکوں کے طبقے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے وہ ''زندگی'' میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ پیچیدہ معاملات سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اپنے سے زیادہ تجربہ کار دفتریوں سے بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اپنے مالک کے سامنے کوئی کاغذ پڑھنے کا طریقہ سیکھتا ہے اور اس میں الفاظ و جملوں کے اس ہیر پھیر کے علم سے واقف ہو جاتا ہے کہ جس سے وہ اپنے مالک کو خط کا اصل مطلب سمجھا

سکتا ہے۔اس کے بعد وہ کسی سیکرٹری کے طور پر تحریر کے مقصد کو سمجھانے پر عبور حاصل کرتا ہے۔ وہ خوش نویسی میں مہارت حاصل کرتا ہے اور دستاویزات کی نقل کرنا سیکھ جاتا ہے۔ وہ بڑی محنت سے یہ سارا عمل سیکھتا ہے۔ اس کی ساری تعلیم تب مکمل ہوتی ہے جب وہ محفوظ ترین راہ سے رشوت حاصل کرنے اور اسے حلال کر سکنے کا علم بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ ایک منشی بن چکا ہے اور اپنے مالک کو ہر اس موقع پر دھوکا دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ جس موقع پر اسے کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہو۔ ایسا ہی وہ حکومت کے ساتھ بھی کرتا ہے۔

سندھی منشی کی مادری زبان ہوتی ہے مگر چونکہ اس نے کبھی اس زبان میں کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا لہٰذا زبانی بول چال کے علاوہ وہ اس زبان سے لاعلم رہتا ہے۔ اس کا ذاتی مطالعہ مذہبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اگر اس کا تعلق گرونانک کے عقیدے سے ہو تو پھر وہ سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ کے کچھ مخصوص حصوں کو پڑھ اور لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک پوتھی (عبادت کی کتاب) تیار کر کے رکھتا ہے مگر اس سے گرمکھی زبان کا رسم الخط نہیں سیکھا جا سکتا۔ وہ اپنے کسی دوست کی کتاب سے یہ پیرے نقل کرتا ہے جو خدا کی تعریف میں، صوفیوں کی تعریف میں، دریا کے بیان میں، آسمانی جدول کے ضمن میں، قسمت کی بابت اور خوش و نحس ایام کے کلیوں کے بارے میں نیز جادوگروں اور ادویات کے بارے میں ہوتے ہیں۔ یہ سب نستعلیق یا عام فارسی رسم الخط میں ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کی عمومی روایات کے برعکس عامل کافی عمر میں جا کر شادی کرتے ہیں جو غالباً ان کی رسومات کے اخراجات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چند تو کنوارے ہی رہتے ہیں اور کنوارے مر جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حد سے زیادہ غیر اخلاقی کارروائیوں میں ملوث ہوتے ہیں جیسے جوابازی یا شراب نوشی۔ دوسرے عقیدے کے لوگوں کے ساتھ میل جول اور اپنوں سے دوری کی وجہ سے ان میں سے کئی تو دہریئے یا مادیت پرست بن جاتے ہیں اور خدا، کائنات، الہام کی طرح طرح سے تشریحات کرتے ہیں بعض تو ملحد بھی ہیں مگر وہ کبھی کبھار ہی اپنے راز کسی اجنبی کو بتاتے ہیں۔ یہ سارے ہی آزاد خیال لوگ بڑی خطرناک چیزیں ہیں، تہذیب یافتہ مغرب کے مقابلے میں تنگ نظر مشرق میں دین سے پھر جانے کے ذریعہ مقامی مذاہب کی تردید کرنا بہت کم ہے۔ یورپی لوگ ان بے عقیدہ لوگوں کو کبھی کبھار ہی اپنے مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔ I، صفحات 265-258)

برہمن

سندھ میں برہمن اپنے سر منڈواتے ہیں مگر ایک چوٹیا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ لوگ داڑھی تو منڈوا لیتے ہیں مگر مسلمانوں سے الگ شناخت قائم کرنے کی غرض سے مونچھیں باقی رہنے دیتے ہیں۔ برہمن اپنے ماتھے پر بڑا نمایاں نشان بناتا ہے۔اس کا لباس عام ساہوکار یا تاجر کی طرح کا ہوتا ہے یعنی ایک سفید یا سرخ عمامہ، سوتی کپڑا اور دھوتی۔ جو کبھی کبھار ہی رنگین ہوتی ہے۔ کمر کے گرد زنار باندھتا ہے۔ کندھوں پر شال یا چادر ڈال لیا کرتا ہے اور چمڑے کے علاوہ کسی بھی شے کی بنی ہوئی چپلیں استعمال کرتا ہے۔اس کے ہاتھ میں صندل کی لکڑی سے تیار کردہ ستائیس دانوں والی مالا ہوتی ہے۔اس کو بڑے مخصوص انداز سے بولنے کی عادت پڑ گئی ہوتی ہے۔ چند ایک سرست برہمن (Sarsat Brahman) عاملوں یا افسران مالیہ کے لباس سے مشابہ کپڑے پہنتے ہیں مگر اکثر کلرکوں والے کپڑے پہننے سے گریز کرتے ہیں۔

اس ملک میں بنیوں یا تاجر برادری میں سے وانی(Wani) طبقے کی تقسیم پانچ بڑے گھرانوں میں ہوجاتی ہے، یہ لوہانہ، بھاٹیہ، سہتہ، ویشیہ اور پنجابی ہیں۔ ہندومت کے مطابق ہر گھرانے میں بھی آگے جا کر بہت سی شاخیں بن جاتی ہیں ان میں سے ہر ایک نے اپنی جائے قیام کے حوالے سے اپنے لئے مخصوص نام اختیار کیا ہوتا ہے یا پھر وہ اپنے لباس اور وضع قطع کے حوالے سے کوئی نام اختیار کر لیتے ہیں، یہ لوگ ایک دوسرے سے حسد بھی رکھتے ہیں۔

پیشوں کے حساب سے تقسیم کی جائے تو سندھی بنیوں کی دو قسمیں ہیں۔ان کا گروہ کثیر چونکہ جاہل ہوتا ہے لہٰذا وہ تجارت سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ جبکہ قلیل گروہ حکومتی افسر مقرر ہوتے ہیں اور عامل کا لقب اختیار کر لیتے ہیں۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔I، صفحات 37-236)

سادات

(1)

جو چیزیں اس ظلم کو جاری رکھتی ہیں ان میں سادات کا مافوق الفطرت احترام بھی شامل ہے جس کی کوئی حدود نہیں۔ یہ سادات نبی کریمؐ کی نسل سے خیال کئے جاتے ہیں۔ سندھ میں برہمنوں سے

ہندو اتنا متاثر نہیں ہوتے جتنا کہ سیّد ذات کے لوگ سب کو کرتے ہیں۔ جو شخص خود کو کسی مقدس نسل سے ظاہر کرے وہ اس علاقے میں سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ جو لوگ بھی میرے پاس دوا لینے آتے تھے وہ سب ہی ایک سیّد کے احترام میں جگہ چھوڑ دیتے۔ میں نے دیکھا کہ امیروں کے ہاں جن لوگوں کو کوئی استحقاق حاصل ہے وہ صرف اسی نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ سادات کی شان میں گستاخی کرنے یا اس سے بدتمیزی کرنے کی کسی شخص میں ہمت نہیں ہوتی کیونکہ ایسا کرنے والے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ جو مرتبہ اور عزت انہیں یہاں پر حاصل ہے اس کی وجہ سے تمام پڑوسی ممالک سے یہ لوگ سندھ میں آ کر جمع ہو گئے ہیں۔ سندھ میں یہ سب سے سست اور کاہل طبقہ ہے اور سب سے زیادہ گستاخ ہے اسی لئے لوگوں کے ذہن پر اس طبقے نے بہت بُرے اثرات مرتب کئے ہیں نیز مظلوم عوام کی جیبیں بھی جھاڑ لیتے ہیں۔ فقیر یا مذہبی راہنما تو حیدرآباد کی عوامی شاہراہوں پر نظر آئیں گے۔ یہ لوگ روحانی طاقتوں کا دعویٰ کر کے اپنے مطالبات تسلیم کرواتے ہیں۔ یہی لوگ عوام کی اخلاقی تذلیل کا ذریعہ بھی بن گئے ہیں۔ (جے۔ برنس، صفحات 87-86)

(2)

عوام میں سب سے زیادہ اہم حیثیت پیروں، سیّدوں اور دیگر مذہبی دعویداروں کو حاصل ہے جو سندھ میں بھرے پڑے ہیں۔ امیروں سے لے کر عام مسلمانوں تک سب ہی چونکہ رسمی دینیات کے علاوہ ہر قسم کی مذہبی تعلیم سے ناواقف ہیں لہٰذا وہ مقدس نسلوں پر بڑا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کاہل سادات اور دیگر مذہبی دعویداروں نے سندھ میں وہ حیثیت بنا لی ہے جس کا کہیں اور نام و نشان تک نہیں ہے۔ وہ راہب طرز کے آدمی ہیں۔ ان کے کردار کے حوالے سے پچھلے مصنّفین میں سے کسی نے تحریر کیا ہے کہ: ''سندھی لوگ کسی قسم کی آزاد خیالی کے قائل نہیں ہیں۔ ہاں البتہ سیّدوں کو کھلانے میں وہ بڑے آزاد ہیں۔ وہ عقیدے کی تبلیغ کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے۔ عید منانے کے علاوہ کہیں جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں ہوتا، اور پرانے مقبرے سجانے کے علاوہ ان کا کوئی ذوق ہے ہی نہیں۔'' ان لوگوں نے ملک کے بعض بہترین علاقوں پر انعام یا تحفہ کی شکل میں قبضہ کر رکھا ہے۔ ہر بلوچی سردار اور قبیلے کا اپنا ایک پیر مرشد یا مذہبی راہنما ہوتا ہے۔ جو مذہبی امور کے نام پر ایک خاص فیس وصول کرتا ہے۔ خراسان، کابل، پشین، وسطی ایشیا، ایران اور پھر ہندوستان کے

تمام تر علاقوں میں یہ خون چوسنے والے اپنا حصہ وصول کر لیتے ہیں اور سب سے زیادہ سہولت ان کو سندھ میں حاصل ہے۔ ان میں سے بہت سے تو حد سے زیادہ امیر ہو گئے ہیں اور بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو تو امیروں کے حرم میں داخل ہونے کا بھی حق حاصل ہے۔ حالانکہ اس حق کا مطالبہ تو ہمیشہ سردار بھی نہیں کرتے۔ اس وقت پورے ملک میں گماشتہ فقیروں کی بھرمار ہے۔ یہ لوگ کسانوں کے مویشیوں میں سے اپنی خوراک کے لئے حصہ بھی نکال لیتے ہیں۔ کسان ان کو روک نہیں سکتے۔ اس ملک میں صرف ان مذہبی شخصیات کے مقابر ہی قابل دید جگہ ہیں۔ دیگر مقابر کے برعکس ان کے مقبرے مضبوط اور مستقل نوعیت کے سامان سے تیار کئے گئے ہیں۔ پھر یہ سچے ایمان والوں کے لئے زیارت گاہیں بن جاتی ہیں۔ ملتان کے بارے میں کہے گئے فارسی مقولے کا سندھ پر بھی پورا پورا اطلاق ہو سکتا ہے!''سندھ کی پہچان چار چیزوں سے ہو جاتی ہے یعنی گرما، گرد، گدا گر اور گورستان۔'' (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 52-50)

بلوچی

(1)

اپنی جسامت کے حوالے سے بلوچی عموماً دراز قد اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کا رنگ کالا اور اس کی ناک قابل غور حد تک طوطے کی سی ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور تیکھی نوعیت کی ہیں اور عربوں کی طرح سے چھوٹی چھوٹی، تیز اور شعلہ فشاں نہیں ہوتیں۔ گو کہ ان کی آنکھوں سے اکثر بدنیتی ٹپکتی ہے مگر ہوتی بڑی خوبصورت ہیں۔ ان کے بال لمبے ہوتے ہیں جو ان کی کمر اور کندھوں پر پڑے رہتے ہیں۔ سر کے گرد عمامہ باندھا ہوتا ہے۔ بعض اوقات زلفیں خم دار ہوتی ہیں۔ لباس موٹے سفید کپڑے کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات پورا بھی ہوتا ہے۔ رنگ کا معاملہ رائج الوقت فیشن پر منحصر ہے۔ بلوچوں کی عام مسلمانوں، ہندوؤں، ایرانیوں، افغانیوں یا پھر عربوں سے کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ ان کی کمر پتلی اور جسم سخت اور ٹھوس ہوتا ہے۔ جس پر یہ واسکٹ پہنتے ہیں جیسے کہ قدیم دور کے یہودی پہنا کرتے تھے۔ تاہم بلوچیوں میں سوتی کپڑا یا اونی کپڑا پہننے کی مقدس یہودی روایت موجود نہ ہے ہاں البتہ وہ اکثر اوقات سردیوں میں بکری کے بالوں پر غلاف سا ضرور لگا دیتے ہیں۔ یہ چیز انہوں نے غالباً اپنے اردگرد کے قبائل سے سیکھی ہے۔ ان کی زندگی کی

حالیہ عادات کے ضمن میں موجودہ لباس سے زیادہ غیر موزوں لباس اور کوئی نہ ہے۔ نہ ہی بلوچیوں کے لئے اس ملک سے زیادہ گرم اور گرد آلود ملک دوسرا کوئی ہے۔ عربوں کے فیشن کی پیروی میں وہ اپنے لباس پر اسلحہ، پیٹیاں اور سفوف کی بوتلیں بھی باندھتے ہیں جن کے ساتھ تلواریں، ڈھال اور توڑے دار بندوقیں بھی ہوتی ہیں۔(ٹی۔ پوسٹن، صفحات55-54)

(2)

بلوچی قبیلہ سندھ کا سابق حکمران قبیلہ ہے اور بلاشبہ یہی ملک کا سب سے زیادہ طاقتور اور جنگجو قبیلہ بھی ہے۔ اسی وجہ سے بہت بارعب نظر آتا ہے۔ سندھ کی اکثر زمین پر بطور جاگیردار قابض ہے۔ ان لوگوں میں اپنے اجداد کی موروثی اچھی عادتیں موجود ہیں۔ انہیں جاہل، سست اور کاہل نسل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بڑے لڑکے بھی کسی حد تک اپنے باپ کی طرح سے ہیں۔ اسی طرح ان میں اطوار مہربانی بھی ہیں اور رشتہ داروں سے شفقت کا جذبہ بھی موجود ہے۔ بلوچی جاگیردار اور زمیندار ہیں۔ وہ خود کو جنگجو نسل خیال کرتے ہیں اور کاشتکاری کو بڑی توہین آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ بزرگوں کے بڑے پابند ہیں۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کی اتباع کرتا ہے۔ سردار کو اپنے قبیلے میں وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو کسی باپ کو خاندان میں ہوتا ہے۔ اس کی رائے قانون کا درجہ رکھتی ہے اور سب لوگ اس سے صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ تمام قبائل، خانوادوں اور ذاتوں کے سربراہ اپنے اراکین پر بہت زبردست اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ اگر باپ موجود نہ ہو تو قریب ترین رشتہ دار کسی لڑکی کی شادی کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

ان لوگوں کے ہاں عیش وعشرت اور آرام کا تصور بھی نہیں ہے۔ ان کے ٹانڈے یا دیہات چند سائبانوں کا جمگھٹا ہوتے ہیں۔ بلوچی عورتیں غیر مہذب اور مظلوم ہوتی ہیں۔ وہ مردوں کی غلام بن کر رہتی ہیں۔ ان کے مرد اپنا زیادہ وقت تمباکو نوشی میں، شراب نوشی میں یا پھر سونے میں گزارتے ہیں۔ گرمیوں میں بلوچ بنیان پہنتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے ہیں۔ سردیوں میں کابلی کپڑے کا بنا ہوا گرم چوغہ یا پھر پوستین اور قمیض بھی پہنتے ہیں جو اسی ملک سے آتا ہے۔ پورے خیر پور میں یہی چیزیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کمر پر پٹی بھی باندھتے ہیں۔ سر کے بال کبھی بھی نہیں بناتے۔ البتہ جس بال پر وہ ہمیشہ فخر کرتے ہیں وہ ان کے

سر پر موجود ایک چوٹی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ان کی قومی ٹوپی، عماموں کی نسبت کم تر درجے کی حامل ہوتی ہے۔

بلوچی عورتیں پورا پیٹی کوٹ پہنتی ہیں جو ان کی کمر کے گرد آ جاتا ہے۔ وہ پاجامے اور اس کے ساتھ ایسی قمیض پہنتی ہیں جو گلے اور بازوؤں پر سے تنگ ہوتی ہے، اور ان کے سینے پر پوری آ جاتی ہے۔ ساتھ ہی دوپٹہ بھی استعمال کیا جاتا ہے جو سر پر اوڑھا جاتا ہے۔ یہ لوگ بہت ہی گندے ہیں۔ یہ زیادہ تر نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں جو ان کی گندگی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

کچھ (Kutch) کے راجپوتوں کی طرح سے بلوچوں کے ہاں بھی شاعر اور گانے والے ہوتے ہیں جو ان کے گذرے ہوئے وقت کے کارنامے گا کر سنایا کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنی روزی سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ یہ روزی وہ انہی لوگوں سے حاصل کرتے ہیں جن کی بڑے اچھے انداز میں تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ باشعور امیر، میر علی مراد بھی گھنٹوں بیٹھا وہ تعریفی گیت سنتا رہتا تھا کہ جس میں اسے ایسا عظیم ترین جنگجو شہنشاہ دکھایا جاتا تھا کہ جس نے سکندر اعظم اور عہد قدیم کے تمام شناسا بہادروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ لوری (Luri) ایک ایسا قبیلہ ہے جو شاعروں اور گانے والوں کے پیشے سے وابستہ ہے۔ مجھے ان میں ایک ایسا شخص بھی یاد ہے کہ جو سو سال سے بھی زیادہ عمر کا تھا اور امیروں کے اجداد کی ملازمت میں لڑکپن سے رہا تھا۔ ان ہی میں ایک اور بھی تھا جو اس سے کچھ سال بڑا بھی تھا اور جب میں خیر پور میں تھا تو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا نام جدا رنگ (Juddarung) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وفات پر اس کے بوڑھے گھوڑے نے بھی غم وافسوس کیا۔ اس نے گھاس اور پانی تک چھوڑ دیا اور تین روز تک کچھ نہ کھا پایا۔ اس نے اپنے مالک کی قبر پر جانے کے لئے اپنے سر کی رَسّی کو بھی توڑ ڈالا۔ وہ قبر پر کھڑا سوگنگتا رہا اور بڑی مشکل سے اسے واپس لایا گیا۔ یہ قصہ خیر پور کے تمام طبقات میں مشہور و معروف ہے۔ (ای۔ اے۔ لانگلے۔ II، صفحات 66-63)

نیگرو (Negroes)

(1)

مسقط اور عرب کے دیگر علاقوں سے بڑی تعداد میں زنجباری اور حبشی لوگ سندھ میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان کی موجودہ نسلوں کی پہچان اپنی حربی صلاحیت، چوٹے پن اور شراب نوشی

سے ہو جاتی ہے۔ یہ غلام کسی خاندان کے گھریلو فرد تصور کئے جاتے ہیں، اوران کی گزر بسر اتنے آرام سے ہوتی ہے کہ کسی بھی قسم کی آزادی ان کے لئے فائدہ مند نہیں بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بعض معاملات میں انہیں بڑے بڑے امتیازات حاصل ہو جاتے ہیں۔ امیروں یا شہزادوں کے رازدار غلام اپنے سے کم تر غلاموں پر حکم بھی چلاتے ہیں۔ میر شاہنواز کے پاس اسی طرح کا ایک رازدار غلام تھا۔ جس کے بارے میں خیال ہے کہ اس نے اپنے مالک کو ذرا سا بھی دھوکا نہیں دیا۔ (ای۔اے۔لانگلے۔II،صفحات 42-41)

(2)

سندھ میں جو افریقی ہیں وہ تو بالکل جاہل اوراَن پڑھ ہیں۔ وہ بہت جذباتی، خوش، دلکش ہیں۔ مقامی باشندے کہتے ہیں وہ لوگ اونٹوں کی طرح انتقام سے بھرپور ہوتے ہیں۔ مگر کوئی بہت ہی زیادہ پُرتشدد سزا ان کو غصہ دلاتی ہے۔ وہ بہت بہادر ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ دشمنوں کے مقابلے میں بہت سخت بھی ہیں، وہ اتنے وحشی ہیں کہ صرف موت کے خوف کی وجہ سے ہی وہ ڈاکے نہیں ڈالتے اور نہ ہی قتل کرتے ہیں۔

ان کا یہ کردار وسطی ایشیا میں ان کے ہم نسل لوگوں سے بہت ملتا جلتا ہے اور وہاں پر بھی یہ لوگ مختلف خاندانوں کے گھریلو رکن بن گئے ہیں۔ ان کی خوبیاں کافی مشہور و معروف ہیں۔ ایک لمحے میں یہ لوگ بہت مہربان اور شفیق ہوتے ہیں۔ جب ان کا مزاج اچھا ہو تو بہت فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ جنسی مسرتوں کے لئے ان کا شوق وذوق قابل ذکر ہے، اور وہ لوگ محبت کے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ کسی بھی طریقے سے جان بوجھ کر خودکشی کر لینا ان کے درمیان کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ انہیں کھانے، پینے، موسیقی اور رقص کا بہت شوق ہے۔ مئوخرالذکر دونوں اعمال وہ عموماً اکٹھے سرانجام دیتے ہیں۔ عموماً ان میں مرد اور عورت یا تو اکٹھے ہی رہتے ہیں یا پھر بالکل الگ تھلگ رکھے جاتے ہیں۔ شروع میں ان کا رقص اتنا اچھا نہیں ہوتا ہے۔ عورتیں آگے آتی ہیں اور پھر پیچھے کو چلی جاتی ہیں۔ مرد تب تک بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں جب تک کہ ان کی باری نہ آ جائے، اور جب ان کی باری آ جائے تو وہ مجمع کو اپنی اُچھل کود اور ہاتھ پیروں کی عجیب وغریب حرکتوں سے حیران کر دیتے ہیں۔ آخر میں ڈھول کی تھاپ سے متاثر ہوتے ہوئے اور اپنی عورتوں کے ہم آواز ہو کر نغمہ گانے سے نیز

ان کی چیخ و پکار سے یہ غلام گویا بالکل دیوانے ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان کو اتنا طویل اور اتنا جارحانہ رقص کرتے دیکھا ہے کہ کئی رقاص تو بالکل اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ کراچی کے قریب ایک زیارت گاہ مگر پیر (Mager-Pir) میں ان کے رقص بڑے زبردست اور قابل رحم ہوتے ہیں۔ وہاں یہ لوگ ایک املی کے درخت یا کسی دیگر درخت کے نیچے رقص کرتے ہیں۔ ابتدائی طور پر اس درخت کو چڑھاوا پیش کیا جاتا ہے۔ کنیزیں زیادہ پُرکشش نہیں ہوتیں، اور ہزاروں لاکھوں میں سے جا کر ایک چہرہ قابل غور نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے اکثر جسم فروشی کے ذریعہ گزر اوقات کرتی تھیں اور بعض تو اب بھی کرتی ہیں۔

سندھ کے اکثر افریقی غلام اپنی آبائی زبان سے ناواقف ہیں۔ چونکہ انہیں سے اکثر اسی ملک میں پیدا ہوئے ہیں لہٰذا انہیں اپنے والدین سے چند ایک الفاظ ہی سیکھنے کو ملے ہیں، اور وہ لوگ کہ جنہیں لڑکپن میں ہی یہاں پر لایا گیا ان کے لئے اپنی مادری زبان کو بھلائے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے درمیان کبھی کبھار ہی کوئی لفظ استعمال ہوتا معلوم ہوتا ہے اور کسی تحریر میں تو کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی زبان کا کوئی معیار نہیں ہے۔ پھر بھی وہ ایسی زبان میں ایک دوسرے کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر لیتے ہیں کہ جو اس ملک کے مقامی باشندے سمجھ نہیں سکتے۔ وہ چیزوں کے نام اپنی زبان میں لیتے ہیں مگر جن کے نام بھول گئے ہیں ان کے لئے سندھی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اردگرد موجود گروہ کثیر کے لئے وہ ایک خاص لفظ کٹمبہ(Kuttumba) استعمال کرتے ہیں۔ (آر۔ برٹن۔ ریسنر، 57-255)

غلامی

سندھ میں ابھی تک غلام موجود ہیں۔ زنجبار (Zangibar) کے باشندے جب خوب جوان ہو جاتے ہیں تو ان کو یہاں پر درآمد کیا جاتا ہے اور امیر طبقوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ مشرق کے تمام ممالک کی طرح سے سندھ میں بھی غلامی کی اصطلاح کو ظلم اور جبری قید کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا، غلاموں کے ساتھ کافی اچھا سلوک ہوتا ہے اور بعض غلام تو کسی خاندان میں کافی صاحبِ اثر ورسوخ بن جاتے ہیں۔ اگر والدین غلام ہوں اور ان کی غلامی کے دوران ہی ان کے ہاں اولاد ہو تو وہ اولاد بھی مالک کی ملکیت شمار ہوتی ہے۔ وہ لوگ اپنی جائے پیدائش سے یہاں تک وابستہ

ہو جاتے ہیں کہ آزادی بمشکل ہی ان کی خواہش بن سکتی ہے۔ دریائے سندھ کے زیریں وادی میں بعض دیہات ایسے ہیں کہ جہاں افریقی باشندے کثیر تعداد میں آباد ہیں۔

اس طبقے کے بعض لوگوں کو امیروں کا زبردست اعتماد اور ذاتی رازداری حاصل ہے۔ امیروں نے اپنے اراکین خاندان کی جگہ ان لوگوں پر اعتماد کیا ہے۔ امیروں کے ذاتی خادمین میں سے اکثریت سدیوں (Sidis) کی ہے۔ اس ملک میں افریقیوں کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ سندھ اور تمام شمال مغربی ممالک میں غلامی کا رواج عام ہے۔ جب لڑکیاں بھرپور شباب پر آ جائیں تو باپ ان کو فروخت کر دیتا ہے اور وہ امیر لوگوں کی بیویاں بن جاتی ہیں۔ یا پھر انہیں زنان خانوں میں خدمت کے لئے رکھ لیا جاتا ہے۔ گو کہ اس معاملے میں پورے سندھ میں افغان لوگ زیادہ مشہور ہے مگر مجموعی طور پر یہ کاروبار کافی محدود ہے۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحہ 75-73)

رواداری

سندھ میں مسلم حکومتوں میں رواداری بہت غیر معمولی نوعیت کی ہے۔ مسلمان اور برہمن مساوی طور پر اپنے امیر کے اعتماد سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور سب کو مذہبی آزادی ہے۔ امیروں کا تعلق شیعہ فرقے سے ہے لیکن ان کے عوام کی اکثریت سُنّی مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔

اس ملک میں فوجی طاقت زیادہ تر مسلمان باشندوں پر مشتمل ہے۔ جنگ کی صورت میں انہیں فوجیوں اور کاریگروں کے طور پر رکھا جاتا ہے اور امن کے دنوں میں کم تر درجہ کے ملازم کے طور پر ان سے کام لیا جاتا ہے۔ جبکہ ملکی اور غیر ملکی تجارت مکمل طور پر ہندو طبقہ آبادی کے ہاتھ میں ہے۔ (ایچ۔ ایلس، صفحات 7-6)

عادات

ضرورت کے بغیر سندھی حرکت نہیں کرتا۔ وہ لوگ سارا دن بیٹھے رہتے ہیں اور ساری رات تمبا کو نوشی اور باتوں میں گزار دیتے ہیں۔ تقریباً تمام لوگ ہی کسی نہ کسی نشے کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ بھنگ چونکہ سب سے زیادہ سستی ہے اس لئے وہ عام ہے۔ سندھی گانوں کے بہت شوقین ہیں ان کے ہاں اچھے ساز بھی ہیں اور اچھے گویے بھی ہیں۔ البتہ ان کے ساز و آلات اب اپنی قدر و قیمت کھو چکے

ہیں۔ وہ نشانہ بازی اور تلوار بازی میں بہت ماہر ہیں۔تلوار بازی کا استعمال وہ اپنی قوت بازو ثابت کرنے کے لئے بھی کرتے ہیں اور اپنی لچک ومہارت دکھانے کے لئے بھی۔ وہ لوگ اپنے خنجروں سے بہت اچھے نشانے لگا لیتے ہیں، اور اچھی تیر بازی بھی کر لیتے ہیں۔ یہ چیزیں وہ کھیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔تمام امیر اور شہزادے، بندوقوں اور تیر کمانوں میں بہت زیادہ ماہر ہیں۔ گھڑسواری اور تلوار بازی میں عام سندھیوں کو بالکل مہارت نہ ہے اور نہ ہی وہ اس طرح کی مشقیں کرتے ہیں۔(این۔کرو،صفحہ 34)

آداب

سندھ میں مقامی باشندوں کا آپس میں سلام کرنے کا طریقہ مخصوص ہے،اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بہت سادہ اطوار کے لوگ ہیں۔سب سے پہلے فریقین ایک دوسرے کی صحت کے بارے میں پوچھتے ہیں پھر ایک دوسرے کے خاندان کا حال پوچھا جاتا ہے۔اس کے بعد مکان اور جائیداد کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔اول الذکر بات یعنی صحت کے بارے میں کوئی سادہ سا سوال نہیں کیا جاتا بلکہ بار بار پوچھا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے کافی حیرت ہوتی ہے۔میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں کہ:"کیا حال ہے؟ بالکل ٹھیک ہے؟ اچھا ہے؟ بالکل اچھا ہے؟ خوش ہو؟ بہت خوش ہو؟ تمہیں یقین ہے کہ تم بالکل ٹھیک ہو؟ ان سب باتوں کا اطمینان بخش جواب دیا جاتا ہے۔دونوں ہی ایک دوسرے سے اس طرح سے پوچھتے رہتے ہیں اور یوں سلام دعا میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ جب آدمی کسی مجمع میں جاتا ہے تو وہ سب سے باری باری ملتا ہے۔سب سے پہلے وہ شخص آگے بڑھ کر ملتا ہے کہ جو رتبہ میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔"

کوئی سندھی جب سڑک پر گزر رہا ہو یا دریا میں سفر کر رہا ہو تو وہ کسی اجنبی سے ہرگز اس طرح سے حال احوال کئے بغیر نہیں رہتا۔وہ اس میں بہت دلچسپی کا اظہار کرتا ہے،اور اس سے احوال پوچھتا ہے۔ یہ رواج قابل ذکر ہے۔کیونکہ مشرقی ممالک میں سندھ وہ واحد علاقہ ہے کہ جس میں اس طرح سے سلام ودعا کر کے کسی شخص کے خاندان کے بارے میں معلومات لی جاتی ہے۔(ٹی۔پوسٹن،صفحات 75-74)

اطوار

سندھ میں اگر کسی کو یہ جواب دے دیا جائے کہ" گھر پر نہیں ہے"، تو اس میں بہت توہین محسوس کی

جاتی ہے اور اگر اسے واجب احترام وعزت نہ ملے تو پھر وہ اس گھر میں کبھی داخل نہیں ہوتا۔ ملاقات کا طریقہ یوں ہوتا ہے کہ کسی کے گھر پہنچ کر آمد کی اطلاع دی جاتی ہے اور گھر کا مالک باہر آ کر مہمان سے ملتا ہے۔ اس طرح سے مہمان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر آنے والا اعلیٰ مرتبہ کا حامل ہو تو کمرے میں موجود تمام افراد اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے رتبہ کا اندازہ لوگوں سے ملنے سے لگایا جاتا ہے۔ سلام ودعا بڑی طویل اور تھکا دینے والی ہوتی ہے جو عموماً فارسی میں یا بعض اوقات کسی اور مقامی زبان میں کی جاتی ہے۔ اس کے بعد میزبان، مہمان کو اس نشست تک لے جاتا ہے جو اس کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ اُس جگہ پر خاص گدا بچھا ہوتا ہے جس پر غلاف یا توشہ (Toshah) چڑھا ہوتا ہے۔ اس کی درجہ بندی یوں ہوتی ہے کہ سب سے پہلے ایک چھوٹا گدا جس پر غلاف چڑھا بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات نہیں بھی چڑھا ہوتا۔ دوسرے نمبر پر ایک قالین جو فرش پر بچھا ہوتا ہے۔ تیسرے نمبر پر ایک پاندان یہ بھی فرش پر رکھا ہوتا ہے چوتھے نمبر پر ننگا فرش پانچویں نمبر پر کمرے سے باہر برآمدے کا حصہ ہوتا ہے۔ شربت، حقہ، الائچی وغیرہ اس وقت پیش کئے جاتے ہیں کہ جب سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ رواں برسوں میں بھنگ اور افیوم بھی بعض اوقات پیش کی جاتی ہے۔ تاہم کسی اجنبی کو یہ چیزیں پیش کرنا اچھی بات خیال نہیں کیا جاتا کیونکہ مشرق میں بہت تہذیب یافتہ لوگ کبھی کبھار ہی کسی دوسرے کے ہاں نشہ کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ ایرانی رواج کے برعکس مہمان کو پھل پیش کیا جاتا ہے، اور سخت غذا نہیں دی جاتی۔ جس شخص کا جتنا مرتبہ ہوا سے اتنی ہی دیر تک ملاقات کا وقت دیا جاتا ہے۔ کم درجہ لوگوں سے تھوڑی ہی دیر ملاقات کی جاتی ہے۔ رخصتی کے وقت بھی اسی طرح سے سلام دعا ہوتی ہے جس طرح سے داخلے کے وقت ہوتی ہے، اور اگر مہمان کے ساتھ ساتھ میزبان بھی اس کو چھوڑنے چلا جائے تو یہ بڑے ہی اعزاز کی بات ہے۔ (آر۔ برٹن۔ نسلیں، صفحات 5-164)

مذہبی رسومات

سندھ میں داخلے کے بعد ایک اجنبی کے لئے مذہبی رسومات کی ادائیگی سے زیادہ قابل ذکر بات اور کچھ نہ ہوگی۔ یہ لوگ نبی عربیؐ کے دین کے پیروکار ہیں۔ تمام مقامات پر غریب ترین اور نچلے سے نچلا شخص بھی مقررہ اوقات میں اپنا رخ مکہ کی جانب کر لیتا ہے اور اپنی نماز ادا کرتا ہے۔ میں نے ایک کشتی بان کو دیکھا جو بڑی مشقت سے کسی نہر کے بہاؤ کی مخالف سمت میں کشتی چلا رہا تھا، اور ساحل پر لگنا چاہتا

تھا۔ وہ گیلا ہو گیا تھا اور مٹی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے بھی وقت مقررہ پر نماز ادا کی۔ چھوٹے سے چھوٹے دیہات میں بھی مئوذن کی آواز مسلمانوں کو نماز کی جانب بلاتی ہے۔ اس آزان کو ہر جگہ سنا جا سکتا ہے اور تمام مسلمان کہ جو یہ آواز سن لیتے ہیں وہ اپنے ہر طرح کے کام فوراً چھوڑ دیتے ہیں، اور جب آخری الفاظ بھی ادا ہو چکتے ہیں تو سب ''آمین'' کہتے ہیں۔ اس بات سے بڑی مسرت ہوتی ہے اور بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ تمام ممالک کی طرح سے یہاں پر بھی تہذیب کے اس درجہ میں لوگوں کی اخلاقی صفات ان کے ایمان اور ایثار سے آگے قدم نہیں رکھتیں۔ (اے۔ برنس۔III، صفحات 9-38)

رقص

(1)

شام کو ہمیں ایک ناچ دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ چونکہ ہم نے کبھی مقامی ناچ نہیں دیکھا تھا لہٰذا ہم نے خوشی سے دعوت قبول کر لی اور ہم تیزی سے رقص گاہ کی جانب بڑھے۔ اس کمرے میں دِیے کی روشنی کم تھی۔ جب ہم اس میں داخل ہوئے تو ہمیں پتہ چلا کہ شام کی تفریحات شروع ہو گئی ہیں۔ ہم ایک مسند پر بیٹھ گئے اور اپنے اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ ہمارا میزبان اپنے عرق گلاب کے ساتھ مصروف نظر آ رہا تھا جسے وہ اپنے مہمانوں پر چھڑک رہا تھا۔ استقبالیہ تقریب ختم ہوئی اور رقاصائیں اندر آ گئیں ان کے ساتھ تین یا چار بدشکل موسیقار بھی تھے۔ کسی انگریز کے لئے پانچ منٹ تک اس فن کا مظاہرہ دیکھنا کافی تھا۔ اس کے بعد یہ رقص تھکا دینے والا نظر آتا ہے اور اس میں دلچسپی ختم ہو جاتی ہے جب تک کہ وہ اپنی زبان نہ ہلائے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تو زبان سے پوری طرح واقف ہو مگر تیل کی لپٹ اور کمرے کی گرم فضا قابل برداشت نہ ہو۔ تمام عورتیں ایک ہی طرح سے رقص کرتی ہیں اور میں نے ایک رقص کا دوسرے رقص کے ساتھ کوئی فرق نہیں دیکھا۔ ان کے پیروں میں دھات یا سونے یا چاندی کے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں جن سے وہ مختلف گھنٹیاں بجاتی ہیں یا یوں کہئے کہ ساز بجاتی ہیں۔ رقص کے دوران پیر ایک ساتھ مارتی ہیں جس کی وجہ سے زیادہ ناگوار اور مختلف آواز نکلتی ہے۔ اسی وقت رقاصہ سامعین کو نغمات سے خوش کرتی ہے۔ رقص کے دوران مہمانوں کو پھل اور مٹھائی پیش کی جاتی ہے۔ دوران وقفہ سازندے گھٹنے ٹیک کر مہمانوں سے ''بخشش'' وصول کرتے ہیں۔ مشرق میں یہ لفظ جادو کا کام کرتا ہے۔ (ایچ۔ جیمز۔I، صفحات 8-27)

(2)

مسٹر بل(Bull)، میں تمہیں ایک رقص کے بارے میں بتانے کا وعدہ کر رہا ہوں۔ ہری چند نے ایک بہترین رقاصہ کا انتظام کیا ہے جس کا نام ''ماہ تاب'' ہے۔ یہاں وہ اپنی بہنوں کے ساتھ آئی ہے۔ ہر ایک اپنے کجاوہ پر بیٹھی ہوتی ہے یوں 9 اونٹوں کی پوری ایک قطار لگی ہوتی ہے۔

ماہ تاب جو لاڑ کانے سے ہے وہ اپنے نام کی ہی طرح سے خوبصورت ہے۔ اس کے تمام نقش و خطوط اس کو اور بھی زیادہ حسین بنا دیتے ہیں۔ اس کی جوانی اس کی چمکتی ہوئی زلفوں پر قائم ہے۔ اس کے چہرے کی کھال سنگ مرمر کی طرح سے حسین ہے۔ اس کی ابرویں اور آنکھوں کے لشکارے، غرض کے سب کچھ بالکل نیا ہے جسے آج تک کسی نے استعمال نہ کیا ہو۔ وہ کسی روزِ روشن کی طرح تازہ نظر آتی ہے۔ لگتا ہے کہ اسے قدرت نے بڑی توجہ سے بنایا ہے۔ اس کے اطوار اور انداز بڑے عجیب و دلچسپ ہیں۔ اس کے اندر جذبہ وعقیدت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تم ہرگز اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں لا سکتے۔ کیونکہ مسکراہٹ آنے سے تو کسی مجسّمے کی جگہ وہ ایک دراز قد جیتی جاگتی انسان نظر آنے لگے گی۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔ II، صفحات 241-240)

رقاصائیں

کنیاری (Kanyari) طبقہ بڑا تیز اور قابل احترام جانا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کی رقاصاؤں کی مانند ہوتا ہے۔ اس طبقے کی عورتیں ناچ کے علاوہ بہت زیادہ غیر اخلاقی حرکات میں مگن رہتی ہیں۔ ہر عورت کا اپنا ایک مکان ہوتا ہے۔ اس کی شادی کسی موسیقار سے ہوئی ہوتی ہے جو اس کے رقص کے مختلف پروگراموں کو طے کرتا ہے اور بڑے سکون کے ساتھ گزر بسر کرتا ہے۔ عموماً ناچ گانا کسی مقدس مقام پر ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر تو ناچ گانا بہت ضروری چیز ہے۔ جس گھر میں ناچ ہو رہا ہو اس کا مالک رواج کے مطابق ہر رقاصہ کو دو یا تین روپے ادا کرتا ہے۔ تمام حاضرین سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ بھی ان لوگوں کو پیسے دیں گے۔ یوں ایک ہی رات میں خاطر خواہ رقم اکٹھی ہو جاتی ہے۔ صف اوّل کی رقاصہ کو ایک شام میں ہی اپنے فن کے مظاہرے میں تقریباً 100 روپے مل جاتے ہیں۔ نچلے درجے کی رقاصائیں کم از کم 10 یا 12 روپے تو وصول کر ہی لیتی ہیں۔ بعض رقاصاؤں نے اپنے

معاوضے بڑھا کر اپنا نام پیدا کر لیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک بار تو کسی باعزت تاجر نے کسی عورت سے ایک بار ملنے کے دو سو روپے دیئے تھے۔ اگر کنیاری بوڑھی ہو جائے یا اس کی عمر زیادہ ہو جائے تو اسے اپنی بیٹیوں یا پھر کنیزوں کی کمائی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگر پیسہ بچ جائے تو اس سے زیورات اور جواہرات تیار کر لئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح یہ زیورات یہاں بھی والدین سے اولاد کو وراثت میں ملتے ہیں یا پھر کسی ناگہانی وجوہات کی بناء پر وہ خاندان ان زیورات کو بیچ ڈالتا ہے۔ اس غربت کے مارے پُرخطر ملک میں اس دولت کے لٹنے کا ڈر بھی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے قتل بھی ہوئے ہیں۔ مقامی حکومت میں کنیاری کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے حکومت کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ البتہ ہندوستان کی طرح سے یہاں پر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی بلکہ صرف رواداری سے کام لیا جاتا ہے۔ کسی صاحب ناموس عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اس طبقے میں شامل ہو کر بدنام ہو جائے، اور عربوں کی طرح سے سندھیوں کی عزت کے بارے میں بھی یہ کہنا چاہئے کہ ان لوگوں میں کسی جسم فروش عورت کے پاس جانے والا شخص ذلیل تصور کیا جاتا ہے مگر اس عورت کو بےعزت تصور نہیں کیا جاتا کہ جس عورت کے پاس ہو کر وہ شخص گیا ہو۔ کنیاری عورت صاف ستھری اور خوش لباس ہوتی ہے۔ دوسری عورتوں کی نسبت وہ کبھی کبھار ہی شراب نوشی کرتی ہے۔ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ (آر۔ برٹن۔ نسلیں، صفحات 300-299)

موسیقی

میرے خیال میں میر کے موسیقار جو آلات استعمال کرتے ہیں وہ بمبئی یا سوات سے آتے ہیں البتہ سندھ میں عام آلہ موسیقی ٹوم ٹوم (Tomtom) ہے۔ یہ مختلف سائز کا ہوتا ہے اور کم سے کم تین فٹ کا ہوتا ہے۔ یہ آلہ موسیقی زیادہ تر ناچنے والیوں کے پاس ہوتا ہے۔ اسے محض گزر اوقات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور انگلیوں سے بجایا جاتا ہے۔ اس آلہ کی سب سے بڑی قسم صرف مجالس میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس وقت اسے اونٹ یا گاڑی پر لایا جاتا ہے۔ سندھ میں گٹار (Guitar) نما آلہ دراصل ہندوستان میں استعمال ہونے والا ستار (Sitar) ہی ہے جو عموماً ناچ گانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ امیر بلکہ سارے ہی سندھی اس کے بڑے شوقین ہیں۔ کنچنی یا پیشہ ور رقاص ہر بڑے شہر میں مل جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں ان نمائشوں سے زیادہ کوئی چیز باقی نہیں رہی جو میں نے

کئی بار خیر پور میں دیکھیں تھیں۔ خیر پور اپنے رقصوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ برنس نے ایک کا ذکر بھی کیا ہے جس کا نام جیون بخش تھا۔ اس کی خوبصورتی کا چرچا تھا۔ جن دنوں میں وہاں پر تھا انہی دنوں خیر پور میں امیر بخش بہت مشہور تھی۔ اس کے گروہ کی دیگر عورتوں میں مینا اور بیگم بخش بھی تھیں مگر امیر بخش سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ یہ عورت امیر کے ایک ہندو وزیر یا مختیار کار رہوتا سنگھ کی حفاظت میں رہا کرتی تھی۔ (ای۔ اے۔ لانگے۔ II، صفحات 67-66)

ملبوسات

(1)

سندھیوں کے کردار کی طرح سے ان کا لباس بھی غیر ملکی عادات کا امتزاج ہے۔ ان کی جیکٹ ہندوستانی فیشن ہے اور ٹوپی دراصل ایرانی فیشن ہے۔ ان کے پاجامے ترکوں کی طرح تنگ ہوتے ہیں۔ عماموں کا رواج عام ہے۔ موجودہ حکمرانوں کی آمد کے بعد ہی ایسا ہوا ہے کہ ہندوستان کے لٹکتے ہوئے چوغے ترک کر دیئے گئے ہیں۔ سندھیوں کو اپنی زلفوں پر بڑا فخر ہے اور اس ضمن میں وہ اپنے پڑوسی سکھوں کے ساتھ خاصی مشابہت رکھتے ہیں۔ حالانکہ کسی مسلمان کے لئے سر کے بال لمبے رکھنا مذہبی اصول نہ ہے۔ کوئی سندھی اپنی داڑھی کی لمبائی سے اپنی شان وشوکت کا اندازہ قائم کرتا ہے اور جب داڑھی سفید ہو جائے تو اس پر خضاب لگا کر سرخ یا سیاہ کر لیتا ہے۔ (این۔ کرو، صفحات 4-23)

(2)

مردوں کا لباس ڈھیلی ڈھالی قمیض، گھٹنوں تک کے پاجامے اور کپڑے یا سوتی ٹوپی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ٹوپی کافی حد تک ہیٹ (hat) سے ملتی جلتی ہوتی ہے، اور اس کے کناروں پر سوت یا زری کے پھول بنے ہوتے ہیں۔ عورتوں کا لباس بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ اس میں ٹوپی نہیں ہوتی۔ اس کی جگہ وہ چولی استعمال کرتی ہیں جو پیچھے کی جانب ڈوریوں سے باندھی جاتی ہے۔ اگر پھر بھی سینے کا اُبھار نظر آئے تو پھر ساڑھی یا کوئی کپڑا جسم کے اردگرد لپیٹ لیا جاتا ہے اس کا سرا عورت کے سر کے اوپر ہوتا ہے جو اجنبیوں سے ملتے وقت چہرہ چھپانے کے لئے نقاب کا کام بھی دیتا ہے۔ (ایچ۔ پوٹنگر، صفحہ 378)

زبان

سندھ کی زبان لکھنے اور بولنے ہر دو معنوں میں بقیہ ہندوستان سے کافی مختلف ہے۔ بلکہ امیر اور عوام تو اس زبان سے اتنے ناآشنا ہیں کہ چند ایک مسلمان ہی اس زبان کو لکھ سکتے ہیں۔ اس کا رسم الخط خداوادی (Khada-Wadi) کہلاتا ہے جو تاجروں کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان کے حروف ابجد سے موازنہ کیا جائے تو اس معاملے میں سندھ کافی غریب ہے۔ صرف دو حروف ہی ایسے ہیں جنہیں حروف علت کہا جاتا ہے اور انہی کو مختلف دستخط کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تحریری طور پر یہ زبان صرف خطوط میں استعمال ہوتی ہے۔ نیز سندھ میں جو چند کتب تحریر کی گئی ہیں وہ فارسی رسم الخط میں تحریر کی گئی ہیں۔ بلوچیوں کا تلفظ اس حد تک گنواروں کا سا ہے کہ سندھیوں کا کہنا ہے کہ بلوچیوں نے یہ زبان اس وقت اپنی بکریوں سے سیکھی تھی جب وہ لوگ قلات کے پہاڑوں میں آباد تھے۔ اس زبان میں دو مختلف لہجے استعمال ہوتے ہیں۔ حیدرآباد اور اس کے گردونواح میں ''لاڑ'' (Lar) لہجہ استعمال کیا جاتا ہے اور شمالی سندھ میں ''سار'' (Sar) لہجہ استعمال کیا جاتا ہے۔ (ایل۔ اورچ۔ I، صفحہ 97)

نشہ بازی

(1)

سارے ہی سندھی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ہوں، نشہ کرتے ہیں۔ بلوچی دوران سفر بھی حقہ اور چلم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ہندو اپنی دوکان کے دروازے پر ہمیشہ تسلی سے بیٹھتا ہے۔ عورتیں بھی مردوں کی طرح سے نشہ استعمال کرتی ہیں۔

بھنگ چونکہ سستی ہے اس لئے یہ تمام غریب طبقات میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کی حیثیت اجازت دے وہ کھانڈ یا کھجوروں سے کشید کی ہوئی تیز شرابیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ امیر البتہ کوراکوا (Curacoa) یعنی فرانسیسی شراب استعمال کرتے ہیں۔ برطانوی فوجی مقامات میں دریائے سندھ کے کنارے کئی بار پارسیوں کی دوکان قائم کی گئیں تھیں جن میں امیروں کے ذوق

کا ہر نشہ موجود ہوتا تھا۔ ہندو لوگ بھی اپنے مسلمان پڑوسیوں سے اس برائی میں پیچھے نہیں ہیں، اور پھر مشرق میں تو یہ معمولی بات ہے۔اس کے باوجود کوئی شخص نشے میں دھت مشکل سے ہی نظر آ تا ہے۔ پھر اس کا اثر بہت جوش پیدا کر دیتا ہے جو بلوچی بہت سرگرم دکھائی دیتے ہیں وہ یقیناً بھنگ چڑھائے ہوتے ہیں۔اس وقت ان پر گویا پاگل پن سوار ہو گیا ہوتا ہے اور وہ پریشان وجنونی نظر آتے ہیں۔(ٹی۔پوسٹن،صفحات 78-76)

(2)

سندھیوں کے زوال کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پورے صوبے میں نشہ بہت عام ہے۔ ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگ شراب پیتے ہیں۔البتہ چند ایک مذہبی لوگ یا ایسی شخصیات کہ جنہیں دیوتا کا درجہ دے دیا گیا ہے وہ نشے سے مستثنیٰ ہیں۔اس ملک میں انگوری شراب بہت کم ہوتی ہے کیونکہ یہاں پھل بہت کم ہیں اور جتنے ہیں وہ بطور خوراک استعمال کئے جاتے ہیں۔ عام شراب دراصل کھجوریں کشید کر کے تیار کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ اس میں کچھ اجزاء اور بھی شامل کر لئے جاتے ہیں۔بعض اوقات اس میں مشک یا عرق گلاب یا پھر زعفران بھی چھڑکی جاتی ہے۔تیز شراب البتہ کھجور یا گنے سے کشید کی جاتی ہے۔

تاہم افیون اور شراب کی طرح سے الکوحل سے بھی اعلیٰ طبقے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں جو اس کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔ عام لوگ تو مختلف قسم کی بھنگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ اس کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ مشکل سے ہی ان کا گزارہ اس کے بغیر ہوتا ہے۔تمام بڑے شہروں میں ''ڈیرہ'' کے نام سے مخصوص جگہیں قائم ہیں جہاں پر عادی شراب نوش اکٹھے ہو کر سرِ عام نشہ کرتے ہیں۔اس جگہ کی عمارت کافی بڑی ہوتی ہے جس میں ایک کھلا کمرہ ہوتا ہے۔عموماً کوئی باغ بھی لگا دیا جاتا ہے۔گزرنے والوں کی نظروں سے بچنے کی غرض سے قدرے اونچی اور موٹی دیوار بنائی جاتی ہے۔مگر اس ملک میں گھنے درخت اور اُچھلتی کودتی نہر بمشکل ہی نظر آتی ہے جو ایرانی شراب خانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔غروب آفتاب پر دن کا تمام کام بخوبی ختم کر کے بھنگی لوگ اپنی بھنگ اُٹھائے یہاں آ جاتے ہیں اور ساتھ میں دیگر اشیائے ضرورت بھی لاتے ہیں۔نشہ لینے یا شراب پینے کے بعد، نشئی لوگ جلدی سے اپنے حقے سنبھالتے ہیں اور ساتھ میٹھا گوشت بھی کھاتے ہیں تاکہ

نشہ میں اور اضافہ ہو یا یوں کہہ لیجئے کہ شراب کا اثر ذرا کم رہے۔تقریباً نصف گھنٹے میں جا کر نشہ آور اشیاء کا اثر شروع ہوتا ہے۔ہر شخص مختلف طریقے سے اس سے متاثر ہو چکا ہوتا ہے۔کوئی اپنے بازو اپنے گھٹنوں سے لگائے بے وقوفانہ حرکتیں کر رہا ہے۔اس کی لمبی داڑھی لہرا رہی ہے جیسے کہ کوئی بکری گھاس چر رہی ہو۔اس کے ساتھ کوئی موسیقی کی مہارت کر رہا ہے اور اسے اس میں صرف اپنا ہی فائدہ نظر آ رہا ہوتا ہے۔ایک اور نے بڑی تنہائی میں اپنے سر پر ایک چادر ڈال رکھی ہے اور کمرے کے کسی کونے میں بیٹھا ہے۔وہ ''لا'' (Nothing) کے موضوع پر غور کر رہا ہے۔تیسرا کوئی اُلٹی سیدھی لاشعوری باتیں کر رہا ہے۔چوتھا اتنا پُر جوش ہے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے یہاں تک کہ کسی دوست کا سر بھی پھوڑ سکتا ہے۔جبکہ ایک گروہ خاموشی سے بیٹھا گھور رہا ہے۔یہ لوگ آپس میں کبھی کبھار ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔اس مجمع کی ایک بات قابل ذکر ہے۔وہ یہ کہ اگر ایک شخص ہنستا ہے یا کھانستا ہے تو بہت سے لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں۔پھر کسی ایسے شخص پر ان کا ہاتھ پڑ جانا بہت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے کہ جس نے شراب پی ہی نہ ہو۔

یہ سماجی جلسہ رات تقریباً 8 بجے ختم ہو جاتا ہے۔اس وقت مالیخولیا کے تمام مریض اپنے اپنے ٹھکانوں پر اور بستروں میں چلے جاتے ہیں۔(آر۔برٹن۔اداس وادی۔I،صفحات 61-258)

(3)

عورتوں کو ڈیروں کی حدود میں داخل ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہوتی۔اسی وجہ سے یہ جگہ مغربی ہندوستان کے اکھاڑے (Akhara) سے بھی زیادہ قابل احترام جگہ خیال کی جاتی ہے۔اس جگہ اچھی شہرت کے حامل لوگ نہیں آتے۔گو کہ بعض اوقات سیدوں اور منشیوں کو بھی یہاں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔جلالی فقیر البتہ یہاں اکثر نظر آتے ہیں۔(آر۔برٹن۔ریسنز،صفحہ 171)

مکانات

امیروں کے بڑے بڑے گھروں کے حوالے سے میں یہ بتاتا چلوں کہ ان کی ہر منزل میں دروازوں کے اوپر محراب ضرور نظر آتی ہے جو بہت بہترین طریقے سے بنائی گئی ہے۔چھتوں پر ہلکی لکڑی کا کام ہے۔یہ ٹکڑے شاذ و نادر ہی 12 انچ سے لمبے اور تین انچ سے چوڑے ہوتے ہیں۔یہ

مختلف شکلوں میں بنائے گئے ہیں اور دستکاروں کے ذوق کے مطابق ہیں۔ سرمایہ دار لوگوں کے ہاں اس کام کو مصوری سے بھی سجا دیا جاتا ہے۔ دیوان عام ایک جانب سے مکمل طور پر کھلا ہے۔ دیواریں عموماً بہت موٹی ہیں تاکہ گرمی کو روکا جا سکے اور ان سب میں طاق بنائے جاتے ہیں تاکہ ان میں گھریلو اشیاء (Utensils) رکھی جا سکیں۔ یہ بہت عام بات ہے۔ یہاں تک کہ یہاں کا حکمران بھی اپنے عوام کی نسبت اس معاملے میں بہت کم بہتر نظر آتا ہے۔ جب خیر پور میں ریذیڈنسی (Residency) ختم کر دی گئی تو میر نے ریذیڈنٹ کے گھر کا فرنیچر اور میزیں وغیرہ خرید لیں۔ مگر یہ سب ہی ضائع ہوگئیں کیونکہ اس مال کی حفاظت کے لئے کسی ملازم کی ضرورت تھی۔ بعض پکوانی ڈشیں جو صرف ایک ہی بار استعمال ہوئی تھیں وہ آج بھی ان کے زیر استعمال ہیں۔ مگر چاندی کے دستوں والی چھریوں کا ایک خوبصورت سیٹ تقریباً بالکل ہی ختم ہو گیا ہے کیونکہ امیر جب کبھی بھی اچھے موڈ میں ہوتا تھا تو اس نے وہ چیزیں اپنے ساتھیوں یا دیگر لوگوں کو عطا کر دیں۔

گھروں کے دروازے سادہ سے بنائے جاتے ہیں اور اس میں صرف صناعوں کی دلچسپی ہی اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔ قدرے بہتر گھروں کی دیواریں بھی عام سی بنائی گئی ہیں اور ان پر ایک بار ہی سفیدی کی گئی ہے۔ بیرونی آرائش کے لئے البتہ ایسا بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ فرش جلی ہوئی اینٹوں سے بنائے جاتے ہیں مگر زیادہ تر مٹی سے بنائے گئے ہیں۔ بعض پر تو محض دریائی مٹی لیپ دی گئی ہے۔ یہ وہ مٹی ہے جو اس وقت جبکہ پانی اپنے آثار چھوڑ جاتا ہے اسے مزدور یا بھشتی اُٹھا کر لے آتے ہیں۔ سندھ کی مٹی سے پلاستر بہت اچھا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب اس میں گھاس ملا دی جائے جو اسے خشک ہونے پر ٹوٹنے سے روکتی ہے۔

گھروں کے بالائی کمرے کلیتًا خواب گاہ کے طور پر یا پھر زنان خانوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ عموماً ان کے آگے ایک چبوترہ یا چھجا ہوتا ہے۔ جس میں موسم گرما کے دوران مرد و عورت سب ہی سوتے ہیں۔ ایک بار میں اور مسٹر آئی (Mr. I) بھی ایک چھجے پر جا سوئے جس کی وجہ سے اردگرد کے سارے لوگ محتاط ہو گئے۔ میں صبح سویرے ہی اُٹھ جایا کرتا تھا اور مجھے بعض عجیب و غریب باتیں محسوس ہوتی تھیں مگر پھر آوازیں آتیں ''خاموش۔'' امیروں کے گھروں پر باہر کی جانب سے بھی رنگ کیا گیا ہے جو بہت اچھا لگتا ہے۔ سندھ میں رنگ برنگی اینٹیں بھی بنتی ہیں جو بڑے اعلیٰ پیمانے کی ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں سب سے بہترین اینٹیں ہالہ شہر میں بنتی ہیں

مگران کی خوبصورتی ان اینٹوں سے کم تر ہے جو سکھر میں بنتی ہیں اور قدیم مقابر میں استعمال ہوتی ہیں۔ای۔اے۔لانگلے۔II،صفحات40-130)

فرنیچر

خیر پور کے پورے گھرانے کا فرنیچر محض ایک لفظ''چارپائی''پر مشتمل ہے۔غریب ترین لوگوں کے ہاں یہ مفید چیز تعداد میں ایک ہوتی ہے یا پھر ایک سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔مگر حکمران کی اپنی حالت بھی کچھ اچھی نہ ہے کیونکہ امیر کے پاس نہ تو میز ہے نہ ہی کرسی ہے۔عام چارپائی گھٹیا ترین لکڑی سے بنائی جاتی ہے۔سندھ کے کسی عام شریف آدمی کے ہاں محض چند چارپائیاں اور کپڑے یا اشیاء رکھنے کے لئے چند صندوق ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اس کے ہاں ریشمی قالین بھی ملتا ہے۔(ای۔اے۔لانگلے۔II،صفحات6-135)

تیسرا باب

شہر

ٹھٹھہ

(1)

ٹھٹھہ دولحاظ سے بہت بڑا شہر ہے۔اوّل اس علاقے کی زمین بہت زرخیز ہے اور یہاں بہت سی فصلیں پیدا ہوتی ہیں خصوصاً گندم اور چاول۔دوم کپاس کی کاشت کی وجہ سے کہ جس سے دو ہزار سے بھی زائد کرگھے (Looms) کپڑا بُنتے ہیں۔یہ کپڑا بہت خوبصورت اور عمدہ ہوتا ہے اور ایشیا کے تمام علاقوں میں بلکہ پرتگال تک میں درآمد کیا جاتا ہے۔اس علاقے میں ریشم کی بھی ایک قسم پائی جاتی ہے جس سے وہ بہت عمدہ تافتان (Tafetanes) اور تافیسیاس (Tafecisias) بناتے ہیں۔اس کے علاوہ اس سے اور بھی بہت سی چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔اس علاقے کے مویشی بالخصوص بیل بھی کافی موٹے تازے ہیں۔یہ اتنے مشہور ہیں کہ صرف ان کی کھال سے ہی لدی ہوئی بڑی تعداد میں کشتیاں مختلف مما لک میں برآمد کی جاتی ہیں۔ان کھالوں سے خوبصورت چمڑا تیار کیا جاتا ہے جسے پرتگالی سندھی چمڑا کہتے ہیں وہ اسے مختلف طریقوں سے بناتے ہیں اور طرح طرح سے سجاتے ہیں۔چونکہ وہ بہت قیمتی چمڑا ہوتا ہے اور سردیوں میں بہت ٹھنڈا بھی رہتا ہے اس لئے لوگ انہیں اپنی میزوں اور بستروں پر بچھانے کے علاوہ مہمان خانوں میں سجاتے بھی ہیں۔اس شہر میں یہ لوگ بہت قیمتی لحاف اور خوبصورت دریاں بھی بناتے ہیں جنہیں سندھی کشن کہتے ہیں۔اسی وجہ سے اس شہر میں غیر ملکیوں کی بڑی تعداد رہائش پذیر ہے، اور گودی پر بہت سارے جہاز آتے ہیں جو ہندوستان سے تمام قسم کا سامان لاتے ہیں۔شہر اس دریا کے کنارے پر واقع ہے اور جتنا شہر امیر ہے اتنے ہی یہاں کے لوگ بدمعاش بھی ہیں کیونکہ بقول سلوسط (Sallust) کہ دولت برائیوں کو جنم دیتی ہے

(Ubi divitix clarx habentur, ibi omnia bona vilia sunt, fides, probitas, pudor, pudicita.)

یہاں پر برائی اس حد تک آ گئی ہے کہ نفرت انگیز گناہ عام ہو گئے ہیں اور اوباش نوجوان اس کے بہت عادی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ عورتوں کے سے کپڑے پہنتے ہیں اور انہی کی سی چال ڈھال اختیار کرتے ہیں۔ انہیں گلیوں میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔ تاکہ اپنے گاہک تلاش کرسکیں۔ ان بربری لوگوں یعنی سندھیوں کی شادیوں اور تہواروں کے موقع پر رقاصاؤں کی جگہ ان کو ہی بلایا جاتا ہے، اور یہ ایسی تمام نسوانی ملبوسات اور زیبائش کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں جن کی ان مواقع پر ضرورت ہوتی ہے۔(ایف۔ایس۔مارنرق، صفحات 60-159)

(2)

دارالحکومت بہت بڑا شہر ہے جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے۔لوگوں نے پتھروں اور گارے کے گھر تعمیر کئے ہوئے ہیں جو بڑے بڑے احاطوں میں قائم ہیں۔البتہ چھوٹے گھر قطبی طرز کے بنے ہوئے ہیں جن کو مٹی اور گھاس سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور بڑے مضبوط ہیں۔لوگوں کے گھر ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ اگر یہ پرتگیزوں کی طرح سے رہیں تو اس شہر کا پانچ گنا رقبہ بھی ان کے لئے کافی ہوگا۔لوگ بہت کمزور، وہمی اور جھوٹے ہیں۔ ہندو اور مسلمان سب مل جل کر رہتے ہیں۔

سندھ کے اس عظیم شہر میں کارمالیوں (Carmalites) کا گرجا گھر بھی ہے۔ وہ لوگ ننگے پیر رہتے ہیں اور ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ وہ کسی مقامی کا مذہب تبدیل نہیں کرتے کیونکہ ان میں سے کوئی عیسائی ہوتا بھی نہیں البتہ اس سے پرتگالیوں کو بڑا تعاون ملتا ہے۔اس شہر میں بہت سے شادی شدہ پرتگالی پہلے بھی رہا کرتے تھے اور اب بھی رہتے ہیں۔ پرتگالیوں سے کچھ فاصلے پر دو کارمالی پادری رہتے ہیں جن کے ساتھ وہ بڑے خوش رہتے ہیں۔سندھ کے مسلمانوں نے ایک بار اس گرجے پر قبضہ کرلیا اور اس کی تمام چیزیں اُٹھالیں لیکن بعد میں سب کچھ واپس کر دیا۔ پرتگالیوں سے یہاں پر بڑا برا سلوک کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ (پرتگالی) خود کو ہی موردالزام ٹھہراتے ہیں کیونکہ انہوں نے مقامی باشندوں پر بڑے ظلم کئے اور بعض اوقات تو ان کو قتل بھی کیا۔ وہ لوگ کہ جنہیں نقصان پہنچا تھا ان

کو بھی رشوت دے کر خاموش کر دیا گیا۔ پرتگالی اپنے گھروں میں کپڑوں کی گانٹھیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ مغلوں کے افسران مالیہ ان کی تلاشیاں لیتے ہیں اور منظوری دے کر اپنی مہریں ثابت کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ کسٹم ہاؤس سے الگ رکھے جاتے ہیں اور ہر بڑی تشخیص سے بچ جاتے ہیں جس کی مالیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔(پیڈرو۔بی۔ڈی۔ریسنڈ، صفحات 4-2)

(3)

ٹھٹھہ شہر بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ یہ بہت بڑا اور دولت مند شہر ہے۔ یہ تقریباً تین میل لمبا اور نصف میل چوڑا ہے اور لاہری بندر سے تقریباً 40 میل دور ہے۔اس کے مغربی سرے پر ایک لمبی سی فصیل ہے جس میں تقریباً پانچ ہزار آدمی اور گھوڑے آ سکتے ہیں اور ان کی سہولتوں کے لئے اصطبل اور حجرے بنے ہوئے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس میں نواب کے لئے ایک محل بھی تعمیر ہے۔

ٹھٹھہ شہر دریائے سندھ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر میدان میں واقع ہے۔ یہاں کے لوگوں نے دریا سے نہریں نکال رکھی ہیں جن کے ذریعہ شہر میں پانی آ جاتا ہے جو ان کے باغات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ 1699ء میں بادشاہ کے باغات بہت اچھی حالت میں تھے اور ان میں پھولوں اور پھلوں کے وافر ذخیرے لگے ہوئے تھے خاص طور پر انار تو بہت ہی لذیذ تھے۔ میں نے کئی بار ان کا ذائقہ چکھا تھا۔

ٹھٹھہ شہر، الٰہیات، لسانیات اور سیاسیات کی تعلیم کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور ان شعبہ جات میں نوجوانوں کو تربیت دینے کی غرض سے تقریباً چار سو مدارس ہیں۔ میں ایک سید سے جو الٰہیات کا ماہر تھا بہت متاثر ہوا۔ وہ اچھا مورّخ بھی تھا۔ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں نے اپنے ملک میں سکندر اعظم کے بارے میں سنا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ہاں اور میں نے پورس کے ساتھ اس کی جنگ اور فتح کا حال بیان کیا۔اس نے مجھے بتایا کہ ان کی تاریخوں میں بھی ایسا ہی ہے لیکن دونوں بادشاہوں کے ناموں میں کچھ اختلاف ہونے کے علاوہ دریائے سندھ پر سے اس کی گزرگاہ پر بھی اختلاف ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی تاریخ میں شاہ اسکندر اور پورس کا ذکر ہے نیز یہ بھی تحریر ہے کہ سکندر بہت بڑا جادوگر تھا اور اس نے تقریباً دس لاکھ جنگلی ہنس (Geese) جمع کئے تھے جس پر سے اس کی فوج نے دریا پار کیا اور پورس کے ہاتھی کبھی اس جگہ کی جانب اپنے رُخ نہیں کرتے

تھے کہ جہاں اسکندر رہوا کرتا تھا۔(اے۔ہملٹن،صفحات 78-75)

(4)

ٹھٹھہ کا شہر اس سے پہلے حکومت کا مرکز رہ چکا ہے اور موجودہ حکومت کے عہد میں یہ تجارتی شہر زوال پذیر ہونے لگا جس کی وجہ سے یہاں کے مالیے اور آبادی میں بہت تیزی سے کمی آنے لگی۔میر غلام علی نے اس شہر سے جو رقم مالیہ اور کسٹم کے نام پر وصول کی تو اس کا اندازہ ایک لاکھ پینتالیس ہزار روپیہ لگایا جاتا ہے۔ ہندوستان، فارس اور خراسان برآمد ہونے والے سندھی کپڑے یہیں پر تیار ہوتے ہیں۔(ای۔ایلس،صفحہ 10)

(5)

باہمی رضامندی سے ایک ہفتہ اس غرض سے ٹھٹھہ میں گزارا گیا تاکہ شہر اور اس کے گردونواح کا جائزہ لیا جا سکے۔ یہ شہر دریائے سندھ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔مشرق کی تاریخ میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔سلطنت دہلی کے زوال کے ساتھ ہی اس کی اہمیت ہی ختم ہوتی چلی گئی، اور جب سے یہ سندھ کے موجودہ حکمرانوں کے ہاتھوں میں آیا ہے تو ان کے اپنے ظلم کرنے کے نظام کی وجہ سے یہ بالکل کھنڈر بن گیا ہے۔اب اس میں پندرہ ہزار سے زیادہ لوگ نہیں رہتے۔اس کے نصف سے زائد گھر کھنڈر بن چکے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سابقہ اور موجودہ حکمرانوں کی آپس کی لڑائی نے جب افغانوں کو سندھ پر حملے کرنے کا موقع فراہم کیا تو اس شہر کے تاجر خوفزدہ ہو گئے اور اس وقت وہ اس ملک سے بھاگ نکلے۔اس کے بعد سے انہیں اس شہر میں دوبارہ آنے کی ہمت نہ ہوئی۔''لنگیاں'' بنانے والوں (لنگی، دراصل ریشمی اور سوتی کپڑے کے امتزاج سے بنتی ہے) کی وجہ سے یہ شہر پہلے بہت مشہور تھا مگر اب یہاں پر ان کے صرف 125 گھرانے رہ گئے ہیں،شہر میں چالیس تاجر بھی باقی نہیں ہیں۔ بیس ساہوکاروں کا ٹھٹھہ کے سارے کاروبار پر قبضہ ہے، اور یہاں کی قلیل آبادی کو جانوروں کا گوشت فراہم کرنے والے صرف پانچ قصاب ہی رہ گئے ہیں۔اس طرح سے یہ عظیم شہر جو گزشتہ صدی کے ابتدائی ربع میں نادر شاہ کے عہد میں بہت مشہور تھا آج یوں ویران پڑا ہے۔

ٹھٹھہ کی تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یونانیوں کا بیان کردہ پٹالہ (Pattala) شہر

دراصل یہی جگہ معلوم ہوتی ہے، اور میرا خیال ہے کہ معقول دلائل کی بناء پر وہ ذکر اسی شہر کا ہے کیونکہ یہاں پر آ کر دریائے سندھ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس مورّخ کے الفاظ یوں درج ہیں:___ ''پٹالہ کے نزدیک، دریائے سندھ دو بڑی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔'' رابرٹسن اور ونسنٹ، دونوں ہی اس سے مراد ٹھٹھہ لیتے ہیں۔ مسلمانوں کی فتح سے قبل ہندو راجاؤں نے اس کا نام سمی نگر (Sameenuggur) رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مورّخ پیری پلس (Periplus) کا بیان کردہ شہر میناگر (Minagur) ہی ہے۔ ٹھٹھہ سے چار میل جنوب مغرب میں کلان کوٹ (Kullancote) نامی شہر کے کھنڈرات آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کا نام برہمن آباد بھی تھا اس پر ایک بھائی حکومت کرتا تھا جبکہ حیدر آباد پر دوسرا بھائی حکومت کیا کرتا تھا جس کا نام اس وقت نیرون کوٹ (Nerancote) تھا۔ عرب اس کو دیول سندھی (دیبل۔سندھ) کہتے تھے۔ نگر ٹھٹھہ (اسی نام سے یہ آجکل مشہور ہے) تو بہت جدید نام ہے۔ جب سے تالپوروں نے اس ملک میں اپنے قدم جمائے ہیں تب سے یہ ان کا دارالحکومت ہے۔ یہ بہت کشادہ شہر ہے اور ایک زیریں وادی میں اونچے سطح مرتفع پر قائم ہے۔ میں نے بیس فٹ گہرے کنوؤں میں نیچے کی جانب کئی پتھر لگے دیکھے ہیں۔ قبروں پر البتہ قدامت کا کوئی نشان نہ ہے۔ شہر کے مغرب میں ایک قابل غور پہاڑی ہے جو تقریباً دوسو سال پرانی ہے۔ گھر لکڑیوں کے بنے ہوئے ہیں اور دیواروں اور فرش پر لیپ کیا ہوا ہے۔ ان کی چھتیں سپاٹ ہیں۔ یہ گھر آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور چوکور میناروں کی شکل کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی رنگت سے ان کی بناوٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ قدرے بہتر کام اینٹوں سے بنے ہوئے گھروں کا ہے۔ مگر پتھر محض ایک یا دو مساجد کے لئے ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ ٹھٹھہ شہر کی عظمت رفتہ کو یاد کرنے کے لئے اس شہر میں اب بہت ہی کم چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمتی اینٹوں سے بنی ہوئی مسجد اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسے شاہ جہاں نے بنوایا تھا۔

ہندوستان سے ہنگلاج (Hinglaj) جانے والی بڑی شاہراہ پر یہ شہر ٹھٹھہ واقع ہے۔ مئوخرالذکر ایک عبادتی اور رسمی جگہ ہے۔ جو ہالہ (Hala) [قدیم لوگوں کے دور کا ارس (Irus)] کی بنجر پہاڑیوں کی ترائی میں واقع ہے۔ اس کی نشانی محض تازہ پانی کا چشمہ ہے۔ وہاں کوئی گھر یا مندر نہیں ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس جگہ کا ہندوؤں کے دیوتا رام چندر نے دورہ کیا تھا۔ اس بات کا ایک پتھر پر تذکرہ موجود ہے اور شہادت کے لئے سورج اور چاند کی شبیہ بنا دی گئیں ہیں۔ ٹھٹھہ

سے اس کا فاصلہ تقریباً 200 میل سے بھی زیادہ ہے۔ یہ راستہ کراچی، سومیانی (Soumeeanee) اور صوبہ لس (Lus) سے گزرتا ہے جو نومریوں (Noomrees) کا علاقہ ہے اور سکندر اعظم کے راستے کا ایک حصہ ہے۔ ہنگلاج کا سفر کرنے والا گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ ناریل کے ایک گولے سے اس کے کردار کی نوعیت کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے۔ اگر پانی اُبل جائے تو اس کی زندگی لمبی بھی ہوگی اور پاکیزہ بھی ہوگی لیکن اگر وہ خاموش اور ساکن رہے تو ہندو کو مزید تپسیا کرنی پڑتی ہے اور چلہ کھینچنا پڑتا ہے۔ گھوسیوں (Goseins) کا قبیلہ جو زیادہ تر تاجر اور سرمایہ دار لوگ ہیں وہ اکثر اس مقام پر آتے ہیں اور اکثر اوقات وہ ایک جزیرے تک اپنا سفر بڑھا لیتے ہیں جسے سیتادیپ (Seetadeep) کہتے ہیں اور جو فارس میں بندر عباس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ کسی روحانی سربراہ یا آگوا (Agwa) کی زیر قیادت ایک سو یا اس سے بھی زیادہ افراد کا قافلہ بن کر سفر کرتے ہیں۔ ٹھٹھہ میں ایک مہا پنڈت ان کی خدمت کرتا ہے۔ وہ بھی بڑا نیک شخص خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی روحانی طاقتوں کے عوض پر یاتری (مذہبی سفر پر جانے والا مسافر) اسے ساڑھے تین روپے ادا کرتا ہے، اور وعدہ کرتا ہے کہ وہ واپسی پر اس کی جانب سے عطا کئے گئے عصا کو واپس کر دے گا کیونکہ کوئی اس مقدس جگہ پر زیادہ دیر اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔ ''آگوا'' اپنا معاوضہ لیتا ہے اور بعض ہندو تو بڑی مشقت و محنت سے جمع کی گئی اپنی ساری زندگی کی پونجی لٹا دیتے ہیں۔ ہنگلاج سے واپس ٹھٹھہ آنے پر اسے سفید دانوں کی تسبیح دی جاتی ہے جو اس شہر کی خاص چیز ہے اور یہ ملتی بھی صرف اس شہر کی قریبی پتھریلی چٹان پر ہے۔

یہ جوار اور دلا کے دانوں کی شکل کے ہوتے ہیں۔ یاتری کو یقین ہوتا ہے کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے دانے ہیں جس نے انہیں زمین پر اپنی تخلیق کو یاد کرتے رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ یہ چیزیں ٹھٹھہ کے پادریوں کے لئے اب منافع حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی ہیں اور یوں وہ اپنی اجارہ داری بھی قائم رکھتے ہیں۔ (اے۔ برنس۔III، صفحات 34-30)

(6)

اس پہاڑی کی چوٹی سے (جس میں یہ کھدائی کی گئی ہے) ٹھٹھہ بہت بڑا شہر معلوم ہوتا ہے۔ مکانات مٹی رنگے معلوم ہوتے ہیں اور گری ہوئی دیواروں اور مسجدوں کے ڈھیر اتنی دور سے رہائش گاہوں کے حصے معلوم ہوتے ہیں لیکن جب آپ شہر میں پہنچ جائیں تو فریب نظر ختم ہو جاتا ہے اور

دائیں بائیں بے آباد اور تباہ شدہ مکانات کی لمبی گلیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سڑک کے آخری دو میل سات آٹھ فٹ اونچے پہاڑی راستے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں جو پرانے زمانے میں شہر اور پہاڑی کے درمیان اس وقت رابطے کا کام دیتا تھا جب دریائے سندھ کی سالانہ طغیانی شہر ٹھٹھہ کو گھیر لیتی تھی۔ چند سالوں سے ایسا نہیں ہوا جس کے وجوہات میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا جب میں اس دریا کا ذکر کروں گا۔ کنارے کا پشتہ بھی شہر کی طرح ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔

16- جون کو صبح سات بجے ان مضافات میں داخل ہوئے جہاں لوگوں کا ایک بہت بڑا مجمع ہمارے پیچھے پیچھے چلا، مشن کی کامیابی کی دعائیں مانگتا ہوا اور خوب زور شور سے تالیاں پیٹتا ہوا۔ ہمیں کھنڈرات سے گزرتے ہوئے کافی وقت لگا۔ شہر کے آباد حصے میں بھی کافی فاصلہ کے بعد ہم آنرایبل کمپنی کی فیکٹری (یہاں کئی سالوں سے ایک ریذیڈنسی تھی) میں پہنچے اور اُتر کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ابھی ہم سڑک پر ہی تھے کہ امیروں کا دوسرا خط سفیر کو موصول ہوا کہ ایک جمپٹی (سرکاری کشتی) اسے اور اس کے عملہ کو حیدرآباد لے جانے کے لئے بھیجی جا رہی تھی اور وہ چند دنوں میں ٹھٹھہ آجائے گی۔ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا کہ کسی عذر معقول پر عملے کے معززین یہاں علیحدہ ہو جائیں اور دو مختلف راستوں سے دربار میں پہنچیں تا کہ ایسی تنگ ظرف حکومت کے تحت اس کے علاقے کا زیادہ سے زیادہ جغرافیائی علم حاصل کیا جا سکے لہٰذا یہ شائستہ فعل کچھ ناخوشگوار ہی معلوم ہوا لیکن یہ اس کے برعکس ثابت ہوا اور ہمارا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ گیا کیونکہ کشتی اتنی مختصر تھی کہ آدھا عملہ بھی اس میں نہ سما سکا۔ مسٹر ایلس کیپٹن میکس فیلڈ اور میں بمشکل اس میں جگہ پا سکے اور سفیر اور باقی افسر زمینی راستے سے روانہ ہوئے۔

ٹھٹھہ میں قیام کے دوران ہمارے پاس اتنا وقت تھا کہ ہم نے اس کے کونے کونے کو دیکھا اور ہمارے شکاری خرگوش اور تیتر کے شکار سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

میں نے پہلے لکھا ہے کہ ٹھٹھہ کسی وقت سندھ کا دارالحکومت تھا لیکن جب موجودہ حکمرانوں نے قلعہ حیدرآباد بنالیا اور دربار وہاں منتقل کر لیا تو اس کی آبادی اتنی تیزی سے کم ہوئی کہ اب تو شہر کا ایک تہائی حصہ بھی آباد نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ اب بھی ایک بڑی جگہ ہے جو تقریباً چھ میل کے احاطہ میں پھیلی ہوئی ہے اور دونوں طرف کھنڈرات بہت دور دور تک نظر آتے ہیں۔

میں نے اس شہر کے بانی کے متعلق جاننے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔اس کا پہلا ذکر ہمیں 92ھ(677ء) میں ملتا ہے جب یہ قلعہ بند تھا اور اس نے خلفائے عباسیہ کے لشکروں کی کچھ مزاحمت کی۔اس کا محل وقوع عموماً یونانیوں کا پٹالہ بتایا جاتا ہے۔لیکن سندھ کے زیریں علاقے اتنا حیران کن طور پر بدل چکے ہیں کہ ایسے نظریات کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ جب سندھی حکمران عربوں کے تسلط سے آزاد ہوئے تو انہوں نے ٹھٹھہ کو اپنا صدر مقام بنایا اور یہ جلد ہی ایشیا کا ایک عظیم ترین شہر بن گیا اور جزیرہ نمائے ہند اور شمالی اور مغربی ایشیا کے درمیان تجارت کا سب سے بڑا مرکز بنا۔اس میں انہوں نے خوبصورت ترین باغات اور عمارات بنوائیں اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے چار میل مشرق میں بہتے ہوئے دریائے سندھ سے نہریں نکالیں۔تاکہ سامان تجارت سوداگروں کے گھروں تک پہنچ سکے اور وہیں سے لادا جا سکے۔ان حکمرانوں کے آرائشی کارنامے تو اب قریباً ختم ہو چکے ہیں اور صرف ایک نالی رہ گئی ہے جو کوڑا کرکٹ سے بھری ہوئی ہے اور اسے نہر کے نام سے بھی کوئی نسبت نہیں رہی۔

میرے خیال میں اس شہر کی عظمت و خوشحالی اس وقت سے روبہ انحطاط ہوئی جب صوبہ سندھ شہنشاہان ہند کا خراج ادا کرنے والا بنا لیکن اسے بھی صرف اس کی اصلی دولت وعظمت کے مقابلہ پر دیکھنا چاہئے ورنہ نادر شاہ جب دہلی سے واپسی پر یہاں سے گزرا(1742ء) تو یہاں کیلیکو اور لنگیوں کے بننے والے چالیس ہزار تھے اور ان کے علاوہ بیس ہزار دیگر کاریگر اور صنعت کار تھے۔روپے کا لین دین کرنے والے،مہاجن،دکاندار اور غلہ فروش ان کے علاوہ تھے اور ساٹھ ہزار تھے۔جبکہ اس وقت کل آبادی زیادہ سے زیادہ بیس ہزار بتائی جاتی ہے اور اس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے کے بھی برابر نہیں جو مذکورہ نادرشاہی دور کی ایک ماہ کی آمدنی سے بھی کم ہے۔

اب ٹھٹھہ کی مصنوعات میں صرف چند سفید کپڑے اور رنگین لنگیاں رہ گئیں ہیں اور ایک بڑے تجارتی شہر کی گہما گہمی کی بجائے گلیاں ویران ہیں اور چند کھلی ہوئی دکانیں بھی چرچہ معلوم ہوتی ہیں اور پورا بازار ویرانی کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہاں کے مکانات کا نقشہ مجھے کسی اور ملک میں نظر نہیں آیا۔ان کی دیواریں اندر سے کھوکھلی ہیں۔ان کے اندر لکڑی کے ایک چھوٹے سے ڈھانچے کے بیرونی سروں سے چھوٹی چھوٹی چھڑیاں آرپار گزاری گئی ہیں جو آٹھ سے سولہ انچ تک لمبی ہیں اور وتر کے بل پر رکھی گئی ہیں حتیٰ کہ وہ دورویہ ایک مضبوط ڈھانچہ بن جاتی ہیں اور مٹی یا گارے سے لپائی کے بعد ایک ٹھوس دیوار کا منظر پیش کرتی ہیں۔اس اصول پر بنی ہوئی بعض عمارات تین چار منزلہ ہیں اور ان کے اوپر

بھاری بھرکم مسطح چھتیں ہیں جو ان کی محکمی کا ثبوت ہیں لیکن میرے خیال میں وہ دیرپا نہیں ہوسکتیں اس لئے کہ جونہی دو تین لکڑیاں دیواروں میں کمزور ہو جائیں تو ساری عمارت گر سکتی ہے۔ بہت سے بہتر مکانات بھی لکڑی کے ڈھانچے پر اینٹ اور گارے سے بنے ہوئے ہیں اور ان سب میں گورنر کے محل سے لے کر مزدور کی جھونپڑی تک بادگیر لگے ہوئے ہیں جو بیحد حبس کے موسم میں بھی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے روشندان ہیں۔ اس وقت دیگر ہر روزن اور موکھا بند کر دیا جاتا ہے تاکہ گرم ہوا اور گرد اندر نہ آ سکے۔ ٹھٹھہ کے گورنر کو نواب کا لقب دیا جاتا ہے جو 1809ء میں امیروں کا ایک عمزاد تھا لیکن اس کی تقرری میں کوئی کام نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کوئی مستقل فوج نہیں اور چونگی کا ٹھیکے دار ایک ہندو ہے جو اپنے کام کے لئے اپنا حصہ لیتا ہے۔ اس شہر کا عرض بلد 44-24 شمالی اور طویل بلد 17-68 مشرقی ہے جو کیپٹن میکس فیلڈ کے متعدد مشاہدات کی اوسط پر مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے اردگرد کا علاقہ مکمل طور پر میدان ہے سوائے مکلی کی پہاڑیوں کے جن پر مقابر بنے ہوئے ہیں اور پہلے بیان ہو چکے ہیں اور یہ پہاڑیاں سمندر سے پندرہ بیس میل ورے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان پہاڑیوں پر اور اس میدان میں بھی زیادہ تر تمرس اور حنا کے گھنے جنگلات ہیں۔

اب بارشیں خوب زور شور سے شروع ہوگئی تھیں اور گلیاں نالے بن جاتی تھیں۔ لہٰذا ہم صبح اور شام کو سیر اور گھوڑ سواری کے لئے نہ نکل سکتے تھے۔ اس بارش سے پہلے گرمی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور فیکٹری کے سب سے ٹھنڈے کمرے میں بھی درجہ حرارت 94 سے 102 تک ہوتا ہے لیکن وسط جولائی میں موسم کچھ خنک ہوگیا اور ہم اکثر زوردار شمالی ہوا کے چلنے سے حیران ہوتے تھے۔ ایسی ہی ہوا میں ہمارے جہازوں نے کراچی بندر کی روک کو پار کیا اور وہ بہت جلد بمبئی پہنچ گئے۔ اسی ماہ کے آخر میں مشن ٹھٹھہ سے حیدرآباد چلا گیا۔ مسٹر ایلس، کیپٹن میکس فیلڈ اور میں دریائی راستے سے پہنچے اور اس کے کئی دن بعد سفیر اور اس کا عملہ آئے کیونکہ سفیر کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں راستے میں رکنا پڑا تھا۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

(7)

ایک وقت تھا کہ ٹھٹھہ کا مشہور شہر جو "Lat.24 44" Long 68 17 پر واقع ہے وہ ریاست حیدرآباد میں اپنی وسعت اور آبادی کے حوالے سے دوسرے نمبر پر تھا۔ اس زوال کا تصور کرنا بھی

مشکل ہے جو اس عظیم شہر پر آ گیا ہے۔ اس جگہ جہاں پہلے صرف ساٹھ ہزار لوگ مختلف صنعتوں میں ملازم تھے۔ اب اس کی کل آبادی صرف بارہ ہزار کے قریب ہے۔ یہ سندھ کی وہ واحد جگہ ہے کہ جہاں کا ہم نے دورہ کیا تو ہمیں اس کی عظمت رفتہ کے نشانات بھی ملے۔ یہیں پر شاہان دہلی کے قلعہ اور نوابوں یا گورنروں کی رہائش گاہ کے آثار بھی ہیں۔ قلعہ تقریباً 400 مربع گز پر ہے۔ اس کی دیواریں ساٹھ فٹ اونچی بیان کی جاتی ہیں اور اس کے دروازے (جن کے بارے میں آج بھی آبادلوگوں کو یاد ہے کہ) اتنے بڑے تھے کہ سب سے بڑا ہاتھی بھی اپنے ہودے کے ساتھ اس کے نیچے سے گزر سکتا تھا۔ اب تو یہ سارا ہی زمین بوس ہو گیا ہے اور صرف بنیادوں سے ہی دیواروں کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ ٹھٹھہ میں اس کے علاوہ بھی اینٹوں کی بنی ہوئی بہت سی عمارتیں ہیں۔ ان میں مقامی طرز کی ہی وہ عمارت بھی ہے جو کبھی کمپنی بہادر کا کارخانہ ہوا کرتی تھی۔ ٹھٹھہ کے موجودہ مکانات زیادہ تر مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن بنیادیں رکھنے کی غرض سے اینٹوں کی بکھری ہوئی معقول تعداد کافی کام آ جاتی ہے۔ یہ اینٹیں چاروں جانب بکھری پڑی ہیں۔ اس شہر کے اردگرد پہلے بہت سے باغات تھے جن میں سے بعض اب بھی قابل رحم حالت میں موجود ہیں لیکن اس شہر اور اس کے گرد و نواح میں ہر جانب ہی تباہی اور مصیبت کے آثار ہیں جس کی وجہ سے دیکھنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ خیال ہے کہ پہلے یہ شہر کے بالکل قریب بہا کرتا تھا۔ شہر کے قریب ہی کسی بڑے سے گڑھے کے آثار سے اس بات کی توثیق بھی ہوتی ہے۔ سندھ کے موجودہ حکمرانوں کو ٹھٹھہ سے کافی نفرت ہے حالانکہ یہ ان کے اجداد کی رہائش گاہ تھی۔ یہاں کے باشندوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ یہاں کے ایک مقامی باشندے نے مجھے یقین دلایا کہ اور تو کسی چیز سے نہیں ہاں البتہ مقصد کے حصول میں مشکلات کی وجہ سے تقریباً چھ ہزار کے قریب ہندو اس شہر سے جانے سے باز رہے اور انہوں نے برطانوی علاقوں میں ہجرت نہ کی۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحات 30-29)

(8)

ٹھٹھہ، جدید جغرافیہ دانوں کے لئے کافی دلچسپ جگہ ہے۔ کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی یونانیوں کا بیان کردہ پٹالہ (Pattala) شہر ہے۔ یہ پورے ہندوستان میں اپنے کرگھوں کی عمدہ مصنوعات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہ شہر مکلی (Mukali) کی پہاڑیوں کی ترائی میں واقع ہے اور

دریا سے لائی ہوئی مٹی سے بنی ہوئی وادی کے دامن میں ہے۔ دریا سے یہ تین میل کے فاصلے پر ہے۔ غلاظت وگندگی سے بھرے ہوئے ٹیلے جن پر گھر تعمیر ہیں، اس کی سطح کو آہستہ آہستہ وادی کی سطح سے اوپر بلند کرتے جاتے ہیں۔ جب شدید بارش ہوتی ہے تو شہر اور اس کے گرد و نواح میں پانی بہت وافر مقدار میں آ جاتا ہے۔ اچھے مکانات بہت کم ہیں نیز اسے قابل تلف مواد کی وجہ سے کہ جس سے ان کو تعمیر کیا گیا ہے ان کی مرمت کرنا بھی مشکل ہے۔ شدید ترین بارش میں مٹی کا لیپ اُترنے کے بعد مکان کی بیرونی شکل بہت بری ہو جاتی ہے اور غربت کا پتہ دیتی ہے۔ ٹھٹھہ کی موجودہ صورت حال بہت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہاں کا موسم بھی صحت کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے۔ 1836ء کی گرمیوں میں جب میں یہاں پر آیا تو میرے خیال میں یہ جگہ مضر صحت تھی۔ اس جگہ پر ہمارے فوجیوں کو بیماری سے دوچار ہونا پڑا تھا اور پھر ایسا ہی 1839ء میں بھی ہوا۔

جن مصنوعات کی وجہ سے اس شہر نے تجارتی شہر کی حیثیت سے شہرت پا لی ہے وہ لنگی ہے۔ یہ زری، سوت اور ریشم سے ملا کر بنایا ہوا بڑا قیمتی کپڑا ہے۔ سب سے مہنگا اور اچھا سوت وہ ہوتا ہے جو فارس کے صوبہ جیلان سے آتا ہے۔

ٹھٹھہ کے پیچھے پہاڑوں کے اوپر گزشتہ کئی نسلوں کے مقبرے ہیں ایک قبرستان چار میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ بہت سے بڑے بڑے مقبرے اب بھی بڑی عمدہ بناوٹ کے موجود ہیں۔ گو کہ وہ شکستہ حال ہو چکے ہیں۔ گو کہ ان میں سے کسی کے ماہر تعمیرات کو تلاش نہ کیا جا سکتا ہے مگر بنانے والے نے بڑی مضبوطی سے قبریں تیار کی ہیں۔ داخلی دروازے سے لے کر اوپر ایک چھوٹے سے صاف ستھرے احاطے تک، مختلف سائز کی قبریں ہیں، اور ان میں سے اکثر بظاہر ایک ہی خاندان کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان پر صرف ایک ہی لفظ ''اللہ'' کندہ ہے۔

ٹھٹھہ کے قریب ہی کلاں کوٹ (Kullan Kote) اور سامی نگر (Sami Nuggur) کے کھنڈرات ہیں۔ مقامی باشندے بتاتے ہیں کہ یہ مقامات بہت ہی قدیم ہیں۔ مئوخر الذکر نے اس شہر سے تین میل شمال۔شمال۔مغرب (N-N-W) میں زمین میں دھنسا ہوا ٹیلہ ہے، اور جھونپڑیوں سے پرے ذرا اوپر کی جانب تعمیر ہے۔ وادی سے اوپر کی جانب اس کی چڑھائی سے اور غرقابی سے تحفظ کی وجہ سے مقامی رہائشی باشندے اس پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ ٹھٹھہ سے جنوب مغرب کی سمت میں کلاں کوٹ یا ''بڑا قلعہ'' ہے جو چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک تراشا ہوا پہاڑ ہے

جو تین چوتھائی میل (3/4 میل) لمبا ہے اور تقریباً سات سو قدم چوڑا ہے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ کسی وقت یہ جھیل میں گھرا ہوا تھا۔ البتہ یہ جھیل اب اس کے شمال اور شمال مغرب تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کئی جگہ سے اس کی بیرونی دیوار اب بھی موجود ہے۔ مگر کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے کہ جس سے ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ اس کے انتظامات کیا تھے۔ جھیل کے اوپر کو لٹکتا ہوا پہاڑ بڑا ہی بدھا معلوم ہوتا ہے۔ چٹان گہرے چشمے میں جا کر پھٹ جاتی ہے اور متحجر (Conglomerate) کے بڑے بڑے ٹکڑے ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں ہندو زاہدوں کے لئے قائم اس موزوں ترین جگہ سے تو کوئی مسلم فقیر بھی نہیں فرار ہو سکتا۔ البتہ یہاں کے گھرانے جدید طرز کے ہیں۔

تجارتی نقطہ نظر سے ٹھٹھہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ بالکل ابتدائی عہد میں بھی یہاں پر کوئی منڈی ضرور موجود ہوگی۔ مگر چونکہ ڈیلٹا کی دم یا آخری سرے کی کوئی متعین جگہ نہ ہے اس لئے دریا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شہر کی جگہ ہی تبدیل ہوتی رہی ہوگی۔ جائے آمدورفت ہونے کی وجہ سے اسے دریا کے بالکل ساتھ ہونا چاہئے۔ یہ خیال بھی قائم نہیں کیا جا سکتا کہ جدید ٹھٹھہ کے مقابلے میں قدیم ٹھٹھہ کی عمارتیں زیادہ مضبوط تھیں۔ اسی وجہ سے اس کے بہت سے نام یکے بعد دیگرے پڑتے رہے ہیں۔ جیسے دیبل (Debul)، ٹھٹھہ، برہمن آباد، نگر، ٹھٹھہ اور سیمی نگر۔ انہیں ناموں سے بعد کے حکمران اس شہر کو پہچانتے ہیں، اور غالباً ان مواقع پر متروک ہو کر رہ گئے کہ جب دریا کی طغیانی کی وجہ سے جگہ کی تبدیلی لازمی امر بن گئی۔ اس میدان میں کسی بھی مستقبل آبادکاری نہ ہو سکنے کی وجہ سے یہاں کے باشندوں نے قدرتی طور پر نواحی پہاڑوں پر پناہ لینے کا سوچا ہوگا۔ کلاں کوٹ کی موجودہ صورت حال بھی یہی بتاتی ہے۔ نیز اس کا نام (بڑا قلعہ) بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خطرات کے دوران یہ پناہ گاہ ہوتی ہوگی وادی میں قدرتی اسباب کی وجہ سے تعمیرات کے محدود ہو جانے نے شہر کے عقب میں مکلی (Mukali) کی پہاڑیوں پر اس خواہش کو بڑی تیزی سے پورا کر دیا۔ یہاں پر نہ تو محنت کرنی پڑی اور نہ ہی روپیہ لگانا پڑا۔ (جے۔ ووڈ، صفحات 5-8)

(9)

یہ جگہ بڑی تیزی سے انحطاط کا شکار ہو گئی ہے اور اب یہ پہلے کی طرح سے امیر و کبیر شہر نہ رہا ہے۔ لنگی کی مصنوعات کہ جس کی وجہ سے ٹھٹھہ بہت مشہور تھا وہ اب ختم ہو گئی ہیں۔ حکومت سے واضح حکم حاصل

کئے بغیر اب کوئی لنگی تیار نہیں کی جاتی۔ہم نے وہ گھر بھی دیکھا جہاں پہلے مسٹر کرو(Mr. Crowe) رہتا تھا (یہ عمارت ٹھٹھہ کی دیگر اکثر عمارتوں کی طرح سے تھا) یہ بہت خراب حالت میں تھا۔ چونکہ اس میں کچھ سندھی رہتے تھے اس لئے ہم اس میں داخل نہ ہو سکے۔ٹھٹھہ مایوسی واُداسی میں ڈوبا نظر آتا ہے، چونکہ ہم نے بہت تھوڑا مشاہدہ کیا اور مزید یہاں کچھ تھا بھی نہیں اس لئے ہم بہت پریشان کن حالت میں واپس اپنی کشتیوں میں آ گئے۔اس جگہ کے گردونواح میں بہت سے باغات ہیں۔جن میں ڈھیروں سیب لگے ہوئے ہیں۔گوکہ وہ سب چھوٹے سائز کے ہیں لیکن ان کی خوشبو بہت اچھی ہے۔ان کی قیمت اس طرح سے تھی کہ ایک روپے میں چارسودانے اُٹھا لئے جائیں۔میرا خیال ہے کہ ٹھتھہ کی آبادی سات ہزار افراد سے بھی زیادہ ہے۔یہ شہر اب اس حیثیت کا نہیں رہا جیسا کہ یہ مسٹر کرو(Mr. Crowe) کے عہد میں تھا۔(ای ڈلہوسٹ،صفحات 35-234)

(10)

ٹھٹھہ خواہ وہ قدیم ترین پٹالہ (Pattala) یا پھر میناگرہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ دریائے سندھ سے تین میل کے فاصلے پر ہے اور وادی سے اوپر کی جانب بڑھتا دکھائی دیتا ہے، اور دور سے بہت خوبصورت معلوم پڑتا ہے۔ یہاں کی گلیاں، تنگ، گندی اور بے قاعدہ ہیں۔لکڑی اور اینٹوں کے بنے ہوئے گھر بیس سے تیس فٹ کے درمیان اونچے تھے۔نیز اپنی سپاٹ چھتوں کی وجہ سے چوکور برجوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہاں کے باشندے گرمیوں کے موسم میں انہیں کے اوپر کھلی فضا میں سونے کے عادی ہیں۔گوبر کے اوپلے آگ جلانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور انہیں بچے اور عورتیں تیار کرتے ہیں جو دیواروں کے اوپر تھوپ دیئے جاتے ہیں۔

اس جگہ چند ایک ہی مساجد ہیں جو پتھروں کی بنی ہوئی ہیں اور ان پر نقش ونگار بھی ہوئے ہیں لیکن وہ بھی شہر کی طرح ویران اور ملگجی ہیں۔ یہاں پر اب اس وسیع تجارت کا کوئی نشان باقی نہ رہا ہے جو پہلے کبھی عروج پر تھی۔ ریشم اور سوت سے بنی ہوئی لنگیاں سونے چاندی سے تیار کی جاتی تھیں۔ان مصنوعات کا ملتان کی مصنوعات سے مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔جو تھوڑی بہت لنگیاں اب یہاں پر بنتی ہیں وہ امیر لے لیتے ہیں، اور اتنی کم رقم دیتے ہیں جو جولاہوں کی گزراوقات کے لئے بس کافی ہو۔ یہاں کے باشندے تقریباً دس ہزار ہیں وہ لمبے چوڑے لباس پہنتے ہیں اس کے علاوہ وہ سندھی ٹوپیاں یا پگڑیاں بھی

استعمال کرتے ہیں۔عورتیں لمبے لمبے سوتی کپڑے پہنتی ہیں جو زمین تک آتے ہیں۔ ہر جانب غربت اور گندگی چھائی ہوئی ہے۔ہم نے پوری لمبائی تک شہر کا دورہ کیا اس وادی سے بھی گزرے جو اونٹ یا بیل سے چلائے جانے والے رہٹ کے ذریعہ کنویں کے پانی سے سیراب ہوتی ہے۔ یہ بہت زرخیز وادی ہے اور یہاں پر اناج اور کپاس پیدا ہوتی ہے۔(ایل۔اورچ۔II،صفحات 4-103)

(11)

تمام کتب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے ٹھٹھہ بڑا اہم شہر تھا اور کبھی حکومت کا مرکز بھی رہا تھا۔ برسوں پہلے یہاں کے سوت، ریشم اور دودھیا ٹائیلوں کی ہندوستان کے ہر شہر میں مانگ تھی۔اس وقت یہ پوری کائنات میں سب سے زیادہ عیاش شہر تھا۔

کھلم کھلا گلیوں، عوامی مقامات اور میلوں میں بد سے بدتر جرائم سرزد ہوا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ ضرب المثل مشہور ہوگئی کہ ''ٹھٹھہ سے آنے والا شخص کبھی اچھا نہیں ہوتا۔'' پھر اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہونے لگا جس سے سرکاری یا نجی جرم سرزد ہو۔ ہماری فتح سندھ سے تھوڑا ہی عرصہ قبل خود سندھیوں کی جانب بھی ٹھٹھہ والوں کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔اس شہر اور اس کے گردونواح میں لاتعداد خوبصورت مساجد، مقبرے اور عمارتیں پھیلی پڑی ہیں لیکن ساری بہت بُری حالت میں ہیں ہم سب سے بڑی عبادت گاہ میں داخل ہوئے تو ہمارے داخل ہوتے ہی موقع پر موجود ایک افسر نے ہم سے اپنے جوتے اُتارنے کو کہا۔ چند سنہری سِکّوں نے اس بوڑھے کو خاموش کر دیا مگر ہمیں اندر کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہ ملا۔ البتہ وسط میں موجود گنبد اس عمارت کا سب سے خوبصورت حصہ تھا۔(ایچ۔جیمز۔I،صفحات 23-22)

(12)

''ٹھٹھہ شہر بہت سے شہروں کی جگہ ہے۔'' یہ بات بہت مشہور ہے۔ قابل دید مقامات کی سیر کی غرض سے ہم نے اپنی (penates) پانی کے کنارے لگائیں جو شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً ایک میل دور مکلی پہاڑیوں کے نیچے تھا۔اب ہم کراچی سے تقریباً ستر میل دور تھے اور اس ڈیلٹا کے آخری سرے پر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر تھے، اور سابقہ ریگستان سے باہر نکل آئے تھے۔

زیریں سندھ کا قدیم دارالحکومت بلاشبہ اب اپنی شان و شوکت کھو چکا تھا۔ دو لاکھ اَسّی ہزار پر

مشتمل آبادی اب صرف پانچ ہزار تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔اس کا تیس میل کا رقبہ اب محض دس میل تک رہ گیا تھا۔اس کی پانچ ہزار کرگھیاں (Looms) جہاں سے بننے والی شالیں اور سوتی کپڑے پورے وسطی ایشیا میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں وہ اب مشکل سے درجن بھر ہی رہ گئی تھیں،اور اس شہر کے چار سو مدرسوں میں سے اب کوئی بھی موجود نہ ہے۔اورنگ زیب بادشاہ (یہ مسجد شاہجہاں کی ہے) کی مسجد معہ اپنے میناروں اور بلند و بالا کھنڈرات کے آج بھی مغل جانشین کی عظمت رفتہ کی گواہی دیتی ہے مگر اردگرد، دور نزدیک سب کچھ کھنڈر بن چکا ہے۔یا پھر نیم تباہ شدہ حالت میں موجود ہے۔بعض گلیاں تو کچی اینٹوں سے بند پڑی ہیں۔ یہاں کے باشندے وقفے وقفے سے کراچی اور حیدرآباد جیسے بڑھتے ہوئے شہروں میں جارہے ہیں اور ہر سال یہاں کی آبادی کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہمیں آج سیاحوں کے بنگلے پر کھانا کھانا چاہئے یہاں پر بوڑھا پرتگیز باورچی موجود تھا۔ یہ عمارت ـــــــ جو کمپنی بہادر کا پرانا کارخانہ ہے ـــــ کافی کشش والی ہے۔اس میں بڑا سا ہال ہے۔ کمروں کی بالائی منزل جو چوکور نظر آتی ہے اس کے اردگرد لکڑی کے کھیرے لگے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اس کی مشابہت کسی بھی طرح سے انگریزی سرائے سے نہیں ہوسکتی۔کمرے کافی بڑے اور اونچے ہیں۔ان میں سے اکثر تباہ حال ہیں اور ان کی خوفناک چھتوں میں بڑے بڑے سوراخ ہیں۔لمبی سی سیڑھیاں سیمنٹ کی بنی ہوئی سپاٹ چھت تک لے جاتی ہیں جہاں سے ہمیں کچھ حیرت انگیز مناظر نظر آتے ہیں۔بل (Bull) صاحب! سندھی لوگ اپنی چھتوں پر سو رہے ہیں اور گھریلو مقاصد کے لئے ان چھتوں کو بڑی اچھی طرح سے استعمال کر رہے ہیں۔

دیکھو! وہ لڑکیوں کا ایک گروہ اپنے پسندیدہ کھیل کھینو (Kheno) سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ان کے سر ننگے ہیں اور ان کی ململ کی قمیضیں زیادہ تراشی ہوئی نہیں ہیں، وہ دوڑتی ہیں، چلاتی ہیں،اور خوشی سے ایک دوسرے کو دھکے دیتی ہیں، بالکل اسی طرح سے جس طرح کہ انگریزی ہائیڈنز (hoydens) کی بیویاں کرتی ہیں۔

تھوڑا ہی آگے،ایک مصروف گھریلو عورت رات کو سونے کے لئے آرام گاہیں (یعنی پلنگ) بچھا رہی ہے۔یہ ایک مصنوعی سی نشست ہے۔اس میں چار ٹانگوں پر مشتمل لکڑی کے فریم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔جیسے کہ تمہارے خیمے کے بستر ہوتے ہیں،اس میں فیتے کی جگہ عمدہ رسیاں لگائی گئی ہیں ان پر عام سی رضائیاں پڑی ہوئی ہیں۔

ادھر ذرا اس گروہ کو دیکھو جو گھر کے آگے نماز ادا کر رہا ہے۔ایک بوڑھا ماچس جلانے کے طریقے بتا رہا ہے۔قبرستان میں بہت سی قبریں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یا پھر زلزلوں سے چیخ گئی ہیں اور اس طرح سے گری ہوئی ہیں کہ دور سے بڑے بڑے پتھر پڑے معلوم ہوں۔ ایک قبر کے گیند پر کبوتروں نے اپنا کابک (یعنی گھر) بنا لیا ہے ان سب چیزوں سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کبھی آدمی رہتے ہوں گے۔

پہاڑ کی چوٹی کے ساتھ سواری کرتے ہوئے اپنے خیموں کی جانب جاتے رواں دواں ہم اس جگہ سے گزرے جہاں پر چند برس قبل ہی کچھ ناراض فوجی رجمنٹوں نے قیام کیا تھا،اس عمارت کا ہر ٹکڑا غائب ہو چکا تھا۔ زیریں سندھ میں اس طرح کا سامان بالخصوص لکڑی عرصہ دراز سے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ البتہ ہم ان گھروں اور خندقوں کی بنیادیں تلاش کر سکتے ہیں جوان کے اردگرد ہوتی ہیں۔ بارش اتنی کم ہوئی ہے کہ ان پختہ نشانات کو ختم کرنے کے لئے ابھی کئی موسم درکار ہوں گے۔

اوراب ٹھٹھہ کے شہر اعظم کا ذکر کرتے ہیں:

میں یہ مشاہدہ کر سکتا ہوں کہ ''موت کے شہر'' کے نام سے صرف خاص مصر میں ہی بعض مقامات مشہور ہیں۔ اکثر بڑے مقامات پر لاکھوں آثارات ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ خاندانوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے اپنے رشتہ داروں کو ایک جگہ دفن کرتے ہیں۔ تاکہ مرحومین کی ارواح آپس میں ''روحانی بات چیت'' کرنے سے فائدہ اُٹھا سکیں،اور پھر لواحقین کو بھی وہ قبر تلاش کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی کہ جس پر وہ مذہبی رسوم ادا کرنا چاہیں جیسے تلاوت قرآن یا فاتحہ پڑھنا۔

لیکن یہ قبر جیسا کہ تم دیکھتے ہی سمجھ لو گے۔ خاص اہمیت کی حامل ہے۔ جام تماچی (Jam Tamachi) یعنی جس کی قبر پر حال ہی میں ایک ممتاز صوفی کے حکم سے پہاڑوں پر مسجد بنائی گئی ہے۔ ان پہاڑوں کو مکلی (Mukali) کہتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے ہدایت دی کہ اس وقت سے یہ سنگ تراشی کی مقدس جگہ رہے گی تاکہ بھاگڑ کریک (Bhagar Creek) میں پیر پٹھا (Pir Puttah) کا مقابلہ کیا جا سکے جو پہلے سندھیوں میں بڑا مشہور تھا۔

حال ہی میں ایک اور ممتاز صوفی، میاں ملوک (Mian Maluk) کو اسی مخصوص امتحان کے ذریعہ دریافت کیا گیا ہے کہ پرانے وقتوں میں مکلی کی پہاڑیوں کو حضرت محمدؐ کے نواسگان حسنؓ اور حسینؓ کی زیارت کا شرف رہا ہے۔ایک غافل چرواہا اپنی بھیڑوں کو چٹانوں کے اوپر لے جاتا

ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا غصہ روز بروز بڑھتا چلا گیا کہ یہ جانور ایک خاص جگہ پر سینگ لگانے سے باز رہتے ہیں۔اس کے بعد اس نے ایک خواب دیکھا جسے وہ سمجھا نہیں۔لیکن جب وہ خواب اس نے دو پرہیز گار اور نیک آدمیوں کو بتایا تو انہوں نے اس جگہ پر رکھ کر نشان لگا دیئے۔ٹھٹھہ کے ایک گورنر نے اس کے گرد دیوار کھڑی کر دی۔ایک اور شخص نے اس پر گنبد لگا دیا، اور یوں یہ آہستہ آہستہ ایک خانقاہ کی شکل اختیار کر گیا۔

بڑے لوگوں نے مکلی کے پہاڑوں پر دفن ہونے میں بہت جلد بازی کی۔ یہاں پر صوفیوں اور مجاوروں کی قبروں کی تعداد تین ہزار ہے جن میں 74 کے غیر فانی نام ہیں۔کئی کے قصے بھی ہیں مگر وہ تمہارے لئے دلچسپ نہیں ہیں۔

کچھ فاصلے سے منظر اور ہی نظر آ رہا ہے۔اس پتھریلی چٹان کی چوٹی جو شہر ٹھٹھہ سے نظر آتی ہے، وہاں پر ایک بہت بڑی عیدگاہ ہے۔ بڑی لمبی دیوار ہے اور تھوڑی سی سیڑھیاں نیچے کی جانب وہاں چلی جاتی ہیں جہاں پر امام کھڑا ہوتا ہے۔ لمبے لمبے مینارے بھی ہیں۔اس کے پیچھے ہی مقبرے اور قبریں ہیں، ان میں سے بہت سی قبریں زلزلے سے ٹوٹ گئی ہیں۔ بہت سی وقت کے ساتھ ساتھ تباہ ہو گئی ہیں۔ البتہ ان میں سے بعض کو مرحومین کی اولادوں اور مریدوں نے حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ چمکتے گنبد، محرابیں، برجیاں، دروازے وغیرہ وغیرہ سب ہی تو کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے ہیں۔البتہ بعض قبروں کے کتبے اسی طرح سے صاف ستھرے کھڑے ہیں اور تب تک رہیں گے کہ جب تک زمین بوس نہ ہو جائیں، کسی کسی پر گھاس بھی اُگ آئی ہے اور کہیں درخت بھی لگا ہوا ہے جو ہوا کے زور سے جھک گیا ہے اور اس کی شاخیں خالی ہیں بہت سے سرداروں اور سیدوں کے مقبرے برسوں کی محنت سے تیار ہوئے ہیں، بعض میں قبر کا کتبہ چھوٹے چھوٹے تعویذوں سے دائرہ زد کیا گیا ہے۔ اس میں ستونوں کی ایک یا دو قطاریں بھی ہیں اس کے ساتھ ایک کٹہرا اور چبوترہ ہے جو چاروں جانب سے تھوڑا تھوڑا کھلا ہوا ہے۔ دیگر قبروں پر چھوٹے پتھروں کی دیواریں ہیں جن کی وجہ سے چوکور ہال سا بن جاتا ہے اور ان میں داخلے کے دروازے موجود ہیں جو مختلف دروازوں تک لے جاتے ہیں۔بعض قبروں پر بھاری سنگ مرمر کی چھتیں ہیں جن کو شاندار ستونوں سے سہارا دیا گیا ہے اور اس کے ذریعے ایک ہی طرح کی بہت سی قبروں کو زیر سایہ کر دیا گیا ہے۔ بہت سی قبریں ان رنگین اینٹوں اور ٹائیلوں سے تیار کی گئی ہیں جو ہالینڈ سے آتے تھے۔ یہ مقبروں کی جگہ کسی گھر کی طرح بنی

ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب صاف و شفاف آسمان سے مشرقی سورج کی کرنیں اس پورے منظر پر پڑتی ہیں تو زمین کے اس ٹکڑے کو بہت متاثر کن بنا دیتی ہیں۔

ہم پہاڑی عبور کر گئے۔تھوڑی دیر تک یہاں آوارہ گرد فقیر، اجنبی لوگوں کو بڑی حیرت سے دیکھتے رہے، یا پھر کوئی پرایا (اجنبی) کتا ہمارے ادھر آنے پر بھونکنے لگتا، اور پھر اپنی ہی آواز کی گونج سے ڈر کر بھاگ نکلتا۔ جب ہم کسی مقبرے میں داخل ہوتے تو ہمارے قدموں سے زمین پر پیدا ہونے والے شور کی وجہ سے سینکڑوں ہاری پریشان ہوجاتے۔

بے شک کسی چیز کا قریب سے معائنہ بڑا اچھا لگتا ہے۔جس سجاوٹ سے قبروں کو مزین کیا گیا ہے اس کی تفصیل کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ ہر قبر اپنی عظمت میں لاثانی ہے۔اس کی دیواریں اور دروازے بڑی محنت سے بنائے گئے ہیں۔(آر۔ برٹن۔اداس وادی۔I، صفحات 102-101)

حیدر آباد

(1)

حیدر آباد کی قلعہ بندی، اونچی فصیل اور اونچے قلعہ پر مشتمل ہے جس پر چند بہت بھاری توپیں بھی نصب کی گئی ہیں۔ دیوار بہت موٹی ہے لیکن اسے زمین میں بہت نیچے گہرائی تک لے جانے کی وجہ سے کافی سہارا ملا ہوا ہے۔ یہ کچھ تو اصل ہے اور کچھ ستونوں کی شکل میں ہے جس کی وجہ سے اس کا توڑنا مشکل ہے۔قلعہ تو پورا ہی اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور بہت موٹا ہے۔ یہ دائرے کی شکل میں ہے اور ایک سو گز ڈائیا میٹر سے زیادہ نہ ہے۔قلعہ کی ایک جانب خشک خندق ہے اور دوسری جانب گہرا میدان ہے۔ دیوار کا محیط ایک میل کا تین چوتھائی حصہ ہے اس میں نہ تو کوئی قابل دید حصہ موجود ہے اور نہ ہی اس کی بیرونی سطح پر کوئی اچھی طرز کا بناوٹی کام کیا گیا ہے۔(این۔کرو، صفحہ 26)

(2)

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے حیدر آباد اس جزیرے کی مشرقی طرف پر واقع ہے جو سندھ اور پھلیلی کے دھاروں سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ یہ عرض بلد 25.22 شمالی اور طول بلد 68.41 میں ہے۔ سندھ قلعہ سے چار میل جنوب مغرب میں بہتا ہے اور پھلیلی اس ڈھلان کے دامن سے ایک ہزار قدم

کے فاصلے پر ہے جس پر یہ بنا ہوا ہے لیکن اس کی ایک کھاڑی میں کشتیاں قلعہ بندیوں سے چند گز کے فاصلے تک پہنچ سکتی ہیں بشرطیکہ دریا بھرپور ہو۔ یہ قلعہ موجودہ امیروں کے بڑے بھائی میر فتح علی نے بنوایا تھا اور سندھی اسے ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں لیکن یہ ایک یورپی دشمن کے حملے کو نہیں روک سکتا۔ قلعہ بندیوں کی شکل بالکل بے قاعدہ ہے کیونکہ یہ پہاڑی کے پیچ وخم اور زاویوں کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ دیواریں اینٹوں کی ہیں، پندرہ سے تیس فٹ اونچی اور ان کی بنیادیں پہاڑوں کی چوٹی کے کناروں پر ہیں، جہاں یہ خوب موٹی اور ٹھوس ہیں لیکن اوپر کی طرف اتنی پتلی ہوتی جاتی ہیں اور روزنوں اور سوراخوں سے اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ نشانے پر گولی ان کے کسی حصہ کو گرا سکتی ہے اور فصیل دار گولہ باری کی زد میں آسکتے ہیں۔ گول مینار تین چار سو قدموں کے وقفے پر اردگرد بنے ہوئے ہیں اور صحیح مقامات پر ایستادہ ہیں اور ڈھلوان پہاڑی کے ہمراہ ایک پُرشکوہ منظر پیش کرتے ہیں لیکن پہاڑی بہت نرم اور پھسپھسے پتھروں کی ہے جو آسانی سے ٹوٹ سکتے ہیں اور ایسی ڈھلوان ہے کہ دیوار کے کسی شگاف کا کوڑا کرکٹ اس پر ٹھہر سکتا ہے اور حملہ آور فوج کو آرام سے کھڑے ہونے میں مدد دے سکتا ہے۔

شمال کی طرف ایک خشک خندق ہے جس پر ایک پل بنا ہوا ہے جو دروازے تک آتا ہے اور اس پر ایک بہت بڑا برج بنا ہوا ہے۔ حیدرآباد کی قلعہ بندیوں پر کوئی ستر توپیں نصب ہیں لیکن دروازے کے برج کی آٹھ دس بھاری بھرکم توپوں کے سوا باقی سب چھوٹی چھوٹی اور بیکار ہیں۔ پیٹھ یا مضافات قلعہ کے شمال میں ایک بلند قطعہ زمین پر ہے اور ڈھائی ہزار مکانات پر مشتمل ہے۔ آبادی دس ہزار ہے۔ قلعہ کے اندر بھی قریباً اتنے ہی مکان ہیں لیکن آبادی آدھی بھی نہیں اور وہ سب سپاہیوں کے ہے۔ حیدرآباد کی اہم مصنوعات میں مختلف قسم کا اسلحہ شامل ہے جیسے توڑے دار بنادیق، نیزے، تلواریں وغیرہ اور کشیدہ کردہ پارچات۔ مضافات کی آبادی کا پانچواں حصہ اسلحہ گری پر گزراوقات کرتا ہے اور ان کی صناعی بعض اوقات تو اتنی عمدہ ہے جتنی یورپی صناعی۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

(3)

حیدرآباد شمال اور جنوب کی جانب پھیلا ہوا ہے، اور اس کی ڈھلان دریا کی جانب ہے۔ اسی جانب گزشتہ اور موجودہ حکمران خاندانوں کے مقبرے ہیں جن میں غلام شاہ کلہوڑہ اور میر کرم علی بھی شامل ہیں۔ گھر زیادہ تر مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ بازار ایک لمبی سی گلی میں واقع ہے جو غالباً شہر کی لمبائی

بھی بن جاتا ہے۔ بظاہر یہاں پر اچھا خاصا کاروبار ہوتا ہے اور شام کو تو ہندوؤں کے جمع ہوتے ہی کاروبار میں تیزی آ جاتی ہے۔ شہر کے جنوب میں قلعہ ہے جو ایک بڑی لمبی مگر بے قاعدہ عمارت ہے۔ اس کی دیواریں بہت مضبوط ہیں اور برجیاں کافی اونچی ہیں۔ اسے پکی اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں کڑوں کے سائز بنے ہوئے سوراخ اس عمارت کو اور بھی زیادہ منفرد اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ بہت سے امیر یہاں رہتے ہیں۔ اجنبی لوگوں کو داخلے کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ قلعہ کا پرانا نام نیرنگ (Nirang) تھا لیکن شہر بالکل نیا ہے۔ زیریں سندھ کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے یہ آخری عہد کے کلہوڑہ حکمرانوں کے دور میں نمایاں حیثیت حاصل کر گیا۔ شروع کے حکمران خدا آباد (Khodabad) شہر میں رہا کرتے تھے جس کے آثار آج بھی سہون کے شمال میں موجود ہیں۔ (سی۔ میسن۔ I، صفحات 63-462)

(4)

سندھ کے دارالحکومت کے قریب نظارہ کافی مختلف ہے اور خوبصورت ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر تن آور درخت ہیں۔ دور پہاڑیاں بھی پس منظر کو اور اُجاگر کر دیتی ہیں۔ نیچے کے علاقوں کی نسبت دریا یہاں پر کافی چوڑا ہو کر بہتا ہے۔ یعنی تقریباً 830 گز چوڑا ہے۔ اس کے وسط میں ریتیلا خشک ٹکڑا ہے جو اکثر پانی سے چھپا رہتا ہے۔ وہ جزیرہ جس پر حیدر آباد واقع ہے وہ بنجر ہے اور پتھریلی اور چٹانی نوعیت کی زمین پر کھڑا ہے۔ بلکہ قابل کاشت علاقے بھی مشکل سے ہی کاشت کئے جا سکتے ہیں۔

دارالحکومت کے بارے میں مشکل سے ہی مزید کچھ باتیں بتا سکتا ہوں کیونکہ ساری باتیں مختلف سفرناموں یا کتب میں درج ہیں۔ یہاں کی آبادی بیس ہزار سے بھی کم ہے جو مٹی کے بنے ہوئے گھروں یا جھونپڑوں میں رہتی ہے۔ خود امیر کی رہائش گاہ بھی بہت خراب جگہ پر ہے اور کافی بری حالت میں ہے۔ شہر کی طرح قلعہ بھی چٹان پر قائم ہے۔ مئوخر الذکر محض ایک خول کی طرح کا ہے جو بعض اطراف سے خندق سے گھرا ہوا ہے۔ جو دس فٹ چوڑی اور آٹھ فٹ گہری ہے۔ اس کے اوپر لکڑیوں کا پل ہے۔ دیواریں پچیس فٹ اونچی ہیں اور اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ نیز تیزی سے انحطاط پذیر بھی ہیں۔ حیدر آباد کوئی مضبوط شہر نہیں ہے اور اسے بڑی آسانی سے فتح کیا جا سکتا ہے۔ قلعہ کے

وسط میں بہت بڑا برج ہے جہاں سے اردگرد کے سارے علاقے کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر سندھ کا بہت بڑا خزانہ جمع ہے۔ حیدرآباد سے پھلیلی (Fulailee) دریا کافی دور ہے۔ البتہ ایک نہر اس جانب آتی ہے۔ مگر جب ہم نے اپریل میں شہر کا دورہ کیا تو وہ خشک تھی۔ حیدرآباد کے نظارے میں دارالحکومت کے علاوہ اردگرد کا بھی سارا شہر نظر آتا رہتا ہے۔ (اے۔ برنس۔ III، صفحات 50-49)

(5)

یہ شہر ایک ایسے چھوٹے سے جزیرے پر آباد ہے جو دریائے سندھ اور دریائے پھلیلی کی وجہ سے بن گیا ہے۔ دریائے سندھ شہر سے تقریباً 3 میل دور ہے اور مئوخرالذکر تقریباً نصف میل دور ہے۔ شہر اور قلعہ دونوں ہی ایک نشیبی پتھریلے ٹیلے پر قائم ہیں جو کسی بھی جانب سے 35 فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہے۔ شہر کے جنوب میں قلعہ کسی بے قاعدہ مخمس (پانچ اطرافی عمارت) کی شکل میں پکی اینٹوں کے دیواروں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں گول اور چوکور برجیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ دیواریں چالیس فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہیں اور پکی اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی ہیں البتہ اوپر سے مٹی لیپی گئی ہے۔ وہ چٹان کے کنارے سے ہی اُٹھالی گئی ہیں اور بہت سی جگہوں سے انحطاط پذیر ہیں۔ نصف گھنٹے کی گولہ باری سے اس کا کوئی بھی حصہ توڑا جا سکتا ہے جو اس پر قبضہ کرنے کی صورت میں راستے کا کام دے گا۔ قلعہ کے اندرونی حصے پر امیروں اور ان کے خاندانوں کا قبضہ ہے۔ اس کے وسط میں ایک کوٹھری نما عمارت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سندھ کے خزانے محفوظ ہیں۔ قلعہ سے تقریباً 600 گز کے فاصلے پر مشرقی جانب دریائے فلیلی ہے۔ مغرب کی جانب ولی محمد کا ٹنڈہ (ٹنڈو ولی محمد) اور دریائے سندھ ہے۔ جنوب کی جانب کھلا میدان ہے جہاں سے قلعہ پر باآسانی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس جانب سے حملے کی صورت میں مخالف توپ خانے کو ان لوگوں کی جانب سے کوئی تعاون نہ مل سکے گا کہ جن لوگوں کے گھر قلعے کے شمال میں واقع ہے، فوجی نقشے پر نظر ڈالتے ہی وہ تمام منظر زیادہ بہتر طور پر عیاں ہو جائے گا جو میں نے بیان کیا ہے؟ شہر کے ایک جانب خندق ہے جو 30 فٹ چوڑی اور 20 فٹ گہری ہے۔ اس پر ایک خستہ حال لکڑی کا پل بنا ہوا ہے جو قلعہ میں داخلے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس میں داخل ہونے سے قبل چار دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر حملہ کر دیا جائے تو جنوبی دیوار کو توڑ کر گرانا بہت آسان ہوگا اور اس میں کافی وقت اور محنت بھی بچ جائے گی۔ پھر اس کی

مرمت بھی آسان ہوگی۔

حیدرآباد کا شہر بھی اسی بڑی سی چٹان پر ہے جس پر قلعہ ہے۔اس میں تقریباً دس ہزار گھر ہیں۔ جو شخص ان کو ایک نظر دیکھے گا وہ ان کا اس سے بہت کم اندازہ لگا سکے گا جتنا کہ وہ ہیں مگر تقریباً ہر گھر میں یا پھر زیادہ تر گھروں میں بڑے بڑے ہال ہے۔گلیاں بہت تنگ اور گندی ہیں۔ یہاں کا بازار قلعہ کے دروازے سے شروع ہو کر شمال میں تقریباً ڈیڑھ میل تک چلا جاتا ہے۔تمام گھر مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ان کی چھتیں سیدھی ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس شہر کی آبادی پچیس ہزار ہے اور اس میں سے ایک تہائی ہندو ہیں____ باقی لوگ بلوچی اور سندھی ہیں۔(ای۔ڈلہوسٹ۔سفر نامہ،صفحات 1-200)

(6)

شہر کے جنوب میں حیدرآباد کا قلعہ ایک قدرے نشیبی سطح کی پتھریلی پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ اپنی جسامت میں کسی بے قاعدہ مخمس عمارت کی طرح ہے۔اس میں مضبوط اور موٹی دیواریں ہیں جن کے ساتھ برج بھی بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب پکی اینٹوں اور چونے سے بنائے گئے ہیں۔ دیواریں چٹان کے بالکل کنارے سے اُٹھائی گئی ہیں۔اکثر جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہیں اور کھنڈر کی شکل میں یہ چالیس فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہیں آدھے یا ایک گھنٹے کے اندر ان کو چند ایک جدید توپوں کی مدد سے توڑا جا سکتا ہے۔قلعہ کے اندرونی حصے پر امیر اور ان کے خاندانوں کا قبضہ ہے اور اس کے بیچ میں کسی فوجی رسالے کی پناہ گاہ بنی ہوئی ہے۔جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سندھ کے خزانے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قلعہ کے اندر مختلف سائز کی 140 توپیں ہیں جن میں سے 60 زیر استعمال ہیں۔ایک بار میر مراد علی خان 250 ہندوستانی سپاہی بھرتی کئے تھے لیکن جب ان سے تنخواہ کی ادائیگی کا وعدہ پورا نہ ہو سکا تو وہ سب ہی اسے چھوڑ گئے۔سندھ کے قلعہ کے بارے میں میری یہ اطلاع ان ہی سپاہیوں میں سے ایک کی فراہم کی ہوئی ہے۔ جو اس وقت بھی میری ملازمت میں ہے۔اس نے دو برس حیدرآباد میں اور چار برس خیر پور کے دیجی قلعہ میں خدمات سرانجام دی ہیں۔(ای۔ڈلہوسٹ۔یادداشتیں،صفحہ 13)

(7)

یہاں پر تقریباً پچیس ہزار باشندے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہ تعداد کچھ زیادہ ہی بیان کر دی گئی ہے۔شہر کو چھوٹی سی مٹی کی دیوار سے گھیرا گیا ہے جو اب کئی جگہوں سے کھل چکی ہے،اور وہ قلعہ جہاں پر امیر رہتے ہیں وہ K.E.Angle پر واقع ہے۔اپنی حالت کے حوالے سے شہر قابل برداشت حد تک صاف اور کھلا ہے۔قلعہ کو ایک اونچی دیوار نے گھیر رکھا ہے جو اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اور کافی کمزور ہے۔ وہ شہر کی وسعت کی وجہ سے نامکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر کافی بھاری فوج تعینات ہے۔خندق خشک ہو چکی ہے جو کافی تنگ بھی ہے۔ یہ 200 یا 300 گز تک پورے علاقے کو دشمن سے محفوظ رکھتی ہے۔امیروں کے گھر اندر سے کافی خستہ حالت میں ہیں اور کوئی کمرہ ایسا نہیں ہے جو تیس فٹ سے زیادہ لمبا ہو۔دروازے اور کھڑکیاں بغیر محرابوں کے سادہ سی بنادی گئی ہیں۔فرنیچر بہت بھدا ہے۔حیدرآباد کا بازار کافی گھٹیا ہے۔اگرچہ یہاں پر ملکی اشیاء کی طلب و رسد کی کافی کمی ہے مگر پھر بھی یہاں پر یورپی اشیاء نظر نہیں آتی ہیں ماسوائے چند ایک سفید کپڑوں کے یا رنگین چھینٹ کے کپڑوں کے۔(ڈبلیو۔پوٹنگر،صفحہ 27)

(8)

شہر چھوڑنے سے قبل ہم نے اس کے اطراف میں موجود مقابر کا دورہ کیا۔جس پہاڑی پر شہر واقع ہے وہ تقریباً ڈیڑھ میل لمبی اور سات سو گز چوڑی ہے۔اس کا رخ شمال سے مشرق اور جنوب سے مغرب کی جانب ہے اور سطح سمندر سے تقریباً 80 فٹ بلند ہے۔اس ٹیلے کے شمالی سرے پر جو مقبرے ہیں ان کے بالکل مقابل میں قلعہ اور شہر ہیں۔حکمران خاندان کے مرحوم اراکین کی قبریں ایک ہی جگہ پر ہیں اور سابقہ خاندان سے الگ کر کے بنائی گئی ہیں،موجودہ تالپور خاندان میں سے میر کرم علی خان کی جسمانی ساخت بہت اچھی تھی۔اس کی زندگی کی یہ اچھی ساخت، جو اس کے ساتھ ہی قبر میں چلی گئی۔ اس کی قبر جو کہ عمارت کی شکل میں ہے اور ہر کونے پر سے اُبھری ہوئی ہے۔اس میں مرکزی گنبد ہے۔ لیکن کلہوڑہ خاندان کے غلام شاہ کا مقبرہ جسے تالپوروں نے اُجاڑ کر رکھ دیا ہے، دیگر تمام عمارتوں سے بڑھ کر ہے۔اس کے خدوخال کرم علی کے مقبرے سے ملتے جلتے ہیں البتہ اس میں کناروں کی برجیاں

نہیں ہیں۔عمارت کے اندر سنگ مرمر کی لکیریں ہیں جو بڑے اچھے طریقے سے پچی کاری سے سجائی گئی ہیں اوران پرقرآن پاک کی آیات کندہ ہیں۔کلہوڑوں کے مقابر کو ہمیشہ نظرانداز کیا گیا ہے۔لیکن حکمران خاندان کے مقبروں کی وقتاً فوقتاً مرمت کی جاتی رہی ہے۔(جے۔ووڈ،صفحہ 15)

(9)

میں حیدرآباد میں دس دن ٹھہرا اور سکھر و کراچی کی نسبت یہاں کے زیادہ معتدل اور ٹھنڈے موسم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میں ان لوگوں کی حمایت کروں گا جو زیریں سندھ میں صرف حیدرآباد کو ہی پُرلطف جگہ قرار دیتے ہیں۔ سعدی نے درست کہا ہے کہ ___ جو لوگ حالت عرفات یا اعراف (Purgatory) میں ہیں وہ جنت کو بہشت (Heaven) خیال کرتے ہیں جبکہ وہ جو اس سے باہر ہیں ان کے نزدیک تو حالت اعراف ہی جنت ہے۔ سیہون پہنچنے کے بعد جو سمندری ہوا کے جھونکے لگنا ختم ہو گئے تھے وہ اب حیدرآباد میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں کا قلعہ کوئی بڑا سا گھر نظر آتا ہے۔ جو دریائے سندھ سے تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر ہے۔ اس کی مشرقی جانب حیدرآباد تک ایک کھلا میدان ہے اور مغربی جانب دریا ہے اور جنوبی جانب باغ اور اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ زیریں سندھ کے دیگر شہروں کی نسبت یہ شہر قدرے وسیع اور کافی آباد ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ قلعہ کے علاوہ اس کی تمام عمارتیں کسی اور جگہ نظر آنے والی عمارتوں کی طرح بڑی نہیں ہیں۔ گھر عموماً مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔مگر انہیں مٹی کے گھروندوں کی طرح آسانی سے گرایا نہیں جا سکتا۔ دیواریں کافی مضبوط اور موٹی ساخت کی ہیں۔کئی تو متعدد منازل کے برابر اونچی ہیں۔قلعہ کسی بے قاعدہ مخمس کی طرح ہے۔ اس کے اردگرد پکی اینٹوں کی دیوار ہے نہ کوئی خندق بنائی گئی ہے اور نہ ہی کوئی بیرونی بناوٹ کا کام کیا گیا ہے۔کئی مقامات پر سے یہ شکستہ حال ہے صرف امیروں کا خاندان اس کے اندر رہائش پذیر ہے۔ اس کے وسط میں ایک بڑا سا برج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی اس میں امیروں کے خزانے حفاظت سے رکھے جاتے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مشرقی نوابوں کی دولت کے بارے میں ایسی کہانیاں محض من گھڑت ہوتی ہیں تاکہ ان کی شہرت قصے کہانیوں میں اس دولت کی وجہ سے بڑھتی رہے۔(ڈبلیو۔جے۔ایسٹ ویک،صفحات 7-206)

(10)

شہر کا نظارہ بڑا دلکش ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے پیڑوں کے جھنڈ پر جا کر رک گئے۔ بائیں جانب ایک پہاڑی ہے جہاں پر مقامی قلعہ بندی قائم ہے۔ یہاں پر شاہ مکی کا مقبرہ بھی ہے۔ اس کے نیچے کافی گھر بنے ہوئے ہیں۔ ہماری دائیں جانب قبرستان ہے جو چوکور احاطے میں ہے۔ اس کی دیوار کے اوپر کی جانب اُٹھی ہوئی کئی بلند قبریں نظر آتی ہیں۔ سامنے کی جانب ایک سڑک ہے جو شہر کو حفاظتی نقطہ نظر سے قلعہ سے جدا کرتی ہے اور پہاڑی کے اوپر تک چلی جاتی ہے۔

حیدر آباد جو پہلے سندھ کا دارالحکومت تھا، یہ ایک چھوٹے سے جزیرے کے وسط میں ہے جو دریائے سندھ اور پھلیلی کی مختلف شاخوں کی وجہ سے بنا ہے۔ شہر، سطح زمین سے چند فٹ اونچی چٹان پر واقع ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم دور میں یہ جگہ آبادکاری کے لئے بہت موزوں خیال کی جاتی تھی۔

شہر میں کوئی ایسی خاصیت نہیں کہ جو یہاں پر بیان کی جائے۔ یہاں پر ڈھلوانی چھتوں والے جھونپڑے اور سپاٹ چھتوں والے گھر بھرے پڑے ہیں۔ گلیاں اور کوچے نہایت تنگ و تاریک، گندے اور گرد آلود ہیں۔ کہیں کہیں کوئی گنبد یا مینارہ ہے۔ ایک ہی بازار ہے جہاں پر بہت زیادہ رَش ہے اور کچھ کھنڈرات ہیں، بڑے گھر دو منزلہ یا دو سے بھی زیادہ منزلہ ہیں جو بہت وسیع ہیں۔ ان کی کھڑکیاں کھلی اور بغیر شیشوں کے ہیں جو ہال کمروں میں بہت زیادہ اونچی بنائی گئی ہیں۔ دیواریں اینٹوں سے بنائی گئی ہیں، تقریباً تمام گھروں میں برآمدے ہیں۔

منڈیوں اور بازاروں کے علاوہ شہر میں کسی اور جگہ پر رونق یا تو ہے ہی نہیں یا پھر بہت کم ہے اور جب ہم سوار ہو کر بازار گئے تو لوگ یورپیوں کو گھورنا شروع ہو گئے۔ عورتیں جانتی ہیں کہ ہمیں اشارے کرنا بے کار ہے۔ فقیروں نے ہم سے بھیک وصول کرنا سیکھ ہی لیا تھا۔ آوارہ کتے ہم پر بھونکنا ہی بھول گئے تھے۔ ہم پر یہاں کے لوگ طعنہ زنی بھی کر رہے تھے۔ بازار میں ہر جگہ پر سپاہی اور سرکاری ملازمین پھرتے نظر آ رہے تھے۔

حیدر آباد کا قلعہ مضبوط برجی کی وجہ سے کسی پن چکی کی طرح نظر آتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں پر امیروں کی دولت رکھی جاتی ہے۔ یہ قلعہ جنوب میں ایسی لمبی، تنگ اور پتھریلی چٹان پر بنا ہوا تھا جس پر

شہر بھی قائم تھا۔ قلعہ بے ہنگم شکل میں ہے اور ایک میل کا محض تین چوتھائی حصہ ہے۔ یہ بہت مضبوط قلعہ ہے جو پختہ اینٹوں سے بنا ہے اور اس کی بنیادیں بہت موٹی ہے اور اوپر آ کر ذرا کم ہو جاتی ہے۔ یہ زمین کے کافی اندر تک گئی ہے، اور قدرتی چٹان پر ایستادہ ہے۔ شمال کی جانب ایک خندق شہر اور قلعہ کو علیحدہ کر دیتی ہے۔ اس خندق کو پل کے ذریعہ عبور کیا جاتا ہے جو قلعہ کے دروازے کی جانب لے جاتی ہے۔ اردگرد سب ہموار میدان ہے۔ بڑی توپوں کے لئے چند ایک ہی کوٹھریاں تیار کی گئی ہیں۔

کسی دور میں یہ قلعہ جائے دفاع، خزانہ گاہ اور مقامی حکمرانوں کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ اندرونی منظر بھی کسی چھوٹے سے قصبے کی عکاسی کرتا ہے (یعنی Haute Villa) یہاں کی گلیاں، چوک، چوکیاں، مساجد، دوکانیں، قیام گاہیں، حجرے، گھر وغیرہ سب ہی کشادہ اور خوبصورت ہیں۔

حیدرآباد کے محل کا نقشہ: تم ایک چھوٹے سے در سے داخل ہوتے ہو جس پر دروازہ ہے ہی نہیں۔ یہ ایک تنگ گلی سے ہو کر چوکور ہال میں جا کھلتا ہے۔ تمہارے دائیں جانب ایک ذاتی گرجا گھر اور چھوٹی سی دیوار ہے۔ تمہارے سامنے اصطبل ہیں، بائیں جانب باورچی خانہ، دفاتر اور ملازموں کے جھونپڑے ہیں، چوتھی جانب حکمران خاندان کا قبضہ ہے۔ یہ جگہ، ایک کھلے برآمدے پر مشتمل ہے جس کے ستون قائم ہیں اور سامنے کی جانب منڈیر بنی ہوئی ہے۔ جیسے ہی تم اندر داخل ہو گے تمہیں ریاستی حکمرانوں کے کمرے مل جائیں گے۔ عورتوں کے کمرے اور بھی پیچھے کی جانب ہیں۔ چھوٹے سائز دروازے مختلف حصوں کو آپس میں ملا دیتے ہیں۔ سارے اندرونی حصے کو ممکنہ حد تک تنگ و تاریک بنا دیا گیا ہے تاکہ خلوت کا تحفظ کیا جا سکے۔ بعض کمروں میں عربی طرز کی محرابیں بنائی ہوئی ہیں۔ بعض ہماری نقش ساز تختیوں کی طرح ہیں جن کے پس منظر میں اندلسی مسلمانوں کا عکس نظر آتا ہے۔ امیر ترین گھروں میں چھتوں پر کبھی بہت مہنگی آرائش و زیبائش ہوا کرتی تھی۔ اندرونی دیواروں میں بڑی تعداد میں طاق بنے ہوتے ہیں اور جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو یہ سوراخ ہی معلوم پڑتے تھے۔ امیروں اور ان کے درباریوں نے ''میانی'' کی جنگ کے نتیجے میں اپنے ہیرے جواہرات صندوقوں میں رکھنے شروع کر دیئے جو انہوں نے کمروں کی زمینوں میں یا گھروں کی دیواروں میں یا پھر ایسی جگہوں پر دبانا شروع کر دیئے کہ جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ مغربی لوگ شاید ہی کبھی اس جگہ تک پہنچ پائیں۔ یورپیوں اور مقامی باشندوں نے چھ ماہ تک اور کچھ نہیں کیا سوائے اس کے کہ ساری زمین پر دموسے چلاتے رہے اور جہاں سے زمین کھوکھلی معلوم ہوتی تو وہ وہاں پر اس کو توڑنے

کی سرتوڑ کوشش کرتے۔

شکار پور

(1)

یہ شہر جو اپنی اچھی مالی حیثیت کی وجہ سے بہت شہرت یافتہ ہے، یہاں کے ہندو مہاجن اور ساہوکار خاص طور پر مشہور ہے۔ ان کے تعلقات وسط ایشیا کے تمام ممالک میں اور مغربی ہندوستان کے علاقوں میں قائم ہے۔ یہ شہر ان ہی لوگوں کا گھر ہے اور یہاں پر ان ہی کے خاندان آباد ہیں۔ انہی کو بیرونی ممالک میں گماشتہ یا ایجنٹ مقرر کیا جاتا ہے۔

چونکہ یہ شہر کسی بھی قدیم تاریخ کا حامل نہیں ہے اسی لئے یہاں پر ہندوؤں کی آبادکاری بھی کوئی پرانی نہیں ہے اور اس شہر کا قیام سیاسی استحکام کی صورت میں عمل میں آیا ہے۔ دنیا کے اس خطے میں کاروباری معاملات کا یہ مرکز ہمیشہ تجارتی استحقاقات کا حامل رہا ہے۔ ہمارے علم میں یہ حقائق آئے ہیں کہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران شکار پور مالی منڈی کے طور پر ملتان سے آگے نکل گیا اور وہاں سے ہندو ہجرت کر کے یہاں آتے چلے گئے اور اس معمولی سے دیہات کو درجہ اوّل کے شہر میں تبدیل کر دیا۔

بلاشبہ شکار پور افغانستان کے درانی حکمرانوں کے زیر اقتدار بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اسی حکمرانی کے نتیجے کے طور پر یہاں بڑے بڑے بنکار پیدا ہوئے ہیں۔ نیز اس میں درانی حکمرانوں کی غلطیوں کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ بعض نے تو ریاستی وزراء کو قرض دیئے اور خود فائدہ حاصل کیا اور بعض نے امراء کے خزانچیوں کے طور پر کام کیا جنھوں نے ان کے ہاتھوں اپنے صوبوں اور حکومتوں کا لوٹا ہوا مال جمع کر دیا تھا اور بعد ازاں اپنے وارثان پر راز افشا کئے بغیر ہی فوت ہو گئے۔

شکار پور کے سرمایہ داروں کو جب ان کے سب سے بڑے ذریعہ آمدنی سے محروم کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے گردونواح کے علاقے میں ریاستی امور میں مداخلت اور غیر یقینی کیفیت پیدا ہو گئی تو شکار پور زوال پذیر ہو گیا جس کے ساتھ ہی درانی سلطنت بھی زوال پذیر ہو گئی۔ مزید برآں یہ زوال پنجاب میں مضبوط طاقت کے آغاز کی وجہ سے اور بھی تیز ہو گیا جس کی وجہ سے اس کی تجارت اور منڈیاں شہرت حاصل کر گئیں۔ تب سے ہی شکار پور کے بہت سے بنکاروں نے اپنے ڈیرے ملتان اور

امرتسر میں جمائے ــــــ موخرالذکر اب شکارپور کی سی ہی شہرت حاصل کرتا جارہا ہے۔

یہ بات بھی ناقابل قبول نہیں کہ شکارپور کا زوال اور اس کی اجارہ داری کا خاتمہ اس کے اردگرد کے علاقوں کے لئے بہت مفید رہا ہے۔ کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس شہر کا اثرورسوخ پورے علاقے کے لئے تباہ کن تھا۔ اس نے بہت سی حکومتوں کو بہت زبردست نقصان پہنچایا ہے اور زراعت کی تباہی میں بھی اس کا زبردست اثرورسوخ رہا ہے۔ دراصل شکارپور والوں کو غیر محدود مالیاتی استحقاق حاصل تھا جس کے ذریعہ انہوں نے ریاست کے تمام تر ذرائع پر قبضہ کرلیا اسی طرح سے وہ ملکی اور غیر ملکی تجارت پر بھی چھا گئے اور ان کے علاوہ سب ہی غریب ہوگئے۔ ان کی دولت معاشرے کے لئے بہت مضرت رساں اور نقصان دہ تھی جبکہ تمام تر دولت دوسروں کی ضروریات اور بہتری حاصل کرنی چاہئے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ درانی حکمرانوں کی تاریخ میں یہ بات بہت غیر معمولی ہے کہ شکارپور سے ان کو فنڈز مہیا کئے جاتے تھے جو کہ پڑوسی ریاستوں کی فتوحات پر خرچ کئے جاتے تھے اور یہ چیز ان شکارپور والوں کے بہی کھاتوں میں بھی درج ہے۔ جب وہاں کے حکمرانوں کی طاقت ختم ہوگئی اور ان کے امراء بیرونی فتوحات پر توجہ دینے کی بجائے آپس میں لڑنا شروع ہوگئے اور تخت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے لگے تو تب تک وہ اسی میں اُلجھے رہے جب تک کہ تباہ و برباد ہوکر نہ رہ گئے ــــــ گو کہ یہ بات بہت خوفناک ہے مگر ہر گھر کے اندر ایسا ہی ہوتا ہے۔ مختصر عرصے کی بادشاہتوں کی یہی خوبی ہوتی ہے۔

شکارپور کا شہر معمولی نوعیت کی تعمیرات کا حامل ہے۔ بازار بہت وسیع ہے بڑے بڑے احاطے بنائے گئے ہیں تاکہ گرمی کم کی جاسکے مگر وہاں کا درجہ حرارت تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔ عام ہندوستانی شہروں کی طرح سے یہاں پر بھی تنگ و تنلی گلیوں کا مسئلہ درپیش ہے جن کی صفائی پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ بلاشبہ یہاں اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ دولت اور گندگی ناقابل علیحدگی ہیں عوامی شاندار عمارتوں میں کوئی چیز لائق توجہ نہیں ہے۔ صرف دو یا تین مساجد پر ہی توجہ دی جاسکتی ہے۔ بعض رئیس ہندوؤں کی رہائش گاہیں بہت بڑی اور عالیشان عمارتیں ہیں۔ البتہ ان کی بیرونی حالت بڑی اینٹوں کی دیوار کی چنائی کی وجہ سے بدنما ہوجاتی ہے۔

ایک مرتبہ شہر کے گرد مٹی کی دیوار کھینچی گئی تھی لیکن بعد میں یہ دیوار بھی آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ افغانیوں نے چھوٹے قلعہ نما شہروں کو بہت متاثر کیا اور عمومی مشاہدہ یہی کیا جاسکتا ہے کہ ان

کی حکومت میں تمام اہم شہروں میں فصیلوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

شکار پور کے بازار میں ہر چیز مہیا ہوتی ہے کیونکہ اس کے نواحی علاقے کافی زرخیز بھی ہیں۔ یہاں پر مچھلی منڈی بھی موجود تھی۔ یہ مچھلیاں دریائے سندھ سے حاصل کی جاتی ہیں۔ اس علاقے میں بہت سے باغات بھی ہیں جو زیادہ تر ہندوستانی پھلوں مثلاً آم، شہتوت، انجیر، کیلے، خربوزے اور کھجوروں کے باغات ہیں۔ ان ہی میں آپ گنے کا کھیت بھی شامل کر لیجئے جس کو پھل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں اس کی ہر دو سرخ اور سفید اقسام پائی جاتی ہیں۔ عام سبزیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے اور ایگ پلانٹ (Egg-Plant)، فینو گریک (Fenugreek)، پالک (Spinach)، ریڈیش (Redishes)، شلغم (Turnips)، گاجریں (Carrots) اور پیاز (Onions) وغیرہ سب کچھ ہی مل جاتا ہے۔

شہر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر دریائے سندھ سے نکالی گئی ایک نہر آتی ہے لیکن اس میں صرف خاص مواقع پر پانی آتا ہے۔ مثلاً ایک بار میں نے اسے عبور کیا اور چندروز بعد دیکھا تو یہ بالکل خشک تھی اور مجھے تو مشکل سے ہی یقین آیا کہ یہ وہی نہر ہے کہ جس میں کبھی پانی بھی تھا پانی کی فراہمی کے لئے شہر کے اندر اور باہر لاتعداد کنویں ہیں۔ یہاں کا پانی بہت اچھا خیال کیا جاتا ہے۔ زرخیز زمینوں پر کاشتکاری کے لئے عام طور پر کنویں ہی استعمال ہوتے ہیں اور جب کنویں کھودے جاتے ہیں تو زیادہ گہرا کھودنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور پانی جلد ہی نکل آتا ہے۔

آج کی نسبت پہلے زمانے میں شکار پور کی تجارت بہت وسیع تھی اور بہت سے قافلے یہاں آیا کرتے تھے۔ آج بھی بازار میں بہت سرگرمی دکھائی دیتی ہے۔ آج بھی ایسے کپڑے یہاں ملتے ہیں جو بڑی محنت سے ریشم سے تیار کئے جاتے ہیں اور یہی اس ملک کی پیداوار ہیں۔ پشاور کے بعد یہاں کی لنگیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔

گو کہ یہاں کے زیادہ تر باشندے ہندو ہیں مگر عرصہ دراز تک افغانوں کے زیر اقتدار رہنے کی وجہ سے یہاں پر بڑی تعداد میں افغان خاندان بھی آباد ہو چکے ہیں یہاں پر بہت سے بلوچ اور بروہی بھی ہیں۔ مگر سندھی بہت قلیل تعداد میں ہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہیں ہی نہیں کیونکہ ان کو کسی افغانی شہر میں آباد ہونے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں کی مسلم آبادی اچھی خصوصیات کی حامل نہیں۔ یہاں کے لوگ جاہل، فریبی اور بزدل مشہور ہیں۔ یہاں کے ہندو بھی ہر جگہ کے ہندوؤں کی طرح ہر ممکنہ طریقے

سے فائدہ حاصل کرنے کی نیت رکھتے ہیں۔ نیز ان کے طبقے کی عورتیں بدمعاشی اورعیاشی کے حوالے سے عالمی شہرت یافتہ ہیں۔

درانیوں کے عہد میں شکارپور کا ایک گورنر ہوا کرتا تھا اور جو میرے خیال میں ڈیرہ غازی خان کے کسی اعلیٰ سردار کے ماتحت ہوتا تھا۔اس کا مالیہ آٹھ لاکھ روپے بنتا ہے اور اس میں پورے ضلع کا مالیہ بھی شامل ہوتا ہے۔ آج محض ڈھائی لاکھ روپے جبراً وصول کئے جاتے ہیں البتہ اس بات کی شکایت بھی خوب کی جاتی ہے۔اس میں سے دوتہائی تو حیدرآباد کے امیر ادا کرتے ہیں اور باقی ایک تہائی خیرپور کا امیر ادا کرتا ہے۔ گورنر کا تقرر حیدرآباد سے کیا جاتا ہے۔اس وقت یہاں کا گورنر، جیسا کہ پہلے بھی بیان کر دیا گیا ہے، قاسم شاہ ولد میر اسمٰعیل شاہ ہے۔ عام طور پر افغانوں یا برطانویوں کے ساتھ بات چیت کے لئے اسے ہی مقرر کیا جاتا ہے۔ قاسم شاہ اپنے خاندان کا بہترین فرد ہے اور جن لوگوں پر بھی اس کا تقرر کیا جاتا ہے ان سب میں وہ برتر ہی نظر آتا ہے۔

سندھ میں جزیرہ بھکر کے قلعہ سے شکارپور سولہ کوس دور ہے اور لاڑکانہ سے اکیس کوس دور ہے۔ بھکر کو جانے والے روڈ پر یہاں سے 4 کوس کے فاصلے پر لکی (Lakki) نامی دیہات ہے۔ جو افغانوں کے زیر اقتدار کافی آباد و مشہور رہا اور وہاں سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ مالیہ وصول ہوتا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ جگہ ایک دم سے ویران ہوگئی۔ البتہ مکانات آج بھی آباد ہیں۔اسی رخ پر بھکر کے مقابل دریائے سندھ کے کنارے سکھر ہے جو کبھی کافی بڑا شہر تھا مگر اب کھنڈر بن گیا ہے۔اس جگہ پر بھی درانیوں کا قبضہ تھا اور قلعہ بھی انہی کے پاس تھا۔ روہڑی جو دریا کے مشرقی کنارے پر آباد ہے وہ خیرپور کے سردار کے قبضے میں تھا۔

سندھ کے شہروں کے نواحی علاقے ویران ہو گئے ہیں اور بیرونی آبادی ڈاکو بن گئی ہے۔ ان حالات میں یہ بات مشکل ہی نظر آتی ہے کہ باشندگان شکارپور حفاظتی دیوار کے بغیر آرام وسکون کے ساتھ رہ سکیں۔ کیونکہ ایسے موقع پر وہ اکثر لوٹ لئے جاتے ہیں۔ان واقعات کی روک تھام کے لئے گھڑسوار دستے دن دھاڑے بھی گشت کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ ایک میل کے فاصلے پر نہر ہے جس کے کنارے ہندو فقیروں کی کچھ آبادیاں ہیں۔ یہ ہندو اپنے جشن پر بہت کچھ کرتے ہیں۔ میرے وہاں قیام کے دوران ہی ان کی کچھ چھٹیاں بھی ہوئیں اور ان لوگوں کی حیرت انگیز باتیں دیکھنے کو ملیں۔ تماشہ گری بہت خوشگوار اور متاثر کن بھی تھی۔

شکارپورکو سکّوں (Coins) کا بھی اعزاز حاصل رہا ہے۔ یہاں کا روپیہ بہت اچھا ہوتا ہے اور مالیت میں ہندوستانی روپیہ کے برابر ہی ہوتا ہے۔ یہاں کے اوزان اور پیمانے بھی مخصوص ہیں۔ عہد درانی میں اس شہر کو بہت سے استحقاقات حاصل رہے تھے۔ یہ جگہ شہرت اور زوال کا تجربہ حاصل کر چکی ہے۔ یہ شہرا میر ملک کے وسط میں ہے اسی وجہ سے اس کا محل وقوع بھی اس کے لئے فائدہ مند ہے۔ اسی وجہ سے یہ مکمل زوال وتباہی سے بچا رہے گا۔ گوکہ وسط ایشیا کی مالیاتی منڈی کے طور پر اس کا خاتمہ ہو جائے گا مگر پھر بھی گردونواح کے ممالک کے لئے یہ منڈی کی حیثیت سے باقی رہے گا۔

درانیوں کے نزدیک اس پر قبضہ قائم رکھنا بہت اہم تھا۔ کیونکہ یہیں سے وہ پورے سندھ پر نظر رکھتے تھے اور سرداروں پر خراج عائد کیا کرتے تھے۔ یہ بات بخوبی جانی جاسکتی ہے کہ دریائے سندھ کے اس پار کی گئی حالیہ کارروائی کی وجہ سے ہی اس شہر اور اس سے متعلقہ علاقوں پر برطانوی اقتدار مستقل طور پر قائم کر لیا گیا ہے۔ (سی۔میسن I، صفحات 253-60)

(2)

شکارپور کا شہر، بھکر سے 22 میل کے فاصلے پر ہے اور اس پورے خطے میں سب سے بڑا شہر ہے۔ بلکہ پورے سندھ میں کیونکہ اپنے رقبے میں یہ دارالحکومت حیدرآباد سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اس کے اردگرد کا علاقہ کافی زرخیز ہے مگر ہمیشہ اس کے قابضین تبدیل ہوجاتے ہیں۔ جیسے ابھی یہ افغانیوں کے پاس سے نکل کر سندھیوں کے پاس چلا گیا۔ اس کا سالانہ مالیہ تقریباً نصف لاکھ روپے ہے۔ یہاں کی حکومت بہت جارحانہ ہے۔ اندرون ملک بھی یہاں کی تجارت بہت وسیع ہے کیونکہ یہاں کے عوام اور تاجروں کی بڑی تعداد ہندو ہے جن کے ایجنٹ پڑوسی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ شکارپور کے گرد مٹی کی دیوار ہے اور یہاں کے گورنر کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کا خطاب ''نواب'' ہے۔ تقریباً 80 سال قبل یہ شہر اور پورا ضلع سندھیوں کے پاس آ گیا اور صرف یہی علاقے ان کے ملک کا بے چین خطہ ہے کیونکہ افغانوں نے اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی ہے۔ (اے۔برنس III، صفحات 277-78)

(3)

شکارپور سندھ کا سب سے بڑا اور آباد شہر ہے اور یہاں تقریباً تیس ہزار باشندے آباد ہیں۔ یہ

شہر اور اس کے نواحی مختصر قطعات پر امیروں نے کابل کے حکمران کو بے دخل کر کے قبضہ حاصل کر لیا ہے۔ افغانوں اور رنجیت سنگھ کی دھمکیوں کے باوجود تا حال ان ہی کے قبضے میں ہے۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو ہے، اور عام طور پر وہی سندھ میں امیر ترین قوم ہوئے ہیں۔ ایک بڑی سی نہر بھکر سے 30 میل شمال میں نکل کر اس جانب آتی ہے اور اس شہر کے بالکل قریب سے گزرتی ہے۔ سال میں 4 ماہ اس میں کشتی رانی بھی ہو سکتی ہے۔ موجودہ حکمرانوں کو اس شہر سے جو سالانہ مالیہ حاصل ہوتا ہے وہ تقریباً نصف لاکھ ہے۔ جس کا دو تہائی امیر حیدر آباد لے لیتا ہے اور باقی خیرپور کا سردار لے لیتا ہے۔ اس ضلع میں تمام محصولات اور سفری چونگیوں کے کل حقوق ریاست حیدر آباد کے پاس ہیں۔ شکارپور کشادہ شہر ہے اور بھکر سے شمال شمال مغرب (N-N-W) کی جانب 18 میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحات 27-28)

(4)

شہر شکارپور میں تقریباً تین ہزار باشندے ہیں جن میں اکثریت لوہانہ قوم کے (Lohanas) ہندوؤں کی ہے۔ شہر کے مشرق میں (جہاں پر ایک بہت بڑی اور گہری خندق بھی ہے) ایک بہت وسیع قلعہ اور بڑے شہر کے کھنڈرات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی سومرہ سردار یا راجہ رادو کی رہائش گاہ تھی۔ جو تقریباً 533 سال قبل 694ھ یا 1299ء میں فوت ہو گیا۔ یہ کھنڈرات پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ ہر اینٹ 20 انچ لمبی اور 8 انچ چوڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آبی گزرگاہ شہر کی دیواروں کے بالکل ساتھ رہی ہوگی ___ جو تمام کتب اور مقامی روایت کے مطابق یقیناً بہت خوبصورت جگہ رہی ہوگی۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفرنامہ، صفحہ 195)

(5)

شکارپور میری توقعات کے برعکس نکلا۔ مجھے تو یہ علم تھا کہ اس کے وسط ایشیا سے بہت وسیع تر تعلقات ہیں، اور چونکہ یہاں پر بڑے بڑے بنکار، ساہوکار اور مہاجن رہتے ہیں اس وجہ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسی لئے اس کو سندھ کے دیگر شہروں کی نسبت کافی بڑا اور بہتر ہونا چاہئے۔ مگر وہ واحد چیز کہ جس میں اسے دیگر شہروں پر فوقیت حاصل ہے وہ یہاں کے سرمایہ دار ہندو تاجروں کے

بڑے بڑے گھر ہیں۔ یہاں کا بازار کافی بڑا ہے اور عام روایات کے برعکس چوڑا ہے۔ دیگر شہروں کی طرح اس بازار کے اوپر بھی چھت ڈالی ہوئی ہے جو کہ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ بہرحال اس شہر کے بازار میں چہل پہل سے میں یہ اندازہ کرسکتا ہوں کہ اس شہر کی آبادی کافی زیادہ ہے۔

یہاں پر سندھ کی ایک خشک نہر کے کنارے میلہ لگتا ہے۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ وہی جشن دیکھنے جلدی سے گیا۔ یہ جشن دریائے سندھ میں موسمی طغیانی کی شروعات کی وجہ سے منایا جاتا ہے اور اس کی نعمتوں میں سے یہاں کے باشندے اسی نہر کے ذریعہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم بڑے بازار سے گزرے مگر ماسوائے چند ایک دوکانداروں کے جن کو آج کے دن بھی منافع عزیز تھا، سارا بازار بند پڑا تھا۔ شہر کے دروازوں کے باہر کئی سواریاں کھڑی تھیں جو بے سواری لوگوں کے لئے اپنی خدمات پیش کررہی تھیں۔ ہم لوگ سوار ہوکر چل پڑے۔ مگر جلد ہی شور وغل سے ہمیں احساس ہوا کہ اس خوشی کے بدلے میں ہمیں قیمت ادا کرنی ہوگی۔ کافی دیر کے بعد ہم نہر پر پہنچے اور رش سے الگ تھلگ بیٹھے رہے۔ نیچے اُترنے کے بعد ہم جلد ہی رش میں شامل ہو گئے، اور بہت سے لوگوں نے ہمارے ساتھ دوستانہ انداز میں گفتگو شروع کردی۔ ہم اس گفتگو سے بہت لطف اندوز ہوتے رہے۔ نہر کے دائیں کنارے کی جانب نیچے کو جاتے ہوئے ہماری توجہ ایک پیپل کے درخت کی جانب مبذول کرائی گئی۔ جس کے نیچے سے گانے اور موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ ایک ہندو ناچ تھا اور گانے والے سب مرد تھے۔ تماش بین ایک لائن میں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ عورتیں مردوں سے بھی زیادہ تھیں مگر جب تک ہم وہاں پر رہے تو کسی جنسی تفریق کا مظاہرہ نہ ہوا۔ نہ ہی کوئی جھگڑا ہوا اور نہ ہی کسی نے نشے میں بدمستی کی۔ اداکاروں کی اداکاری کا معاوضہ سامعین کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ پھر اس گروہ کی سردمہری بھی قابل غور تھی گو کہ وہ ان کے پُرامن برتاؤ کی طرح سے قابل تعریف نہیں تھا۔

اس میلے میں نہ تو تانبے کا سِکّہ نظر آیا نہ ہی چاندی کا۔ کھانے پینے کے لئے کوڑیاں ادا کی جارہی تھیں جن کی قیمت 96 کوڑیاں فی پیسے کے برابر تھی۔ کوڑی دائرے کی شکل کے تانبے کے سب سے چھوٹے سِکّے کو کہتے ہیں۔

ناچ گانے کو چھوڑتے ہوئے ہم لوگ چار آدمیوں کی ایک ٹولی کی جانب چلے جو اپنی بیویوں کے ساتھ مل کر چھوپر کلو (Chopper Kallu) کے کھیل سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ انہوں نے بڑی

عزت سے ہمیں اپنے قالین پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ یہ کھیل دراصل شطرنج(Chess) کی طرح سے کھیلا جاتا ہے لیکن اس میں 64 خانوں کی جگہ شکار پور میں 96 خانے ہوتے ہیں۔کوڑیوں کو گوٹوں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور مہروں کے لئے عاج کے غیر تراشے ہوئے ٹکڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ وہ اس طرح سے کس مقصد کے لئے کھیلتے ہیں لیکن ہمیں ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ یہ کھیل پیسے کے لئے نہیں کھیلتے بلکہ کھیل کے طور پر کھیلتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو ایک عمارت میں داخل ہوتے دیکھ کر ہم نے بھی ان کی پیروی کی لیکن ماسوائے چند خوبصورت چہروں اور ایک پوشیدہ ہندو دیو مالا کے کچھ دکھائی نہ پڑا۔ یہ ایک مذہبی شخص کی رہائش گاہ تھا جو اس طرح کے مواقع پر اپنے اکثر کمزور ایمان والوں کو بے وقوف بنانے میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔

جیسے ہی شام ہونے لگی تو مجمع بھی بکھرنے لگا۔ہم نے نہر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا کہ یہاں کی خواتین آپس میں اسی طرح سے ہاتھ ملا رہی تھیں جس طرح سے کہ یورپیوں میں ہوتا ہے۔ بہت سی نہر میں اُتر گئیں اور زمین پر سر رکھ دیا اور یوں وہ اس نہر کی گزشتہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے لگیں،اور اس کا مزید اظہار کرنے کے لئے ایک نے دوسری کے ہونٹوں پر ریت ملی اور پھر اس کو ہوا میں پھیلا دیا۔اس کے بعد دو ایک بار گول گھومیں اور پھر گھر کی جانب چل پڑیں۔مردوں کو دیکھا گیا کہ وہ ایک خانے میں رکھے گئے ایک مزین بت سے منتیں مانگ رہے تھے۔ بت پرستوں میں اس طرح کے کام کرنا عام سی بات ہے۔(جے۔ووٹ،صفحات 32-30)

(6)

مسٹر بل (Mr. Bull) شکار پور تمہارے لئے بڑی دلچسپ جگہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ ایک تجارتی شہر ہے۔

یہ شہر شمالی سرحد کے قریب سکھر سے تقریباً 25 میل مغرب کی جانب واقع ہے۔ہمیں تین چار جگہ رکتے ہوئے یہاں پہنچنا تھا۔مگر چونکہ اداس وادی کی ہمارے دور کے اس آخری اسٹیشن پر ہمارا قیام طویل ہونا تھا اور پھر اسی جگہ مٹی کے شاندار عمارت کو ہی اپنا گھر بنانا تھا لہٰذا میں نے فوراً ہی وہاں پہنچ جانے کی تجویز دی۔

بنکاروں، تاجروں اور ساہوکاروں کا یہ مرکز بہت کشادہ شہر ہے۔اس کے اردگرد بہت درخت اور باغات ہیں۔جن کو دیکھ کر ذہن تازہ ہو جاتا ہے۔اس کے اردگرد ایک قدیم دیوار ہے جو مٹی کی بنی ہوئی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔مشرق کی جانب 8 بڑے اونچے اور سیاہ دروازے ہیں۔گردونواح کے علاقے بھی وسیع ہیں۔گلیاں تنگ و گندی اور پُر ہجوم ہیں۔اس علاقے میں پانی بارہ تیرہ فٹ کی کھدائی پر ہی نکل آتا ہے۔اسی وجہ سے یہاں کے کنویں بھی بہت چوڑے ہیں بلکہ عام کنوؤں سے سائز میں دس گنا چوڑے ہیں۔ یہاں کوئی عوامی عمارتیں بھی نہ ہیں۔ البتہ چند مسجدیں ہیں جو شہر کے اندر قائم ہیں جبکہ مکانات جزواً لکڑی کے اور جزواً پکی اینٹ کے بنے ہوئے ہیں۔ان میں نیچی چھتوں والے برآمدے اور بغیر شیشے کے چھوٹے چھوٹے روشن دان ہیں۔اس طرح سے مشرقی طرز کی دیگر چیزیں بھی شامل ہیں۔اس مقام پر تعینات شہری اور فوجی افسران کے بنگلے شہر کے ساتھ ہی باہر کی جانب ہیں۔

شکارپور میں وسط ایشیا کا بازار ہے جو میں نے پہلی بار دیکھا۔یہی شہر کی سب سے بڑی سڑک ہے جو بہت طویل مگر تنگ ہے۔اس کی دیواریں بہت اونچی ہیں اور سورج سے بچنے کے لئے گھروں سے باہر نکلے ہوئے مچانوں/چھجوں سے جوڑ کر ترپال ڈال دیئے گئے ہیں۔

ہمیں یہاں پر کم از کم درجن بھر اقوام نظر آئیں۔ چھوٹے قد والے بروہی جو حلوائیوں کی دوکان پر کھڑے تھے۔ ان کے کندھے مضبوط، چہرے سپاٹ اور بازو ٹانگیں چوڑی تھیں۔ افغانوں کا ایک گروہ اپنے اونٹوں کی قیمتیں طے کر رہا ہے۔تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ لوگ کیسے دراز قد، چوڑی جسامت، شعلہ فشاں چشم اور طاقتور معلوم ہوتے ہیں۔گو کہ یہاں پر ہتھیار لانے کی اجازت نہ ہے مگر پھر بھی ان کے ہاتھ ان کی کمر سے لگے ہوئے ہیں گویا کہ کوئی ہتھیار استعمال کرنے والے ہیں۔ پھر جنگلی بلوچ آتے ہیں جن کی کالی کھال، داغدار گال اور کٹر بری نظریں ہیں مگر ان کی ہیئت سے آزادی چھلکتی ہے اور یہ بھی لگتا ہے کہ گویا کوئی پوچھ رہا ہو کہ یہاں کتنی قتل و غارت ہوئی ہے؟ ان کا کردار کسی ایسی جنگلی بلی کی طرح کا ہے جو بھاگتے ہوئے پیدل شخص پر حملہ کر دے۔ ان کے بعد سندھی آتے ہیں جنہوں نے زربفت کی ٹوپی پہنی ہوتی ہے اور چھینٹ کا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ہرات سے آنے والے مُلّاؤں کا بھی ایک گروہ ہے جو پگڑیاں باندھتے ہیں اور کمر بند استعمال کرتے ہیں۔ سندھیوں کو بڑی توہین آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں حالانکہ یہ انہی کے

درمیان رہنے کے لئے آ گئے ہیں۔ اس کے بعد غنڈے پٹھان آتے ہیں جو تاجر ہیں اور بڑی صاف فارسی بولتے ہیں۔ قندھار نے ملتان کا مقابلہ یوں کیا ہے کہ مئوخرالذکر کی دھوکا بازی کو اپنے دھوکوں سے روکا ہے۔ انہوں نے پشمین کی بنی ہوئی ٹوپیوں پر لمبے لمبے جیسلمیری صافے باندھے ہوتے ہیں۔ یہیں ایک مسلمان باورچی گھر میں کباب تل رہا ہے جس کی خوشبو سارے بازار میں پھیل کر اسے معطر بنا رہی ہے اور اکثر لوگ میز پر خیالی پلاؤ پکار رہے ہیں۔ ایک ہندو ٹھیکیدار بھی ہے جو خشک میوہ جات، گنے، بیج، گرم مسالے، افیون، وغیرہ کا کاروبار کر رہا ہے، اور جاٹ عورتوں کے سامنے یہ اشیاء پیش کر رہا ہے۔ یہیں پر 150 کے موسم میں کانے لوہار اور اسلحہ ساز اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ اس بازار میں کوئی شخص بھی خاموش نہیں ہے۔ ہر کوئی آوازیں لگا رہا ہے۔ یہاں تک کہ مٹھائی والا اور تمباکو فروش بھی آوازیں لگا رہا ہے۔ ماسوائے ان دو ہندوؤں کے کہ جو ایک کپڑے کے نیچے بڑی خاموشی سے رازداری سے اپنی انگلیوں کو جنبش دے کر قیمتیں طے کر رہے ہیں۔ یوں یہ سودا عوامی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اس طرح سے درجن بھر پیش کشیں رَد ہو جاتی ہیں۔ یوں مشرق میں وقت، محنت اور رقم کا کوئی مغربی مشاہدہ بین صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔ II، صفحات 70-265)

(7)

شکار پور دراصل قندھار کو جانے والی شاہراہ عام پر درہ بولان میں آتا ہے۔ اسے دریائے سندھ اور اس کے پار ممالک میں ہونے والی تجارت میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ دریائے سندھ کے اس پار اس کے علاوہ اور کوئی شہر اس جیسی تجارتی اہمیت کا حامل نہیں ہے کیونکہ یہاں کے تاجروں نے چین، ہندوستان، فارس، خراسان، بخارا، ترکی اور استراخان میں بہت سرمایہ کاری کی ہے۔ ان تمام ممالک میں یہاں کے بڑے بڑے تاجروں کی خط و کتابت اور کاروبار قائم ہیں۔ ملتان کے ساتھ ساتھ شکار پور کو بھی خراسان کا دروازہ کہا جاتا ہے اس طرح سے سندھ کے مقامی لوگ افغانستان کی نقل کرتے ہیں۔

شہر کا دائرہ تین میل ہے۔ اس کے گرد بہت بوسیدہ دیوار ہے جس میں 8 بڑے اونچے دروازے ہیں۔ ان سے آگے شاندار باغات ہیں۔ یہ شہر تقریباً 1617ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں اس وقت

22,000 باشندے آباد تھے۔کیپٹن پوسٹن (Captain Postans) نے یہی اعداد وشمار بیان کئے تھے۔مگر اب تو اس کی آبادی کم ہو کر ایک تہائی رہ گئی ہے۔ یہاں کا بازار بہت عمدہ ہے اور 600 گز طویل ہے۔اس پورے بازار پر ہی سائبان پڑے ہوئے ہیں۔ جب بازار میں بہت رش ہو جائے تو ان سائبانوں کی وجہ سے خاصی پریشانی ہوتی ہے۔ یقیناً شکار پور بنکاروں، تاجروں اور ساہوکاروں کا دارالحکومت ہے۔ تجارتی حوالے سے یہ مسلمہ حیثیت کا حامل ہے، اور اسے ہندوستانی اور خراسانی تجارت کی تجارتی بندرگاہ کہا جاتا ہے۔ اس کی دوکانوں میں کشمیر کی عمدہ ترین شالیں اور ملتان، ہندوستان اور دکن کے سنہری کپڑے بھرے پڑے ہیں اس کے علاوہ استراخان کے پشم، ایران اور دمشق کی تلواریں بھی دستیاب ہیں۔

تمام قسم کے کپڑے ہر قیمت پر، گیلے اور خشک پھل معہ تمام پرچون (Groceries) کے سامان یہاں ملتے ہیں۔بعض کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ یہ امریکہ کے پھل ہیں گو کہ یہ تصور غلط ہے۔ صدر بازار کو دیکھنے کا بہترین موقع دو پہر چار بجے کا ہوتا ہے جب پورا سندھ اپنے کاروبار کے عروج پر ہوتا ہے۔ گو کہ اس وقت اتنی گرمی ہوتی ہے کہ گرمی سے بچنے کے لئے تازہ ہوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ میلے کچیلے لوگوں کا اس وقت بہت رش لگا ہوتا ہے۔

شکار پور میں موسم سرما البتہ کافی خوشگوار ہوتا ہے، اور یہاں پر شہر کے تمام حصوں میں سطح زمین سے تیرہ فٹ کی گہرائی میں پانی مل جاتا ہے۔لوگوں کو اس چیز کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ہندوؤں کے مکانات کافی بڑے ہیں۔

اس شہر میں بال اور سوت کے قالین بنتے ہیں۔اس کے علاوہ ریشمی لنگیاں اور اعلیٰ درجے کا چمڑا بھی بنایا جاتا ہے۔ مارکوپولو کے دور سے چمڑے سے بنی ہوئی اشیاء بھاری تعداد میں عرب اور خلیج فارس کے ممالک سے برآمد کی جاتی ہیں۔سندھ کے دیگر تمام شہروں میں شکار پور کو معاشی طور پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ ہمارے ایک بہت اہم افسر مالیہ مسٹر میکلوڈ (Mr.Macleod) نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ شاہان کابل کے زوال کے ساتھ ہی شکار پور کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ پھر شکار پور کے کاردار جیت مل (Jeyth Mull) کی وفات کے بعد سے یہاں کے تجارتی تعلقات اتنے محدود ہو گئے ہیں کہ مغرب میں کابل اور قندھار اور مشرق میں جے پور، جیسلمیر اور بیکانیر سے آگے اب ان کا کاروبار نہیں ہے۔اب اس شہر کی سب سے بڑی تجارت کراچی اور پالی (Palee) سے ہوتی ہے

اور پھر ان شہروں کے ذریعہ بمبئی سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ شکار پور کے زوال کے بارے میں مسٹر میکلوڈ کی رپورٹ کافی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہ رپورٹ دفتری اعداد وشمار پر ہے۔اس کی رائے میں اب سندھ کا سب سے بڑا تجارتی شہر کراچی ہے بلکہ اس کے تاجروں کا تو اب بمبئی کے سرمایہ داروں سے مقابلہ ہونے لگا ہے گو کہ بہت محدود پیمانے پر۔اس کا کہنا ہے کہ اب سندھ میں کوئی سرمایہ دار تاجر نہ بچا ہے۔(ای۔اے۔لانگلے،صفحات 168-167،163-162)

کراچی

(1)

کراچی کے اردگرد مٹی سے بنی ہوئی موٹی دیوار ہے جس پر کچھ توپیں نصب ہیں۔کوئی جہاز ان توپوں کو سمندری جہاز سے نشانے مار کر گرا نہیں سکتا کیونکہ وہ تقریباً تین میل کے فاصلے پر اُترتے ہیں۔البتہ یہ جہاز توپوں کی زد میں ضرور آ سکتے ہیں، اور دوسوٹن کا بحری جہاز بھی ان سے بچ کر گزر نہیں سکتا۔بعض توپیں تو اتنی ہی بھاری ہوتی ہیں جتنی کہ ہر جہاز پر موجود درجن بھر توپیں ہوتی ہیں۔(این۔کرو،صفحہ 27)

(2)

کراچی کا قلعہ بند قصبہ 52-24 عرض بلد شمالی اور 17-67 طول بلد مشرقی میں واقع ہے اور صوبہ سندھ کے جنوب مشرقی سرے پر ہے اور اب چند سالوں سے اس کی اہم ترین بندرگاہ بن گیا ہے۔اس کی بندرگاہ جسے گاہے بگاہے خورعلی کہہ کر میّز کیا جاتا ہے۔ بہت محدود ہے اور اس کے دہانے پر روک ہونے کی وجہ سے ان جہازوں کے لئے اس میں داخل ہونا دوراندیشی نہیں جو سولہ فٹ سے زیادہ پانی میں چلتے ہوں گو وہ ایک دفعہ اس روک کو پار کر جائیں تو انہیں دوسری طرف گہرا اور ہموار پانی مل جاتا ہے۔

1797ء کا بنا ہوا ایک قلعہ خلیج کی مغربی طرف کے خشکی کے حصہ پر ایستادہ ہے اور اس میں داخلہ کو روکنے کے لئے نہایت مناسب ہے اور اگر اس پر اچھی توپیں نصب ہوں اور انہیں صحیح طور پر چلایا جائے تو میرے خیال میں کوئی جہاز بلاخوف وخطر اس میں نہیں آ سکتا، یا کم از کم موثر طور پر نہیں آ سکتا کیونکہ

اس کی توپوں کے دہانے بہت اوپر اٹھانے پڑیں گے تا کہ ان کے گولے پہاڑی سے نہ ٹکرائیں اور یوں دس میں سے نو اوپر سے گزر جائیں گے اور دوسری طرف سمندر میں جا گریں گے۔ اس سے وہ بھی قلعہ کی گولہ باری سے تو محفوظ رہ سکتا ہے لیکن چونکہ وہ پہاڑی کے بالکل نیچے ہوگا لہٰذا اس کے عرشوں کو لفنگچیوں سے خالی کرنا ہوگا جو چٹان کی آڑ میں محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ایسی صورت حال میں واحد طریقہ یہ ہوگا کہ فوج کو کچھ فاصلے پر اتار دیا جائے اور پھر اسے سیڑھی لگا کر قبضے میں لیا جائے۔ قصبے کی قلعہ بندیاں بہت کمزور اور بے قاعدہ ہیں اور کہیں کہیں پانچ چھ فٹ سے زیادہ بلند نہیں اور یہ اتنی خستہ وشکستہ ہیں کہ ایک گھوڑ سوار نہایت آسانی سے ان کے اوپر چڑھ سکتا ہے البتہ بعض جگہوں پر وہ خوب بلند اور اچھی حالت میں ہیں۔ سب کہگل کی بنی ہوئی ہیں جو مٹی، بھوسہ اور قریبی دلدلوں میں اُگنے والے لمبے بل دار گھاس پھوس کا امتزاج ہوتی ہے۔ البتہ دہانہ بندر سے بہنے والی کھاڑی کی طرف انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر قلعہ بندی کو پتھر اور گارے سے کافی اونچا بنا دیا ہے۔ امیران سندھ کے حکم پر 1813ء میں اندرون فصیل مکانات کی تعداد تین ہزار دو سو پچاس تھی۔ ان کے علاوہ قلعہ کے آس پاس کچھ بکھری ہوئی جھونپڑیاں تھیں۔ جو اس خانہ شماری میں شامل نہیں تھیں۔ اس وقت عارضی قیام کنندگان کے سوا آبادی تیرہ ہزار نفوس تک بڑھ گئی تھی جو 1809ء میں قیام مشن کے وقت سے ڈیڑھ گنا سے بھی زیادہ تھی باشندوں کی اکثریت ہندو ہے جو بہت وسیع پیمانے پر تجارت کرتے ہیں باوجود اس کے کہ ان پر بہت بھاری محصولات اور چونگی عائد ہیں جو ان کا اپنا ہی ایک قبیلہ نافذ کرتا ہے جس کے سپرد کراچی کے محاصل ہیں۔ یہ ایک تخریبی پالیسی ہے جو ملک بھر میں رائج ہے۔ 1809ء میں کراچی سے سرکاری خزانے کو جو آمدنی ہوئی وہ ننانوے ہزار روپے (12375 پاؤنڈ) سالانہ تھی اور اجارہ دار کے کوئی بارہ ہزار اس کے علاوہ تھے جو وہ اپنی کارگزاری کے لئے لیتا ہے۔ اول الذکر اب تک ایک لاکھ تئیس ہزار ہو چکی ہے اور موجودہ اجارہ دار کوئی بیس ہزار کما لیتا ہے۔ یہ اس جگہ کی تدریجی ترقی کا بین ثبوت ہے جو اسے اس کے سازگار محل وقوع کی وجہ سے حاصل ہو رہی ہے کیونکہ یہ ہندوستان اور مملکت کابل، ایرانی، خراسان، بلخ، بخارا وغیرہ کے قریباً وسط میں ہے۔ محمود خان قلات کے غیر مستحکم اور زوال پذیر اقتدار نے بھی اس کے دشمن سندھیوں کی آمدنی بڑھانے میں حصہ لیا ہے کیونکہ شمالی سوداگروں نے اس کے علاقوں میں عدم تحفظ کی وجہ سے جائز محصولات کے باوجود سندھ کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

سندھ کی برآمدات کراچی سے ہی باہر جاتی ہیں اور یہی انہیں شمار کرنے کا مناسب موقع ہے۔ ملکی پیداوار کی برآمدات شورہ، نمک، چاول، کپاس، گھی، تیل، تیل کے بیج، مچھلی کے پر، رنگنے کا چھلکا، القلی، سادہ سفید سوتی کپڑا (کیلی کو۔کالی کٹ کا) اور نمدوں پر مشتمل ہیں اور شمالی صوبوں اور سلطنتوں کی برآمدات رال، زعفران، گھوڑے، چمڑا، کھالیں، مجیٹھ، مشک نافہ، پھٹکڑی، مختلف قسم کی ادویات، کشمیری شالوں، خشک میوہ، جواہرات، لاجورد اور فیروزہ اور دیگر قیمتی ہیروں اور گوند وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہندوستان سے درآمدات لوہا، ٹین فولاد، سیسہ، تانبا، ہاتھی دانت، چائے، چینی، ہر قسم کے مصالحہ جات، چھینٹ، بانات، شیشہ، چینی کے برتن، ناریل، نیل، چھالیہ ململ، زری کا کپڑا، ڈھالیں وغیرہ وغیرہ ہیں جو زیادہ تر مذکورہ برآمدات کے بدلے آتی ہیں۔ خراسان، مکران، ایران اور عرب سے سندھی تلواریں، ریشم، دریاں، کھجوریں، عرق گلاب، مربہ جات، تمباکو، قہوہ اور قلیان لیتے ہیں۔

کراچی کے اطراف کی سطح ہموار ہے (قلعہ کے شمالی، مشرقی اور جنوبی پہلوؤں پر) اور شمال اور مشرق میں آٹھ دس میل اور جنوب میں سمندر تک پھیلی ہوئی ہے چونکہ سندھ میں مشن کی آمد سے پہلے تین موسموں سے خشک سالی رہی تھی لہٰذا زمین جلی ہوئی تھی اور اس پر اُگنے کا نشان تک نہ تھا سوائے اس کے کہ چھوٹی چھوٹی محروم افزائش جھاڑیاں میدان کے سینے سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھیں لیکن میں نے ایک دو کنوئیں دیکھے جن کے گرد ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے اور باشندوں نے ہمیں یقین دلایا کہ موسلا دھار بارش کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر پوری زمین گھاس کی زربفتی چادر اوڑھ لے گی۔ یہ میدان سواری کے لئے بہترین ہے اس لئے کہ اس کی زمین میں نہ پتھر ہیں نہ دراڑیں۔ اسی لئے ہم اپنے شکاری کتے لے کر اکثر باہر نکل جاتے تھے لیکن ہمیں صرف ایک دفعہ ایک گیدڑ نظر آیا جس کے پیچھے ہم نے گھوڑے ڈالے لیکن وہ بھی ایک کنوئیں میں کود کر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ آگے اندر کی طرف گیدڑ، لومڑ، جنگلی سؤر، ہرن اور دیگر جانور بہت تھے لیکن ہم آگے نہ جا سکے۔

(3)

کراچی اگرچہ کوئی بڑا شہر نہیں ہے مگر اس کی تجارت بہت ہے۔ اس کے اردگرد مٹی کی دیوار ہے جس پر برجیاں بھی بنی ہیں اور ان پر بھاری توپیں نصب ہیں گردونواح بہت کھلا علاقہ ہے اور زیادہ تر

جھونپڑے بنے ہوئے ہیں جن میں ماہی گیر اور ملاح رہتے ہیں۔ اس بندرگاہ پر تقریباً ایک سو بحری جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں جو ہر سائز اور ہر قسم کے ہیں۔ یہاں سے جہاز دمن، بمبئی، کالی کٹ بلکہ گوادر اور مسقط بھی جاتے ہیں۔ یہ بندرگاہ تقریباً دو میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے آگے شہر ہے۔ بندرگاہ سے داخل ہونے کے بعد ایک اونچی پہاڑی پر منوڑہ (Manorahy) کا قلعہ ہے۔ جہاں پر (Jukias) کی چھوٹی سی فوجی ٹکڑی تعینات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر اور بھی توپیں ہیں لیکن یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ ان کو کس طرح سے زیر استعمال لایا جاتا ہے۔ پہاڑی ڈھلوان کی شکل میں ساحل تک آتی ہے اور ایک جانب شہر کو جاتی ہے جہاں پر ایک گول برجی ہے کہتے ہیں کہ اس پر چار توپیں نصب ہیں۔ اس طرح سے بندرگاہ کا تحفظ کیا جاتا ہے جس کی متذکرہ بالا داخل ہونے کی جگہ منوڑہ پہاڑی کے بالمقابل ہے۔ کراچی کی آب و ہوا ٹھنڈی ہے اور بڑی دلچسپی کی حامل ہے۔ اس بات میں ذرا سا ہی شبہ ہے کہ یہ اسکندر کی بندرگاہ ہے۔ جہاں پر ہندوستانی سمندروں میں جہاز رانی کرنے والے پہلے یورپی ایڈمرل نیر کس (Nearchus) نے کچھ عرصہ پناہ لی تھی۔ (سی۔میسن۔I، صفحات 7-470)

(4)

پرانے قلعہ سے ایک خلیج تین میل اندر کی جانب جاتی ہے، اور اندر جا کر کچھ اس طرح سے تقسیم در تقسیم ہوتی ہے کہ بعض جگہ آبنائے بہت باریک ہو جاتی ہے اور خشکی کے حصے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے معلوم ہوتے ہیں۔ شہر کراچی جو ساحل سے صرف تین سو قدم کے فاصلے پر ہے یہ قدیم شہر کروکولا (Crocola) کے کھنڈرات پر قائم ہے۔ یہ چھوٹا سا تنگ اور گندا شہر ہے۔ یہاں تقریباً چودہ ہزار باشندے آباد ہیں۔ (نو ہزار ہندو ہیں اور تقریباً پانچ ہزار مسلمان ہیں) یہ سب ہی تجارت سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ماہی گیری اور ملاحی سے بھی وابستہ ہیں۔ پہلے یہاں پر مسقط سے بلائے جانے والے غلاموں کی تجارت کافی ہوتی تھی نیز حبشی غلاموں کو زنجبار (Zangibar) سے بھی سندھ میں لایا جاتا تھا۔ ان کی تعداد 600 سے 700 کے درمیان تھی جس میں سے تین چوتھائی لڑکیاں تھیں۔ ہر سال اتنی ہی تعداد میں غلام لائے جاتے تھے۔ جار جیائی نسل کے لوگوں کو عموماً امیروں کی حرم کے لئے لایا جاتا تھا۔ کسی خوبصورت حبشی لڑکی کی قیمت تقریباً 250 روپے ہوتی تھی۔ جبکہ لڑکے 60 روپے سے 100 روپے کے درمیان فروخت کئے جاتے تھے۔ شہر کے مشرقی سرے پر ایک مسجد اور

تالاب ہیں۔تالاب خشک ہےلیکن چند کھجوروں، کیلوں، املی اور تمارسک (Tamarisk) کے درخت اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہاں فطرت مکمل طور پر مردہ نہیں ہے۔شہر سے دومیل دور فوجیوں کی چھاؤنی ہے جس میں اس وقت 2000 آدمی موجود ہیں آج کل یہاں صرف چند گھر ہی پتھر کے بنے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر مٹی اور لکڑی سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ جگہ یورپی فوجیوں کے لئے مخصوص ہے۔گزری کریک (Ghisry Creek) بھی کافی اچھی جگہ ہے۔ یہاں پر خالص ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی ہےاور سمندری نظارہ،جسم روح کوتازہ کر دیتا ہے۔تازہ پانی ایک زیرزمین چشمے کے ذریعہ شہر سے چھاؤنی میں مہیا کیا جاتا ہے۔ جوایک پندرہ فٹ چوڑے نالے کے ذریعہ لایا جاتا ہے۔ ہر جانب کھارا میدان نظر آتا ہے۔مشرق سے مغرب کی جانب پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جوشمال کی جانب پہنچ کر کسی کٹہرے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔آسمان پر مشکل سے ہی بادل نظر آتے ہیں البتہ برساتی موسم میں ضرور آجاتے ہیں اور درجہ حرارت کبھی کبھار ہی (Fahr 95) کے اوپر جاتا ہے۔ سارا سال بغیر بارش کے گزر جاتا ہے۔جتنی بھی تھوڑی بہت زراعت یہاں پر ہوتی ہے وہ ایرانی رہٹوں سے آنے والے پانی سے ہوتی ہے۔مئی سے ستمبر تک خشک ہوا ریتیلے میدانوں سے دھول کے سیاہ بادل اُٹھالاتی ہے۔توپخانہ اور 22 ویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس شہر میں دوران قیام تو صرف ان ہی کا مہمان بن کے رہوں۔ میں اگلے دن تک ورنر (Werner) سے ملاقات نہ کر پایا۔اپنے جہاز سے اُترنے سے قبل ہی وہ اپنی اہلیہ سے محروم ہوگیا اور خودکو بچانے کی غرض سے اس کو میرے ہوا پیما (barometer) کی قربانی بھی دینی پڑی۔

اس کیمپ میں جہاں سارے ہی لوگ خیموں میں رہتے ہیں۔ ہمارا وقت خالصتاً فوجی انداز میں گزرا، اور سر چارلس نیپئر (Sir Charles Napier) جیسے ماہر جنرل کے ساتھ ہماری ملاقات کسی بھی طرح سے غیر سودمند اور بے فائدہ نہیں ہوسکتی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری آمد کے دو روز بعد ہی راکٹوں کا معائنہ کرنے کے دوران ایک راکٹ اپنے خول سے چل پڑا اور جنرل کی ٹانگ کو سخت زخمی کر دیا۔گوکہ میں چارجر کے قریب ہی کھڑا تھا مگر میں بھاگ لیا، اور مجھے معمولی سی خراش بھی نہیں آئی۔ان دنوں میں اکثر گھوڑے پر سوار ہو کر مختلف سمتوں میں نکل جایا کرتا تھا اور اکثر اوقات شہر کو چلا جاتا۔ میں یہاں کے لوگوں کی اچھی جسامت سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ وہ لوگ بہت خوبصورت تھے اور ریشم یا سوتی کپڑے کی ٹوپیاں پہنا کرتے تھے جوسونے یا چاندی سے مزین ہوتی

تھیں۔عورتیں ان کی طرح سے خوبصورت نہیں ہوتیں لیکن وہ بھی دراز قد ہوتی ہیں اور لمبے مگر میلے کچیلے کپڑے پہنا کرتی ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ یہاں اخلاقی نقطہ نظر کے لوگ بہت بدنام ہیں۔

میری دلچسپ سیروں میں سے ایک سیر، مگرمچھوں کے تالاب یعنی مگرمچھوں کے تالاب تک گھڑسواری تھی جو مگر تلاؤ(Maggor Talao) یا پیر منگر (Peer Mangar) میں ہے۔ یہ جگہ شہر سے دس میل شمال میں ہے اور مقامی لوگوں کے لئے زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ میرے ساتھی کیپٹن ویسٹ (Captain West) نے ایک اونٹ کو سواری کے لئے منتخب کیا جبکہ میں گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ واپسی پر ہم اپنی اپنی سواریاں تبدیل کر لیں گے۔ ہمارا راہنما ایک عربی شخص تھا جو خوش شکل تھا اور سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔اس کے کپڑوں پر سینے پر کشیدہ کاری ہوئی تھی۔ وہ زین پر آگے بیٹھ گیا۔میرے دوست نے پیچھے کی نشست پر قبضہ کر لیا۔ پھر ہم چل پڑے۔کبھی اونٹ آگے نکل جاتا کبھی ہم بھاگ کر آگے ہو جاتے تھے۔

اپنے خیموں سے نکلنے کے فوراً بعد ہم چند ایسے جھونپڑوں کے پاس پہنچ گئے جو کھجوروں کے درختوں کے سائے میں قائم تھے۔ان کے ساتھ ساتھ کیلوں اور تمارسک (Tamarisks) کے بھی درخت تھے اناج کے کھیت دور دور تک بڑی بڑی حالت میں پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ پھر سندھ کی ایک خشک شاخ کو عبور کیا گیا جو پچاس فٹ چوڑی تھی۔ابھی ہمیں دو میل کا فاصلہ اور طے کرنا تھا۔ دو سو فٹ اونچی بنجر پہاڑیاں ہمارے سامنے کھڑی تھیں۔ان کا رخ مشرق سے مغرب کی جانب تھا۔ان پہاڑیوں کی چوٹی سے ہمیں پورا شہر کراچی، وادی سندھ اور سمندر نظر آتا تھا۔اس سواری کے دوران ہم چٹانوں اور تنگ راستوں سے ہوتے ہوئے گزرے۔ یہاں پر ہمیں جنگلی کبوتروں، گدھ یا کرگسوں (Vultures)، اور بکریوں کے گلوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا، اس دوران تمام چرواہے اور چند ایک سیاح جو ہم سے وہاں پر ملے وہ سب ہی اسلحہ بند تھے۔

دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک اور پہاڑی پر پہنچ گئے جہاں سے ہمیں 1000 قدم چوڑی خوبصورت وادی نظر آئی۔ جو پہاڑی سلسلوں کے درمیان ان کے ساتھ ساتھ ہی چلی جارہی تھی۔کافی نیچے دائیں جانب کھجوروں کا جنگل تھا۔صوفیوں کی قبروں پر نیلے اور سفید گنبد سایہ کئے ہوئے تھے کہ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پر کافی عرصہ قبل زبردست کاشتکاری رہی ہوگی۔ کچھ جھونپڑیوں

سے گزرنے کے بعد ہم 200 قدم لمبے اور 50 قدم چوڑے تالاب پر جا کر رک گئے۔ یہاں پر گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس میں بہت ہی کم پانی تھا۔ یہ پانی ایک معدنی آبشار سے آتا ہے جو اس جگہ سے ایک میل دور کسی چٹان سے نکلتا ہے۔ یہ پانی اتنا گرم ہوتا ہے کہ اس میں ہاتھ رکھنا مشکل ہے۔ اپنے ماخذ سے نکلنے کے بعد یہ پانی صرف چند میل تک سطح پر موجود رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ ایک چٹان کے اندر اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ وہاں سے بھی یہ خود ہی باہر آ جاتا ہے۔ اس وقت اس کا درجہ حرارت 90 فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔ وہاں سے یہ کچھ مقبروں سے ہوتا ہوا تالاب میں آ جاتا ہے۔ اس تالاب میں تقریباً پچاس سے بھی زیادہ مگرمچھ ہیں جو بیس فٹ سے بھی زیادہ لمبے ہیں۔ ان جانوروں کو بہت مقدس مانا جاتا ہے اور زائرین کو ان کا دیدار کرنے اور ان کی تسکین کرنے کے لئے ایک بکری کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ جانور فقیروں کے خصوصی اختیار میں ہوتے ہیں۔ جب یہ ننگے گندے فقیر اپنی خدمات پیش کرنے آتے ہیں تو ہم مشکل سے ہی خود کو ان سے بچا پاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بانسریاں بجاتے ہیں تاکہ بے قرار مگرمچھوں کو باہر لے آئیں اور بڑے افسردہ انداز میں چیختے ہیں کہ ''اوہ! اوہ! آجا، آجا۔'' ان میں سے تیس سے زیادہ تو پانی سے باہر بھی آ جاتے ہیں اور کسی کتے کی مانند دائرے کی شکل اختیار کرتے ہوئے اپنے مالکان کے قدموں میں لیٹ جاتے ہیں۔ ان جانوروں کو خود سے چار قدم کے فاصلے پر دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے لیکن یہ ذرا سا بھی چھیڑنے پر واپس بھاگ جاتے ہیں۔ اس دوران میں ہمارے راہنما نے ہمارے لئے ایک روپے کے عوض بکری خریدی۔ اسے موقع پر ہی ذبح کر دیا گیا اور مگرمچھوں کے درمیان ڈال دیا گیا۔ جنہوں نے اسے نوچنا شروع کر دیا اور اس کوشش میں ان کے اپنے جسم آپس میں زبردست ٹکرانے لگے، اور ان میں سے بعض تو بالکل ہی بل کھا گئے۔ پھر جب وہ سارا مال ہضم کر گئے تو فقیر ان کو تالاب میں واپس لے گیا۔ ان میں سے سب سے بڑا اور سب سے مقدس مگرمچھ تقریباً پچیس فٹ لمبا تھا اور اسے تالاب کے نشیبی علاقے میں رکھا گیا تھا۔

اس منظر کو دیکھنے کے بعد ہم نے صوفیوں کے مقابر کا دورہ کیا۔ وہ پتھر کے بنے ہوئے تھے اور رنگین ٹائیلوں کا کام ہوا تھا اور ان کو جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گنبدوں سے مزین کیا گیا تھا، وہ بمشکل بیس فٹ اونچے ہوں گے۔ ان کے پہلو میں بس اتنا ہی بڑا کمرہ تھا کہ چند افراد اور قبروں کے تعویذ یا بڑے پتھر اس میں آ سکیں۔ یہاں داخلے سے قبل ایک چھوٹا سا دروازہ آتا ہے جو لکڑی کے

ستونوں پر قائم ہے۔ قبر کا تعویذ یا پتھر نقش و نگار سے سجایا گیا ہے اور ہر قسم کے خوبصورت پتھر، دھاگے، گھنٹیاں، دِیے اور دیگر چیزیں یہاں پر موجود ہیں۔ بڑے مقبرے کے دروازے پر ایک لمبی گھنی داڑھی والا فقیر لیٹا ہوا تھا جو ہماری آمد پر اُٹھ بیٹھا۔ جب ہم نے اس سے ان عمارتوں کے بارے پوچھا تو اس نے ہمیں یقین دلایا کہ یہ آثار 2000 برس پرانے ہیں۔ تالاب کے ساتھ ہی ایک موٹا اور تین آور املی کا درخت موجود تھا۔ جس کی جڑیں پانچ فٹ اونچی اور بائیس فٹ تک دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم کچھ دیر اس کے سائے میں بیٹھ گئے اور ذرا تازہ دم ہو لئے۔ ہم نے اپنے گھروں میں موجود اپنے عزیزوں کا جام صحت پیا۔ 90 کے درجہ حرارت میں جھلستے ہوئے ہم لوگ واپس ہوئے مگر خوش قسمتی سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مجھے اونٹ پر بیٹھنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ لیکن یہ جانور بڑی تیزی سے مجھے گھر تک لے آیا جس پر میں اپنی ساری تکلیف بھول گیا اور ایک گھنٹے سے زائد وقت میں میں بڑے آرام سے اپنے خیمے میں موجود تھا۔ (ایل۔ اورچ۔ I، صفحات 85-79)

(5)

کیمپ بنانے سے قبل ہم ذرا مقامی قصبے کراچی پر نظر تو ڈال لیں۔ تمہیں علم ہونا چاہئے کہ یہ وہی شہر کہ جسے ڈارلمپل (Darlymple) کے عہد 1795ء میں کرانچی (Crontchey) یا کرانجی (Caranjee) کہتے تھے۔ یہ وہی کروکلا (Krokala) ہے کہ جسے نیرکس (Nearchus) نے مکران اور فارس کے لئے بذریعہ تری روانہ ہونے سے قبل پرانے نقشوں میں الکسندری پورٹس (Alexandri Portus) بیان کیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ یہ آج بھی کراکلاہ (Krakaleh) کہلاتا ہے۔ اس نظریئے پر دو اعتراضات ہیں۔ پہلا یہ کہ کراچی کو کسی جوکیہ سردار (Jokia Chief) کی بیوی مائی مرادی نے صرف ڈیڑھ سو سال قبل تعمیر کرایا اور اس کے گرد چار دیواری لگائی۔ اس سے قبل ماہی گیر اپنی کشتیوں کے تختوں پر ہی رہا کرتے تھے۔ قلعہ منوڑہ کی تاریخ بناء بھی 1797ء کی ہے۔ دوسرے یہ کہ آثار قدیمہ کا یہاں پر یا اس کے اردگرد کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔ دوسری جانب 2000 برس کا عرصہ پورے علاقے کی ہیئت بھی تبدیل کرسکتا ہے یا پھر پانی کے ذرائع کو بہت نیچے تک بھی دفن کرسکتا ہے۔

تم ذرا ان کستوری مچھلیوں کے خولوں کی لکیروں کا مشاہدہ کرو، جن سے ساحل کی نشاندہی ہوتی ہےاور ہم کونے کھدرے میں نظر آنے والے زندہ صدف نما جانوروں کے خولوں کا بھی مشاہدہ کرو۔

جب میں نے پہلی بار کراچی کو دیکھا تو یہ ڈیڑھ سومیل قبل کے اسکندریہ کے مطابق تھا۔ یہاں پر بے شمار گڑھے اور سوراخ تھے، اور مٹی کے بنے ہوئے مکانات بھی ایسے تھے کہ بغیر کھڑکی کی مٹی دیواریں تھیں اور موٹی مٹی کی چھتیں تھیں۔ یہ ایک ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ کاہگل (Kahgil) نامی اس مٹی کو سورج میں تپا کر اینٹ بنایا جاتا ہے اور دریائی مٹی سے اس پر لیپائی پوتائی کر دی جاتی ہے، اور یوں یہ استعمال کے قابل ہو جاتی ہے۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں ذرا سی محنت سے اس کو توڑ کر ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس مٹی میں گرمی اور سردی دونوں طرح کی حرارت ہوتی ہے لہٰذا اسے پورے سندھ میں بلکہ وسطی ایشیا تک بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اسی سے قلعہ اور سرکاری شہر بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ قبل ازیں اسے جھونپڑیوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ مٹی لیاری دریا کے دونوں کناروں پر سٹال کی جانب بہت بڑی تعداد میں موجود ہے۔ اسی طرح مغرب میں کریک کے سرے تک آپ کو یہی مٹی مل جائے گی۔

یہاں کے لوگ، ہندوستانی لوگوں سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ان کی ساخت خالص ایرانی نوعیت کی ہے اور ان کا رنگ روپ جنوبی آریاؤں کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ ان کے خدوخال درست ہیں۔ جزیرہ اعظم کے تورانیوں کے برعکس ان کے بال کافی گھنے اور کالے ہیں۔ ان کی داڑھی موٹی، چمکیلی اور گھنگھریالی ہوتی ہے۔ جسامت مردانہ اور بھاری بھرکم ہوتی ہے۔ تم یہاں کے مسلمانوں کو ان کی داڑھیوں، ننگے پیروں، لمبے کرتوں وغیرہ سے پہچان سکتے ہو۔ وہ سندھی ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اب یہاں پر سرائیکی ٹوپی کا رواج ہونے لگا ہے جو تقریباً گیارہ انچ کی ہوتی ہے۔ ہندوؤں کو ان کی صاف رنگ کی بناء پر شناخت کیا جا سکتا ہے، یا پھر ان کے رنگ پیلے ہوتے ہیں۔ وہ زنار باندھتے ہیں جو بائیں کندھے سے شروع ہو کر دائیں جانب آ جاتا ہے۔ افریقی غلاموں کی اولادیں ہمیں ہر جگہ نظر آئیں۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی پشتوں پر پانی کے بھاری مشکیزے اُٹھائے ہوئے تھے یا پھر اتنا زیادہ وزن ان پر لاد دیا گیا تھا جو صرف ایک بیل ہی کھینچ سکتا ہے۔ موہانہ (Mohana) ذات کے مچھیروں کی عورتوں نے چادریں، انگیہ، سرخ قمیصیں اور رنگین ریشمی پاجامے پہن رکھے تھے جو ٹخنے پر سے تنگ تھے۔ کافی خوبیوں والی اس نسل کی عورتیں گلیوں میں کبھی

کبھار ہی نقاب پہنتی تھیں۔ ان کی رائے زنی کبھی انقلابی نہیں ہوتی اور ایسا ہونا مشرق میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

کراچی کی آبادی اب تو 6000 سے بڑھ کر 45000 ہوگئی ہے، اور یہ بہت بڑا شہر بن گیا ہے۔ آس پاس نواحی علاقے ختم کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ہیئت میں شمال کے رخ پر کسی کلہاڑے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ یہاں استعمال ہونے والا مواد ابھی تک وہی پرانا ہے۔ یعنی پرانی بوسیدہ مٹی جو پتھروں کی بنیادوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ البتہ اس پر چونا اور سفیدی بھی کی جانے لگی ہے۔ بازاروں کے علاوہ باقی تمام تنگ و تاریک گلیوں کو بہتر بنا دیا گیا ہے۔ گلیاں چوڑی، کشادہ اور گندی ہیں۔ ہر ایک کا اپنا نام ہے نیز مختلف پیروں یا صوفیوں کے مزارات بھی سجائے گئے ہیں۔ یہ شہر بمبئی کی طرح لگتا ہے۔ مثلاً ایک یا دو ہندوؤں کے مقامات یا پھر نئی مارکیٹیں یا ایک بڑا سا اسکول اور کچھ مقامی پولیس اسٹیشن ابھی تو اس کو آگ دیوتا یعنی اگنی دیوتا کے فضل سے اور بھی بہتر بنایا جائے گا۔ صرف کل ہی لیاری کی دائیں طرف کا علاقہ کافی بہتر کر دیا گیا۔

دریا کے کنارے کے پاس علی اکبر اسٹریٹ سے نکل کر چھاؤنی جاتے ہوئے ہم ایک نئی ہندو دیوار سے گزرے جو بہت اونچی تھی اور اس پر سفیدی بھی ہوگئی تھی۔ پھر چرچ مشن گھر، اسکول اور ایک اور چرچ آتا ہے۔ پھر گورنمنٹ اسکول آتا ہے کہ اوپر بڑا بڑا سا گھڑیال بھی بنا ہوا ہے۔ پھر نیا دھرم شالہ آتا ہے جو ایک مقامی آدمی نے بنایا ہے۔ اس کے گنبد بھی بڑے اچھے ہیں جو سندھی مزارات کی عکاسی کرتے ہیں۔ دائیں جانب بندر روڈ ہے جو بندرگاہ کو ''گاڑی کھاتہ روڈ'' سے ملاتا ہے، اور وہاں سے آگے لوہے کی فیکٹری اور انجینئرنگ ورکس تک جاتا ہے جو سارے شہر ڈیوڈ مکنزی (Mr. David Mackenzie) کے ہیں۔ اسی نے نیپئر کے بیرکس بنائے تھے اور اب وہ سرکاری ریلوے اسٹیشن بنا رہا ہے یہیں پر ٹیلی گراف کا دفتر بھی ہے جس میں ایک بڑا سا سگنل اسٹاف کا دفتر اور ڈاکخانہ بھی قائم ہے۔ ان چیزوں کا کاروبار بہت وسیع ہو جائے گا۔ پھر ہم باغات کی جانب متوجہ ہوئے۔ یہاں پر ناریلوں کے بڑے بڑے درخت تھے۔ آگے ایک بہت بڑی ٹینکی بھی ہے جو بارش سے پوری بھر جاتی ہے اور یہ رام باغ میں بڑی دلچسپ چیز بنی ہوئی ہے یعنی رام چندر کا باغ۔ اس رام چندر کو پرشو رام سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ جو 1176ء قبل مسیح میں گزرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عظیم ہیرو اور نیم دیوتا جس کا نام چاند سے ماخوذ

ہے وہ چند ہزار برس قبل ایک رات یہاں سے گزرا تھا۔ ہمارے خیال میں اس کا دور 961ء نکلتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب وہ اور اس کی پیاری بیوی سیتا، خانہ بدوشوں کی طرح یہاں وہاں گزر بسر کیا کرتے تھے اور اس ناخوش وادی سے گزرا کرتے تھے۔

بائیں جانب رنچھوڑ لائن ہے۔ یہ جگہ رہائشی اعتبار سے اس رام باغ اور مشنری مسیحی چرچ سے بالکل مختلف ہے۔ پھر ہم پرانے قبرستان گئے۔ یہ عمارت اب اسمال کازکورٹ (Small Cause Court) بن چکی ہے۔ پھر ہم سیاحوں کے بنگلے پر گئے جس کا خطوط میں بہت تذکرہ ہے۔ اس کے جنوب میں دو کوٹھریاں ہیں اور شمال میں ایک بڑا سا بلاک بنا ہوا ہے جس میں ایک بلیرڈ روم بھی ہے۔ اب کچہری روڈ سے آگے کراچی میں کوئی اور چیز بیان کرنے لائق نہ ہے۔ یہاں سے ایک میل دور دھول سے بھری ہوئی شاہراہ عام ہے۔ یہاں سے گھوم پھر کر ہم واپس اپنے کیمپ میں آ گئے۔ (آر۔ برٹن۔Sindh Revisisted، صفحات 43-50)

سہون

(1)

شہر سہون دریائے سندھ سے دو میل کے فاصلے پر سطح مرتفع پر قائم ہے، اور دریائے سندھ کی اس شاخ کے بالکل ساتھ ہے کہ جسے ارول (Arul) کہتے ہیں یہ شاخ لاڑکانہ کی جانب سے بہتی چلی آتی ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً 10,000 ہے۔ اس کے شمال میں صرف ایک ہی قلعہ ہے۔ سہون کو کسی دور میں سیوستان کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ بہت قدیم ہے۔ اس کے اردگرد بہت سی مساجد اور مقابر کے کھنڈرات ہیں جو اس کی عظمت رفتہ کی گواہی دیتے تھے۔ لیکن جب سے یہ صوبے کے امیر کی نشست گاہ نہیں رہا تب سے ہی اس کی شان و شوکت کم ہو چکی ہے۔ عہد مغلیہ میں امیر یا گورنر یہاں پر باقاعدہ دربار منعقد کیا کرتا تھا چونکہ یہ لکی (Lukkee) کی پہاڑیوں کے قریب واقع ہے اس لئے میرے خیال میں یہ شہر وہی ہے جسے اسکندر اعظم نے ہندوستانی پہاڑیوں کے راجہ سمبس (Raja Sambus) کا شہر بتایا ہے۔ سندومنی (Sindomanni) کی اصطلاح جنوبی سندھ کے باشندوں کے لئے استعمال نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس خطے کا نام ہمیشہ پٹالہ (Pattala) بتایا گیا ہے، اور ان کا حکمران ''پٹالویوں کا راجہ'' بتایا گیا ہے۔ سندھی (Sindee) یہاں کے قدیمی باشندوں (ادے واسیوں) کے لئے استعمال ہونے

والی جدید اصطلاح ہے۔

سہون خراسان کے مقدس صوفی کے مقبرے کی وجہ سے بہت مشہور ہے جس کا نام لال شہباز تھا۔ وہ یہاں پر 600 برس قبل آیا تھا۔ اس کی زیارت گاہ شہر کے وسط میں قائم ہے اور ایک چوکور عمارت کے ایک کونے میں مضبوط گنبد کے نیچے ہے۔ یہ عمارت بہت خوبصورتی سے نیلے محرابی پتھروں سے بنائی گئی ہے جو ڈچ ٹائیلوں کے مشابہ ہیں جس کی وجہ سے اسے کافی شہرت ملی ہے۔ ایک سنہری چادر جس پر سرخ سوتی کپڑے کی دو چادریں بھی ہوتی ہیں وہ خاص مرقد پر ڈالی جاتی ہے اور اس کے اردگرد دیواروں پر عربی زبان میں مرحوم کی تعریف اور آیات قرآنی درج ہیں۔ اس کے علاوہ اس جگہ پر کبوتر کے انڈے، موروں کے پَر، پھول اور دیگر چیزیں بھی بنی ہیں۔ لال شہباز قلندر کا کوئی شمار نہیں۔ دریائے سندھ اس کے حکم کا محتاج ہے، اور اس کے مزار پر حاضری دیئے بغیر کوئی جہاز اس جگہ سے آگے لے جایا ہی نہیں جا سکتا۔ ہزاروں زائرین اس جگہ آتے ہیں۔ کابل اور ہندوستان کے حکمران اکثر یہاں پر حاضری دیتے ہیں۔ وہ ڈھول کہ جو صوفی کی عظمت کا نشان ہیں۔ وہ 1242ء میں بادشاہ دہلی علاءالدین نے تحفے میں بھیجے تھے چاندی کا بنا ہوا دروازہ سندھ کے مرحوم امیر کی عقیدت کا مظہر ہے۔ ضرورت مندوں کو روزانہ کسی اجنبی کے لنگر سے کھانا مل جاتا ہے۔ لیکن کثیر خیرات نے یہاں کے باشندوں کی عادتوں کو خراب کر دیا ہے کیونکہ وہ بے کار اور ناکارہ بن چکے ہیں۔ اس صوفی کے احترام میں ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''لال'' ہندو نام ہے جو مسلمانوں نے اس کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ وہ شیر جو کبھی کراچی پہاڑیوں میں رہا کرتا تھا وہ اب ایک پنجرے میں مزار کے نزدیک عام خیرات میں حصے دار بن گیا ہے۔

سہون میں اور غالباً پورے دریائے سندھ کی وادی میں واحد عمارت وہ قلعہ ہے جو اب کھنڈر بن گیا۔ وہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے اور غالباً یہ قلعہ یونانیوں کے عہد کا ہے۔ یہ زمین سے ساٹھ فٹ اونچے ٹیلے پر ہے اور اینٹوں کی بنی ہوئی چار دیواری کے اندر قائم ہے۔ اس قلعہ کی شکل بیضوی ہے جو 1200 میٹر لمبی اور 750 میٹر چوڑی ہے۔ اندر کی جانب کھنڈرات ہیں۔ اس کا راستہ شہر کی جانب ہے جو محرابی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ٹیلا فطری نہیں بلکہ مصنوعی ہے۔ کچھ فاصلے سے یہ بابل کے مجلیبی برج (Mujilebe Tower) کے مشابہ نظر آتی ہے۔ مسٹر رچ (Mr. Rich) نے بھی اپنی یادداشتوں میں ایسا ہی بتلایا ہے۔ (اے برنس۔ III، صفحات 57-55)

(2)

سہون کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ بہت قدیم شہر ہے، اور کبھی اس کے اردگرد دیوار بھی ہوتی ہوگی جواب باقی نہیں رہی البتہ اس کی بنیادیں موجود ہیں۔ یہ شہر اور اس کے اردگرد کا سارا علاقہ سیدوں کی ملکیت ہے جن کا سردار معہ تقریباً 1500 دیگر سیدوں کے ایک بہت بڑی مسجد اور وسیع مقبرے میں رہتا ہے۔ یہ مقبرہ ایک صوفی کا بتایا جاتا ہے جس کا نام ''لال شہباز قلندر'' ہے اور جو چھ سو سال قبل یہاں پر آیا تھا۔ ان سیدوں کو اپنے ضلع میں سفروں پر چونگی وصول کرنے کا اختیار ہے نیز وہ دریائے سندھ پر کسٹم بھی وصول کرتے ہیں۔ ان کا کردار و رویہ بہت روکھا اور حریص و لالچی ہے۔

سہون میں موجود واحد آثار قدیمہ، اس مصنوعی ٹیلے اور قلعے کے ہیں جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ سکندر اعظم نے اس علاقے پر اپنے حملے کے دوران میں یہ قلعہ تعمیر کیا تھا۔ لیکن یہ چونکہ ٹیلے پر قائم ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کافی بعد میں تیار کیا گیا ہے۔

یہ ٹیلا شہر کے قریب ہی مشرقی جانب موجود ہے مگر ایک گہری و تنگ گھاٹی اس کو شہر سے الگ کر دیتی ہے جو 400 گز وسیع ہے اور تقریباً 450 گز لمبی اور 330 گز چوڑی ہے اور دریائے ارول سے کم از کم 80 فٹ اونچی ہے۔ یہاں پر یہ دریا شمال سے آتا ہے۔

قلعہ کے بارے میں خیال پڑتا ہے کہ یہ جگہ کافی مضبوط اور اہمیت کی حامل رہی ہوگی، اور اس کو فتح کرنے کی ناکامی بھی اس بات کا ثبوت ہے۔ ٹیلا جو تقریباً نصف راستے تک اونچا ہے وہ دراصل ہے ہی زمین کی ڈھلوان۔ پھر بڑی بڑی اینٹیں اس کو اور اوپر کی جانب لے جاتی ہیں۔ دروازوں کے پاس تقریباً تیس برجیاں رہی ہیں اور ان سب کے درمیان 90 گز کا فاصلہ ہے۔ داخلہ صرف ایک ہی جگہ سے ہے اور مشرق کی جانب دروازے محرابی ہیں۔ اس صدر دروازے کے چار بڑے اور عریض برج ہیں جن کی بنیادیں کافی گہری ہیں۔ یہ چاروں ایک ہی درجہ تک اوپر اُٹھائے گئے ہیں۔ جو راستہ صدر دروازے تک آتا ہے۔ اس پر ایک چھت بھی ہے مگر وہ بہت خراب حالت میں ہے۔

پورا ٹیلا وقت کے اثرات سے اور سالانہ بارشوں کی وجہ سے کافی خراب اور تباہ ہوگیا ہے، اور اس میں کافی نالیاں پیدا ہوگئی ہیں جو دروازے کی جانب چلی جاتی ہیں۔ میرا خیال نہیں کہ کافی محنت کر کے بھی اس ٹیلے کو اصل حالت پر واپس لایا جاسکتا ہے۔

ٹیلے کے وسط میں دو بہت عمدہ کنوؤں کے آثار ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کبھی دریائے سندھ سہون کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہا کرتا تھا۔ دریا کی موجودہ روز بروز بدلتی ہوئی ہیئت اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ جو خیال ہے کہ اسکندر نے اس کی ایک شاخ شہر کی دیواروں کے ساتھ سے نکالی تھی وہ غالباً درست خیال ہے کیونکہ ایک ٹیلا یہ ہے اور دوسرا دریائے سندھ کے ہی کنارے آمری کے پاس بتایا جاتا ہے مشرق میں نظر آنے والی اشیاء میں یہ بالکل عجیب اور غیر ملکی نوعیت کے نظر آتے ہیں اور کسی طاقت ور حکمران (جیسے مقدونیائی حکمران) کے بنائے ہوئے ہیں کہ جنہوں نے یہ عارضی مقاصد کے لئے بنائے تھے۔ پس ڈاکٹر ونسٹ کا خیال ہے کہ یہ اسکندر کے ہی تعمیر کئے ہوئے ہیں جو اس نے دریائے سندھ کے کنارے تعمیر کئے تھے۔ اس جگہ کے باشندوں کی روایت بھی یہی ہے کہ یہ قلعہ ''سکندر کافر'' کا تیار کیا ہوا ہے۔ شہر صحیح سطح پر قائم ہے اور اس کے جنوب مشرق میں ایک میل کے فاصلے پر کچھ مقبرے وغیرہ ہیں۔ باقی سارا علاقہ پہاڑوں کے بائیں کنارے تک مساوی سطح کا ہے۔ یہ پہاڑ جنوب اور مشرق کی جانب سے شہر کی جانب بڑھے ہوئے ہیں۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحات 85-82)

(3)

یہ شہر تقریباً 100 فٹ اونچائی پر واقع ہے۔ یہاں پر کبھی دریا گزرتا ہوگا اور تب یہاں موجود پتھریلی چٹانیں اس شہر کے دفاع کے لئے کافی نہ ہوں گئیں۔ ہم لوگ فوراً ہی شہر اور پرانا قلعہ دیکھنے روانہ ہوگئے۔ جو جنوب مشرق میں دریا کے کنارے 160 فٹ کی بلندی پر ہیں۔ قلعہ کو ایک گہری گھاٹی شہر سے الگ کرتی ہے۔ اس کی فطری صورت حال اتنی اچھی ہے کہ ہم بہت آسانی سے یہ بات مان سکتے ہیں کہ اسکندر اعظم نے یہاں پر کوئی آبادی قائم کی ہوگی۔ قلعہ کے کھنڈرات البتہ کافی بعد کے دور کے ہیں۔ اپنی ساخت کے حوالے سے یہ حیدرآباد کے قلعہ کے مشابہ ہے، اور غالباً عہد مغلیہ کا ہے۔ اس کے محراب (Vaults) اور مضبوط دیواریں اور اچھے طریقے سے بنائی گئی اینٹیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسے کسی ماہر کاریگر نے بنایا ہے۔ یہ بات آسان نہیں ہے کہ اس کی ہیئت کا اندازہ لگالیا جائے۔ بہرحال خیال یہ ہے کہ یہ بیضوی شکل کا ہو۔

ہم گردآلود ہوتے ہوئے قلعہ سے شہر کی جانب گئے جہاں کافی شور شرابہ تھا۔ وہاں ہم لال شہباز

کے مزار پر گئے جو خراسان کا صوفی تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ 600 سال قبل یہاں آیا اور یہیں دفن ہوا۔ نیز اس کے معجزات بھی بڑے مشہور ہیں افغانستان اور ہندوستان بھر سے زائرین یہاں پر آتے ہیں۔ بلکہ ان ممالک کے حکمران بھی عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے متولی اس حد تک خرافاتی باتیں بیان کرتے ہیں کہ دریائے سندھ بھی اس صوفی کا کہنا مانتا ہے، اور اس کو نذرانہ ادا کئے بغیر کوئی بحری جہاز یہاں سے گزر بھی نہیں سکتا۔ داخل ہونے والے راستے پر گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ جب ہم پختہ صحن میں آئے تو ہم نے دیکھا کہ چند سینکڑوں آدمی اور لڑکے ڈھول کی تاپ پر رقص کر رہے ہیں اور دیوانگی میں بھاگتے جا رہے ہیں۔ چیخ و پکار کے دوران آتش بازیاں بھی چھوڑ رہے ہیں۔ جلد ہی ہمیں مجمع نے گھیر لیا، اور ہم پر زور دینے لگے کہ ہم اپنے جوتے اُتار دیں۔ لیکن میرے ساتھیوں کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی کہ مسلمانوں کو اپنی پگڑیاں اُتارنے کے لئے نہیں کہا جاتا۔ ان جنونیوں میں سے اکثر نشے کی حالت میں تھے۔ ہم نے قبر کو دیکھنے کی اپنی نیت کو چھوڑ دیا اور رات کی تاریکی میں اپنے بحری جہاز میں واپس چلے آئے۔ (ایل۔ اورلچ۔ I، صفحات 116-115)

خیر پور

(1)

یہ جگہ جو دراصل ایک چھاؤنی ہے بڑی اہمیت کی حامل ہے جس میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ یہ ایک سردار میر سہراب کا دارالحکومت بن گیا۔ وہ اپنے آپ کو شمالی سندھ کا امیر کہلواتا تھا۔ یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہاں پر بہت گھنے درخت ہیں جس کی وجہ سے کوئی گھر نظر بھی نہیں آتا۔ یہاں تک کے سارے مکانات، باغات اور قبریں (Graves) ڈھکے پڑے ہیں اور کافی بے ترتیبی سے قائم ہیں۔ یہاں کے بازار غیر ملکی اور مقامی پیداواروں اور برطانوی مصنوعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ چیزیں یہاں پر بڑی آزادی سے مہیا کی جاتی ہیں۔ اس جگہ کی تجارت بہت وسیع ہے اور اس میں ہندوؤں کو کافی مہارت حاصل ہے۔ اگر یہ شہر دریا کے کنارے لگا ہوتا تو یہاں والوں کے ہاتھ سونوں سے بھرے ہوتے۔ بازاروں کے بالکل وسط میں میر سہراب کا محل ہے۔ یہ بہت بڑی جگہ پر واقع ہے اور قلعہ نما دیواروں کے اندر بنا ہے۔ باہر سے دیکھا جائے تو قابل ذکر جگہ صرف مسجد ہی دکھائی پڑتی ہے جو سبز اور زرد رنگ کی ٹائیلوں سے سجائی گئی ہے۔ خیر پور گندی جگہ ہے اور صحت کے لئے موزوں نہیں ہے۔

البتہ اسی وجہ سے یہاں پر آم، میموسہ (Mimosa) اور دیگر پھلوں کے درخت بھی بڑی کثرت سے ہیں۔ پینے کے لئے لوگ جو پانی استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی بہت خراب ہے۔لیکن میر کے پاس اپنی رہائش کے اندر اپنا ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت اچھا ہے اور حیدرآباد میں اس کے رشتہ داروں کو بھی اکثر و بیشتر اسی کنویں سے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔(سی۔میسن۔I،صفحات 263-64)

(2)

خیر پور جدید شہر جسے تالپور سردار سہراب نے بنایا تھا۔اس نے سندھ کے شمالی علاقے پر قبضہ کرلیا تھا،اور کلہوڑوں کو نکال دیا۔اس کی آبادی تقریباً15,000افراد پر مشتمل ہے۔ جو تنگ و تاریک گلیوں میں رہتی ہے۔ یہ گلیاں،قلعہ کا دفاعی نوعیت کا کردار ادا کرتی ہیں۔ ہاں البتہ روشنی میں ایک فٹ موٹی دیوار سے امیر اور اس کے خاندان کی رہائش گاہ کی علیحدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس شہر کے آس پاس کا علاقہ خاردار اور سپاٹ ہے۔شہر کے اردگرد قدرے نیچے پشتے پر تیار کی گئی ہے تاکہ اس سے دریا کی طغیانی کو فاصلے پر ہی روکا جا سکے۔(اے۔برنس۔III،صفحہ 273)

(3)

یہ شہر بہت کشادہ ہے۔اس کا ایک حصہ قدرے سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہاں تقریباً تیس ہزار کی آبادی ہے۔حیدرآباد کے گردونواح کے علاقوں کی نسبت یہاں کی زمین زیادہ زرخیز اور کافی قابل کاشت ہے جس کی وجہ سے یہ مقام اور زیادہ راحت افزاء بن جاتا ہے۔البتہ یہاں کے مکانات گھٹیا درجے کے ہیں اور بڑی ہی بے قاعدگی سے بنے ہوئے ہیں۔ دریائے سندھ کا قریب ترین کنارہ، خیر پور سے مغرب میں تقریباً12 میل کے فاصلے پر ہے اور طغیانی کے وقت یہ سارا علاقہ زیرآب آ جاتا ہے۔ جبکہ جب پانی غیر معمولی طور پر زیادہ ہوگیا تو ایک دو بار تو اس شہر کو بھی زبردست خطرہ لاحق ہوگیا۔ ایک بہت بڑی نہر اس شہر کے بالکل قریب سے گزر رہی ہے جس کے ذریعہ دوران سیلاب کشتیاں شہر تک آ جاتی ہیں۔ عام حالات میں البتہ یہ نہر بالکل خشک رہتی ہے اور پھر تو اسے سڑک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے سیلاب کے دنوں میں پورا علاقہ ایسا ہو جاتا ہے کہ شہر سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور سارے لوگ شہر میں قید ہو جاتے ہیں۔اس وقت وہ اپنے ساتھ معقول تعداد میں

مویشی بھی لے آتے ہیں اور باقی زائد مویشی مشرقی سمت میں 50 میل کے فاصلے پر صحرا میں بھیج دیتے ہیں جہاں پر جون سے شروع ہونے والے چار ماہ تک وہ چراگاہوں میں رہتے ہیں۔ خیر پور میں بخار کی بیماری عام ہے۔ نہ تو یہاں پر کوئی تجارت ہے اور نہ ہی ایسی یورپی مصنوعات ہیں جو یہاں پر خریدی جاسکتی ہوں۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحہ 32)

(4)

مکانات اور گلیاں عام طور پر گندی اور بدنظمی سے تیار کردہ ہیں۔ عوامی میلوں اور مقامات پر مردار جانور کئی کئی روز تک پڑے رہتے ہیں۔ علی مراد کو سارے مشرقی طرز حکمرانی کا نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے غریب عوام کو سختی سے کچلا جاتا ہے اور شرمناک حد تک سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مگر ایک بے حس شخص کو اپنے عوام کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی، اور اگر اس امیر کا خزانہ اجازت دیتا ہو تب بھی وہ اپنے ملک اور عوام کی بھلائی کے لئے شاذ و نادر ہی کچھ کرتا ہے۔ اس طرح کے حکمران کی موجودگی میں ہم کسی قسم کی دولت، تجارت یا خوشحالی کی کیا اُمید کر سکتے ہیں۔ اسی لئے شاہی قلعے دیجی کوٹ کو فتح کرنے کے لئے ہمیں زیادہ گولہ باری درکار نہ ہوگی۔ (ایچ۔ جیمز، صفحات 50-49)

(5)

شہر خیر پور بہت زرخیز علاقے میں واقع ہے اور عمدہ باغات سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا بڑا بازار شمال سے جنوب کی جانب چند سو گز تک پھیلا ہوا ہے اور صدر دروازے سے نکل کر اتنا ہی چلنے کے بعد مشرقی جانب چند چھوٹی بازاری گلیاں بڑے بازار میں مل جاتی ہیں۔ دوکانیں قابل رحم حد تک خراب ہیں۔ کیونکہ میر علی مراد کبھی تین روز مسلسل خیر پور میں نہیں رہتا۔ اس کے کم تنخواہ دار ملازمین کو کبھی بازار میں خوش آمدید نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ اُدھار پر چیزیں خریدتے ہیں۔ اگر وہ اُدھار چیزیں لے بھی لیں تو یہ بڑی حیران کن بات ہوتی ہے اور ان اشیاء کو پھر مالیہ کی یا ٹیکس کی ادائیگی کی شکل میں لگا لیا جاتا ہے وہ بھی چھ یا آٹھ ماہ کے بعد۔ مختار کار یا وزیر اعظم اور میر منشی ہمیشہ خیر پور میں ہی رہتے ہیں کیونکہ ان کو کافی معقول تنخواہیں ملتی ہیں۔ شہر ویران ہوتا جا رہا ہے اور چند ایک دولت مند ہندو خاندانوں کے علاوہ اکثر لوگ غربت اور فقیری کا شکار نظر آ رہے ہیں۔ واحد عوامی عمارت مسجد ہے جو بہت بدنما نظر آتی ہے۔

اسے ٹائیلوں سے سجایا گیا تھا مگر اب تو اس کی مرمت بھی نہ ہوئی ہے۔گلیاں تو اتنی تنگ ہیں کہ بعض جگہوں پر آمنے سامنے سے آتے صرف چھکڑے ہی گزار سکتے ہیں۔مگر یہاں پر تو چھکڑے بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اور میر کا پرانا فیٹن (Phaeton) ہی اس کی پوری عملداری میں اس کی واحد سواری ہے۔ اگر اس کا بھی پہیہ ٹوٹ جائے تو اس کا چلنا مشکل ہوگا کیونکہ دوسری کوئی سواری ہے ہی نہیں۔ میر شاہ نواز کوچ چلانے میں بڑا ماہر ہے بلکہ ایک بار تو اس نے میری زندگی بھی خطرے میں ہی ڈال دی۔ایک اچانک موڑ پر جب ایک بوڑھی عورت نیچے آنے والی تھی تو امیر نے ایک گھر کے دروازے پر تانگہ چڑھا دیا اور گھوڑیاں بے قابو ہو گئیں۔سب لوگ بھاگ نکلے۔ٹانگہ یا بھگی دائیں جانب اُلٹ گیا۔ میں اس کے نیچے جا پڑا۔ میر شاہ نواز تو کسی توپ کے گولے کی طرح پھلانگ نکلا اسے خراش تک نہ آئی۔مگر مجھے کافی چوٹیں لگیں اور خراشیں آئیں، اور شاید میں تو مارا ہی جاتا اگر کو چوانوں اور چاندی کی سامنے والی دولکڑیوں (یعنی بمبو) نے اسی لمحے گھوڑوں کو روک نہ لیا ہوتا۔صرف چند ہندوؤں کے پاس اچھے گھر تھے۔اس کے علاوہ ان ایک یا دو مسلمانوں کے پاس بھی کہ جن کو اس وجہ سے جاگیریں مل گئیں تھیں کہ ان کی بہنیں میر علی مراد کے نکاح میں تھیں۔ جو دراصل رقاصائیں تھیں وہ اس جگہ کی آبادی کا سابقہ تخمینہ پندرہ ہزار تھا لیکن اب تو اس تعداد کی ایک تہائی آبادی بھی باقی نہ بچی ہے۔ یہاں کے لوگ عموماً غیر صحت مند ہوتے ہیں۔ غصے سے گھورتے ہیں اور طغیانی کے وقت شہر میں یا شہر کے باہر جوہڑوں کی وجہ سے اور بھی بیماریاں جنم لے لیتی ہیں۔ان جوہڑوں میں پانی تب تک کھڑا رہتا ہے کہ جب تک گرمی سے سوکھ نہ جائے۔ پینے کا پانی بھی بہت خراب ہے۔ ماسوائے ایک مخصوص کنویں کے۔ مجھے بتایا گیا کہ امیر ہمیشہ اپنا پینے کا پانی دریائے سندھ سے حاصل کرتے ہیں اور جب نہر میروا (Meerwa Canal) بھر جاتی ہے تو کنویں کے پانی پر اس کے پانی کو ترجیح دی جاتی ہے۔(ای۔اے۔لانگلے۔I،صفحات 13-211)

میر پور

(1)

تیسری سندھی ریاست کا دارالحکومت میر پور، حیدرآباد سے مشرق کی جانب تقریباً پینتالیس میل دور واقع ہے۔اس کشادہ شہر میں تقریباً دس ہزار لوگ رہتے ہیں۔ میر پور کے گردونواح کے علاقے

دریائے گونی (Goonee River) اور دریائے نلاہ (Nullah River) سے نکالی گئی نہروں سے کاشت کئے جاتے ہیں جیسلمیر سے آنے والی شاہراہ اعظم، میر پور سے گزرتی ہے اور علی مراد اس پر افیون کی چونگی وصول کرتا ہے۔ گوکہ اسے اس کا قانونی طور پر حق حاصل ہے مگر یہ کام حیدر آباد کے امیر کے نزدیک گھناؤنا جرم ہے۔ مرادعلی خان کے پاس سیہون کے مشرق شمال میں تقریباً 15 میل دور ایک گاؤں مہورا (Mhora) ہے جس کی آبادی تین ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ گوکہ یہ شہر اور اس کے گردونواح کا علاقہ دریائے سندھ کے کنارے ہے مگر حیدر آباد اور خیر پور کے امیر اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ علی مراد کو دریائے پر چونگی وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحہ 33)

(2)

تقریباً پونے دس میل چلنے کے بعد ہم میر پور پہنچے۔ یہ شہر چار دیواری میں قائم ہے اور میر علی مراد ولد میر ٹھارا کی ملکیت ہے۔ شہر کی چار دیواری (جیسا کہ سندھ کے سب گھروں اور عمارتوں کی ہوتی ہیں) مٹی کی بنی ہوئی ہے اور بہت چوڑی ہے۔ شہر میں تقریباً 300 دوکانیں ہیں اور 10,000 کی آبادی ہے۔ جب شہر کے بعض لوگوں سے پوچھا گیا کہ یہاں کے آباد لوگوں کی تعداد کتنی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس جگہ تقریباً 8000 لوگ آباد ہیں۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفر نامہ، صفحہ 195)

روہڑی

(1)

روہڑی شہر دریا کے کنارے پر واقع ہے اور بھکر کے بالکل مقابل ہے۔ تھوڑے فاصلے سے نگاہ ڈالی جائے تو یہاں کے گھر بہت پرانے ہیں۔ البتہ اندر کا شہر کافی بڑا ہے اور ایک بازار بھی ہے جہاں پر کافی چیزیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یہاں خاص قسم کا روپیہ چلتا ہے اور مخصوص پیمانے استعمال ہوتے ہیں۔ جو سندھ کے عام پیمانوں سے برتر ہوتے ہیں۔ روہڑی ایک قدیم جگہ ہے اور اس نے الور (Alor) کی جگہ حاصل کر لی ہے جو مسلمانوں کی فتح سندھ کے وقت شمالی ہند کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر کے آثار آج بھی اس کے قریب ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ (سی۔ میسن۔ I، صفحہ 363)

(2)

روہڑی کا شہر جو بھکر کے سامنے ہیں۔ دریائے سندھ کے بہت قریب ہے اور چالیس فٹ اونچائی پر واقع ہے جہاں پر گھر آباد ہیں۔ پہاڑی میں سے ایک سڑک نکلتی ہے جو دریا کے کنارے تک جاتی ہے۔ یہیں سے بھکر جایا جا سکتا ہے۔لیکن اگر دریا کی سطح بلند ہو تو اس سڑک پر اُترنا ہی بہت خطرناک ہوگا۔ روہڑی شہر میں تقریباً 8000 افراد ہیں جو زیادہ تر ہندو ہیں۔ مشرقی جانب بنجر و غیر آباد علاقہ ہے۔لیکن اس کی وجہ سے علاقے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے آگے شہر کے جنوب کی سمت بڑھتی ہوئی تین یا چار میل لمبے کھجوروں کے درخت ہیں۔ جن میں بے شمار باغات اور پھل دار درختوں کے باغ بھرے پڑے ہیں۔سکھر جو روہڑی کے بالکل مخالف سمت میں ہے۔ وہ اس شہر سے سائز میں آدھا ہے۔ گزشتہ برسوں یہ دونوں ہی اہم مقامات رہے ہیں ان میں مساجد و میناروں کے کھنڈرات آج بھی باقی ہیں۔سکھر کی جانب دریا کا کنارہ ڈھلوانی نہیں ہے اور شہر بالکل کنارے سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ ان دونوں شہروں کی حیثیت سے بھکر کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ جہاں کے باشندے مصیبت کے وقت میں ہمت کا مظاہرہ کرنا سیکھ جاتے ہیں۔(اے۔ برنس۔III،صفحہ 212)

(3)

روہڑی ایک بڑا شہر ہے جو سکھر کے مقابل آباد ہے۔سکھر کے مقابلے میں اپنی وضع قطع میں یہ کافی اچھا ہے۔ یہ شہر پہاڑیوں کے ٹیلوں (ridge) پر واقع ہے جو دریا کے کنارے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بعض گھر دریا کے اوپر لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سندھ کا بہترین سوتی کپڑا یہاں تیار ہوتا ہے۔ یہ صنعت بہت قدیم ہے۔ کچھ علاقے کی غرقابی کے بعد کچھ لڑکوں اور کاہل لوگوں نے قدیم سکّے دریافت کئے تھے۔ان کو روہڑی میں اسی کام پر مقرر کیا گیا تھا۔ میرا بھائی ان میں سے کچھ سکّے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اس کے یونانی باختری عہد (Graeco Bactrian Age) کے تھے۔

روہڑی اپنے شاندار باغات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہاں پر آم اور کھجور کے گھنے درخت ہیں۔ کھجور پھلوں کے موسم میں غریب لوگوں کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ کیونکہ

عام طور پر وہ لوگ سال میں تین چار ماہ کھجوروں پر ہی گزارا کرتے ہیں۔ روہڑی کی مساجد میں سے ایک میں ان لوگوں کے نبی کریمؐ کی ایک بہت مقدس شے بیان کی جاتی ہے۔ جو مولوی اس شے پر قابض ہے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس بال کا وہ لوگوں کو دیدار کرواتا ہے وہ دراصل نبی کریمؐ کے بالائی لب کا بال ہے۔ ہندوستان کے ہر کونے سے ہزاروں افراد ہر سال آ کر اس موئے مبارک کا دیدار کرتے ہیں، اور دیدار کرانے والے مولوی کو نذرانے پیش کرتے ہیں۔ موئے مبارک کو بڑی احتیاط سے ایک سنہری صندوقچی میں رکھا گیا ہے۔ یہ خیر پور کے امیر علی مراد کی جانب سے مذہبی تحفے میں دیا گیا تھا، اور اسے اہل ایمان کے دیدار کے لئے سال میں صرف ایک بار دکھایا جاتا ہے۔ (ایچ۔جیمز۔I، صفحات 6-45)

سکھر

(1)

سکھر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ گھروں سے بھری گلیاں اب مسلسل برباد ہو رہی ہیں۔ بعض مکانات تو بنیادوں سے جا لگے ہیں، اور شہر میں ہر جانب خلاء ہی خلاء نظر آتا ہے۔ بہت تباہ کن منظر ہے۔ برطانویوں کی آمد کے بعد سے سکھر میں کافی ترقیاتی کام کئے گئے ہیں۔ دریا کے کنارے ایک بازار قائم کیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ یہ شہر پھر سے اہمیت کا حامل ہو جائے گا۔ البتہ اسے عہد رفتہ کی سی کشش و عظمت پھر سے نہیں مل سکتی۔

کسی بڑی اعلیٰ نسل کے حکمرانوں نے سندھیوں کے لئے مساجد، عمارات اور مینارے قائم کئے تھے۔ سیاح موجودہ نسل کی کئی ہوئی تباہ کاریاں دیکھ سکتے ہیں۔ سیاح یقیناً اندازہ کر لے گا کہ یہ عمارات بہت عظیم ماہرین تعمیرات نے بنائیں ہوں گی۔ سب سے بڑا مینارہ تقریباً 100 فٹ اونچا ہے۔ اس پر کیا ہوا کام بھی بہت خوبصورت ہے۔ یہ عمارت اندر اور باہر سے خوبصورت ٹائیلوں سے سجائی گئی ہے۔ سکھر نشیبی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ جگہ صحت کے لئے نامناسب ہے، اور اس بات کی تصدیق بے شمار قبرستانوں سے بھی ہوتی ہے۔ دو یورپی قبرستان بھی دیکھے جا سکتے ہیں جہاں پر قبریں بھری پڑی ہیں۔ مگر جب گرمی ہی اتنی زیادہ ہو تو ان اموات پر بھلا کون حیران ہوگا۔ (ایچ۔جیمز۔I، صفحات 41-40)

(2)

سکھر جو صرف اَسّی سال قبل بہت آباد شہر تھا اب وہ عبادت گاہوں اور قبور کے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ شہر اونچی چٹان پر واقع ہے جو دریا سے 100 فٹ اوپر ہے اور بنجر ہے۔ اس میں بمشکل چھ ہزار افراد رہتے ہیں اور اگر صحیح معنوں میں کہا جائے تو یہ شہر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بازار ہے جو انگریزوں نے دریا کے کنارے پر قائم کیا ہے اور دوسرا پرانا شہر ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان بہت سے بنگلے اور فوجی بیرکیں ہیں۔ یہ بھی انگریزوں نے گزشتہ تین برسوں میں بنائی ہیں۔ ایک مینارہ تقریباً 70 فٹ اونچا ہے جو قبروں کے درمیان شہر کے مغربی سرے پر واقع ہے اور اس سے دور دور تک نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ عظیم دریا دور سے بہتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر سکھر کے قریب آتے آتے تنگ ہوتا چلا جاتا ہے پھر اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے ریتیلے ٹیلے اُبھر آتے ہیں جو اچانک ہی زمین کے برابر ہو جاتے ہیں وہیں پر کھجوروں کے درختوں کا جنگل آ جاتا ہے جو دریا کے دونوں جانب کئی میلوں پر مشتمل ہے۔ یہاں سے بھکر اور مقبروں والا جزیرہ بھی دکھائی پڑتے ہیں جو قدیم درختوں میں چھپے ہوئے ہیں جبکہ سکھر کی ننگی پہاڑیوں پر مندروں اور قبور کے کھنڈرات نظر آتے ہیں جہاں پر اب خوبصورت بنگلے بنے ہیں۔

شہر کے شمال میں میدان ہموار ہے اور کافی زرخیز بھی ہے۔ اس جگہ سے دریائے سندھ کی کوئی شاخ نکال کر آسانی سے کسی جزیرے کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔ بھکر، سکھر کے مقابل سطح سمندر سے 200 فٹ اوپر ایک پتھریلی پہاڑی پر آباد ہے۔ یہ دریائے سندھ کے بیس فٹ اوپر ہے، اس کے ارد گرد دو فٹ موٹی شکستہ حال دیوار ہے۔ یہاں پر فوجی بیرکوں اور توپ خانے کے علاوہ چند ایک ہی گھرانے ہیں۔ روہڑی جو ان تینوں قصبات میں سب سے بڑا ہے وہ دریا کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ مٹی اور پتھر کا بنا ہوا ہے اور اس کی آبادی تقریباً 8000 افراد پر مشتمل ہے۔ (ایل۔ اورلچ۔ I، صفحات 9-118)

(3)

جب ہم نے دورہ کیا تو سکھر کی آبادی گھٹتے گھٹتے ایک ہزار افراد پر باقی رہ گئی تھی۔ جب سکھر کی دوبارہ آبادکاری کا کام کیا گیا تو سب سے پہلے فوجی چھاؤنی بنائی گئی، یورپی فوجیوں کے لئے بیرکیں اور

ایشیائی فوجیوں کے لئے لائنز بنائی گئیں۔ چھوٹی پہاڑیوں کو مقابر کے لئے رکھا گیا اور مقبروں کو افسروں کے بنگلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ کام اس طرح سے کیا گیا کہ ''معصوم کے مینارے'' کو ''گریفن ہال'' (Griffin Hall) میں بھی تبدیل کیا جانے لگا تھا۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں بازار اور دوکانیں بنائی گئیں۔ پھر پارسیوں کے گودام بنائے گئے جو مختلف ضروریات زندگی کی اشیاء کے لئے مخصوص تھے۔ انڈس فلوٹیلا (Indus Flotilla) کو حکم صادر کیا گیا تھا کہ وہ اپنا ہیڈ کوارٹر یہیں پر بنائیں۔ یوں کچھ ہی دیر میں سکھر اچھی خاصی جگہ بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی یہ شان وشوکت کچھ مستقل نوعیت کی نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی زمینی طاقت ہر سال سو سپاہیوں میں سے پچاس کو زندہ نہیں چھوڑتی۔ یہ تجربہ بار بار کیا گیا، بعض کہتے ہیں کہ متعدد بار کیا گیا۔ بل اسمتھ، نیدگرین اور جیک براؤن اور ان کے کئی افراد یہاں پر ہلاک ہو چکے ہیں۔

قدیم سکھر میں ایک قلعہ بھی ہے مگر اس کی نوعیت ایسی ہے کہ صبح کے وقت اور دوپہر کے وقت کسی حادثے کے ڈر سے یہاں سے توپیں نہیں داغی جاتیں۔ ''یادگار'' کے علاوہ یہاں پر صرف ایک ہی عمارت قابل دید ہے یعنی ایک خوبصورت مسجد جو ٹھٹھہ کی مسجدوں کی طرح ٹائیلوں سے بنی ہوئی ہے اس میں گنبد بھی ہے۔ بڑے بڑے گھروں کو بڑی شان وشوکت سے بنایا گیا ہے۔ ان میں برآمدے ہیں اور کھڑکیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ یہاں پر گرد وغبار بہت ہے۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔II، صفحات 57-256)

بھکر

19 تاریخ کی صبح کو ہم بھکر کی جانب روانہ ہوئے جو خیر پور سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر چھوٹا سا قلعہ ہے، اور دریائے سندھ کے کنارے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کے ایک جانب روہڑی ہے اور دوسری جانب سکھر ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید سندھ کے امیر ہمیں اس سرحدی علاقے کا دورہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ نیز میں نے بھی اس مطالبہ پر زیادہ زور نہ دیا جو مجھے زیادہ پسند نہیں تھا۔ لیکن جب ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو دریا سے اور ساحل سے بھی ہمیں اس قصبے کو دیکھنے کا اچھا موقع ملا۔ یہ جزیرہ تقریباً 800 گز لمبا ہے اور بیضوی شکل میں ہے۔ اس جزیرے کے اردگرد دیوار بنائی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہندوستانی جگہ نہیں بلکہ یورپی جگہ معلوم پڑتی ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے سے یہ بہت اچھا نظر آتا ہے۔ اس کی برجیاں کسی بڑے تن آور درختوں کی طرح سے ہیں۔ درختوں

میں لگی کھجوروں کی وجہ سے شاخیں مساجد اور دیواروں پر جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔اس کے نزدیک کچھ اور بھی کئی ٹاپو (چھوٹے جزیرے) ہیں جن میں سے ایک پر خواجہ خضر کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کی مقدس شخصیت تھے جن کے مزار کے گنبد کی وجہ سے اس کا نظارہ خوبصورت لگتا ہے۔ دریائے سندھ، بھکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور ہر حصے کی چوڑائی 400 گز ہے۔ پانی یہاں پر پتھروں سے ٹکراتا ہے اسی وجہ سے شور شرابہ پیدا نہیں ہوتا۔ گو کہ بھکر کے کشتی ران بڑے ماہر بھی ہیں اور ہوشیار بھی ہیں مگر پھر بھی سیلاب کے دنوں میں دریا کے اس حصے میں کشتی رانی بڑی خطرناک ہے۔ بھکر کے مدمقابل روہڑی کا قصبہ کوئی چالیس فٹ اونچا ہے۔اس کے بعض مضبوط ساخت کے گھر دریا پر لٹکے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ان گھروں کے لوگ کھڑکیوں سے پانی حاصل کر لیتے ہیں۔البتہ ایک مختصر راستہ اس خطرے سے بچنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ مدمقابل سکھر کے کنارہ روہڑی کی طرح سے سیدھی ڈھلوان والا نہیں ہے۔ یہاں پر ایک سنہری صندوق میں، روایت کے مطابق، نبی کریمؐ کا موئے مبارک رکھا ہوا ہے۔اسی وجہ سے مسلمان یہاں پر زیارت کے لئے آتے ہیں۔البتہ یہاں کے اکثر لوگ ہندو ہیں۔

بھکر کا قلعہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے جو پتھریلی چٹانوں پر واقع ہے۔ یہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے 400 گز کے فاصلے پر ہے اور اسی دریا کے مشرقی کنارے سے اس کا فاصلہ پچاس گز سے بھی کم ہے۔اس کی دیواروں میں بعض بڑے سوراخ ہیں۔اوپر برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ بیس فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہیں۔ چار دیواری کے دونوں طرف یعنی سکھر اور روہڑی کی جانب ایک ایک دروازہ ہے اور اسی طرح سے دو پھر کی دروازے بھی ہیں۔ چار دیواری کے اندر گھر اور مسجدیں بہت ہیں۔ان میں سے بعض تو چٹانوں کی طرح دیوار کے اوپر نظر آتی ہیں۔ یہ بیضوی کی شکل میں ہے اور تقریباً 800 گز لمبا ہے اور ڈایا میٹر بھی 800 ہی ہے۔بعض جگہوں سے یہ ٹیلا (جس پر بھکر آباد ہے) اس رقبے سے کم ہے اور کافی ہموار ہے۔لیکن بھکر میں کچھ خاص کام نہیں کیا جاتا۔ یہاں پر 100 کے قریب فوجی رہتے ہیں جنہیں امیر خیر پور نے تعینات کیا ہے۔ پیادہ فوج کے بھی 50 افراد ہیں جن میں سے بعض دیگر خدمات بھی سرانجام دیتے تھے۔ چار دیواری پورے قصبے کا احاطہ کئے ہوئے ہیں ماسوائے اس ایک جانب کے کہ جہاں پر شمال کی سمت میں کھجوروں کے جھنڈ ہیں، اور اسی جگہ بغیر کسی مشکل کے اُترا جا سکتا ہے۔ شاید یہ جگہ کبھی دریا کے کنارے سے ٹوٹ کر الگ ہوگئی ہوگی۔ اس

جزیرے کے دونوں جانب پانی کی گہرائی بہت زیادہ ہے۔مگر مشرقی شاخ خشک موسم میں پایاب ہو جاتی ہےاور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک بار تو خشک ہوگئی تھی۔مگر سندھ کے ملاح بہت ماہر خیال کئے جاتے ہیں اسی وجہ سے یہاں پر وہ بڑے آرام سے کشتی رانی کرتے ہیں اور ماسوائے ایک آدھ کے کوئی اور حادثہ نہیں ہوتا۔(اے۔برنس۔III،صفحات 270-73)

بھلڑی(Bulrey)

بھلڑی بہت خوبصورت قصبہ ہے جو مختلف قسم کے درختوں سے گھرا ہوا ہے جن میں ببول کے درخت بہت زیادہ ہیں۔ یہ درخت سرو کے درخت کی طرح سے بالکل سیدھا اور لمبا ہوتا ہےاور دیگر تمام درختوں کی نسبت اونچا ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے سندھ کے شہروں اور دیہاتوں میں ایک طرح کی خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔بھلڑی کی آبادی تقریباً 2000 ہے جن میں سے بہت سے سید اور فقیر ہیں۔شہر میں تقریباً 800 گھر ہیں۔ پیر کرم شاہ کا مقبرہ اور اس کی مسجد قصبہ کے قریب ہی ہے۔ یہ بہت خوبصورت عمارت ہے اور مختلف قسم کی رنگین ٹائیوں سے بنائی گئی ہے۔ یہ ٹائیلیں تھوڑے سے فاصلے سے چینی کے برتنوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ یہ ٹائلیں ٹھٹھہ اور نصیر پور میں بنائی جاتی ہیں۔بھلڑی اور جوکھ (Jokh) کے قصبے سیدوں کو ملنے والے جزوی انعامات کی وجہ سے ٹیکسوں اور کسٹم کے ضمن میں کافی استحقاقات کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہر سال مارچ میں یہاں پر بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔تین روزہ اس میلے میں جو اشیاء لائی جاتی ہیں ان پر ٹیکس کی کوئی رقم ادا نہیں کرنی پڑتی۔(ای۔ڈلہوسٹ۔سفرنامہ،صفحہ 197)

لاڑکانہ

(1)

لاڑکانہ کافی بڑا شہر ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہاں پر تیس ہزار افراد آباد ہیں اور شکار پور کے بعد اسی شہر کا نمبر ہے۔سندھ میں یہ بہت دلکش مقام ہے۔ یہ شہر اس ملک کے سب سے زرخیز حصے میں واقع ہےاور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ حکومت کا جو افسر یہاں پر مستقل رہتا ہے وہ ''نواب'' کا خطاب استعمال کرتا ہے۔دریائے سندھ میں پانی کی بہتات کی صورت میں، یہاں کا

ایک دریا آنول (Anull River) بھی بڑی قسم کی کشتی رانی کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ دریا شہر کے جنوبی جانب چندمیل کے فاصلے پر بہتا ہے، اور ایک بہت بڑی نہر کے ذریعہ دریائے سندھ سے کشتیاں شہر تک لائی جاتی ہیں۔ لاڑکانہ شہر تیس فٹ اونچی مٹی کے دیوار کے اندر واقع ہے جس میں برجیاں بھی ہیں۔ یہاں پر 400 یا 500 افراد پر مشتمل فوجی دستہ بھی رہتا ہے جس میں 50 کے قریب آدمی بنگال کی پیادہ فوج کے بھی شامل ہیں۔ سندھ کے امیر ترین ہندو یہیں پر رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ شکارپور میں بھی ہیں۔ لاڑکانہ، قلات اور قندھار سے آنے والی سڑک کے سنگم پر واقع ہے اور اسی وجہ سے ان راستوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحات 29-28)

(2)

لاڑکانہ ضلع کا دارالحکومت اور چار دیواری کے اندر شہر ہے۔ اس کے مغربی جانب ایک چھوٹا سا قلعہ بھی ہے۔ خیال ہے کہ یہاں پر تقریباً پانچ ہزار باشندے آباد ہیں۔ اس کے اردگرد کا علاقہ وادی سندھ کہلاتا ہے جو بہت زرخیز ہے اور اس میں بہت سے دیہات ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں پر بڑا سکون وامن ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے، اور اس ملک میں ملنے والی ہر چیز یہاں پر دستیاب ہے۔ لاڑکانہ کے سستے اور ارزاں بازار پر فوجی بازاروں کا کم ہی اثر پڑتا ہے اور قیمتیں ہمیشہ مناسب رہتی ہیں۔ (آر۔ ایچ۔ کینیڈی۔ I، صفحہ 180)

(3)

لاڑکانہ سندھ کے وسط میں ہے اور سندھ میں اس کی حیثیت ایک باغ کی سی ہے۔ یہ شہر ایک بہت بڑی نہر کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کا ماحول بہت اچھا ہے۔ ہر جانب درخت ہی درخت ہے جن کے سائے تلے گندم کی فصلیں لہلہاتی ہیں۔ یہاں کی مسجدیں کافی بڑی ہیں اور آبی ذخیرے یا ٹنکیاں زیادہ بہتر طریقے سے بنائی گئی ہیں۔ بڑے سائز کے گھر بہت زیادہ ہیں جبکہ چھوٹے گھر پرانی طرز پر ہی قائم ہیں۔ یہاں پر ایک بازار بہت وسیع ہے جہاں پر سینکڑوں دوکانیں ہیں جس کے سبب انہیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ شہر کے سرے پر ایک قسم کا قلعہ ہے جسے فورٹ فیٹز گیرالڈ (Fort Fitzgerald) کہتے ہیں۔ یہاں پر وہ بڑے افسران رہتے ہیں جن کی

زیرنگرانی یہ تعمیر ہوا ہے۔ یہی ہمارے تحفظ کا ضامن بھی ہے۔ لاڑکانہ تجارتی جگہ ہے۔ اپنی مصنوعات میں یہ موٹے کپڑے کی وجہ سے مشہور ہے کراچی و شکارپور کی شاہراہ پر قائم یہ شہر قافلوں اور تجارتی مسافروں کے لئے بڑی اچھی قیام گاہ ہے۔ اسی وجہ سے یہاں پر سب کچھ تو ہے مگر اخلاقیات نہیں ہے۔ یہاں کے باشندے بدمعاش نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور شراب نوشی، رقص، اوچھی اور دیگر قسم کی حرکتوں کے عادی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضروریات زندگی اتنی سستی ہیں کہ زندگی بسر کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ (آر۔ برٹن۔ اداس وادی۔ II، صفحات 40-239)

ہالہ

ہالہ بہت بڑا اور اچھی خاصی آبادی والا شہر ہے۔ یہاں پر تقریباً چار ہزار باشندے ہیں اور ایک بہت بڑا بازار ہے۔ شہر کا ایک حصہ پیر کی ملکیت ہے جو بہت نرم دل ہے۔ لوگوں پر اس کا اثر بہت زیادہ ہے۔ سندھ کے کسی بھی دوسرے شہر کی نسبت اس شہر میں عوام کی جانب اس پیر کا رویہ بہت اچھا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر امیروں نے ظلم کیا تو مظلوموں نے بھاگ کر اس گاؤں میں پناہ لی۔ یہاں وہ ہر قسم کی سزا سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس شہر میں ایک خوبصورت مسجد اور جنوب مغربی جانب ایک دھرم شالہ ہے۔ ہالہ کے شمال مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر ٹھٹھہ کے بعد سندھ کے دوسرے بڑے شہر کے کھنڈرات ہیں جو سات میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان میں سو سے زیادہ گھرانے آباد ہیں۔ اسی جگہ پر جنوب میں میر فتح علی خان کا مقبرہ ہے۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفرنامہ، صفحہ 208)

چوتھا باب

حکمران اور دربار

تالپور حکمران

(1)

میر فتح علی خان اس وقت سب سے بڑا سردار ہے لیکن وہ حکومت سندھ کا مطلق العنان حکمران نہیں ہے۔ اس نے جس حد تک عہدے اور طاقت میں اپنے بھائیوں کو شامل کر لیا ہے اس کی وجہ سے اس کے اپنے اختیارات کی آزادی ختم ہوسکتی ہے، اس کی مجالس ختم ہوسکتی ہیں اور یہ چیز ریاست کے اتحاد کو پارہ پارہ کرسکتی ہے۔ وہ بہت عقلمند ہے اور تمام مشکل امور کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسرا بھائی میر غلام علی خان، بہت طاقت ور اور دوستانہ طبیعت کا مالک ہے۔ گو کہ ذرا بے صبر شخص مگر اس میں فہم وفراست موجود ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنے بھائی کی جگہ لے سکتا ہے۔ اس چیز کا ثبوت بھی موجود ہے کہ ان کے مابین جھگڑے کی صورت میں وہ ہی کامیاب رہے گا۔ البتہ آخر میں وہ بغیر کسی سعی وکوشش کے بھی کامیاب ہوسکتا ہے کیونکہ میر فتح علی کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہے۔ وہ اب اتنا صاحب اختیار ہوگیا ہے کہ اسی درجہ کا دربار بھی لگا سکتا ہے اور اپنے بھائی کی طرح ہی احکامات جاری کرسکتا ہے۔ ان تمام امور میں وہ کسی قسم کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ساتھ ہی محض اپنے گھر تک اپنا اقتدار محدود رکھنے پر مطمئن نہ ہے۔ اس نے قندھار تک اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا ہے اور جب کبھی بھی بادشاہ کابل نے اسے خلعت عنایت کردی تو میر غلام علی خان کے لئے کسی نوابی امتیاز سے کم نہ ہوگا۔ دونوں چھوٹے بھائی جو کہ اب باشعور ہونے والے ہیں ان میں سے چھوٹا بھائی کم سے کم پچیس سال کا ہے۔ ان سب ہی بھائیوں میں پانچ پانچ سال کا فرق ہے۔ یہ دونوں بھی اسی طرح اپنی ازواج کے حوالے سے دیدہ دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی الگ اراضیاں، الگ احباب اور الگ اختیارات ہیں۔ ہر ایک

کے گھر پر اس کی اپنی چھوٹی سی فوجی ٹکڑی بھی ہے۔ وہ اپنی سرپرستی کو وسعت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امیر کی شرافت، ماں کی خود کلامی اور دلچسپی کے بناء پر خاندان میں کچھ عرصہ تک خوشگوار فضا قائم رہ سکتی ہے لیکن چھوٹے بھائیوں (خاص طور پر میر غلام علی خان) کی اپنی مختلف مقاصد کی وجہ سے بے تابی اس میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے دشمنوں کے مقابلے میں اتحاد قائم کیا ہوا ہے اور چہار یار یا چاروں خلفاء کی مانند اتحاد کی شہرت پائی ہے۔ حکومت کے ماتحت عہدیداروں میں بااثر دو شخص ہیں ایک فوجی اور دوسرا طبیب۔ پہلے کا نام میاں فقیرا ہے جو سندھی ہے اور امیر کا چہیتا ہے، اور دوسرا میر ابراہیم شاہ ہے جو ایران کا سید ہے۔ اس کی نواب بہت عزت کرتا ہے اور دونوں پر پورا بھروسہ کیا جاتا ہے لیکن باقی بھائی ان سے حسد کرتے ہیں۔ چاروں شہزادوں کا بچپن گم نامی اور غربت میں گزرا ہے۔ یہ کلہوڑا نوابوں کا آخری عہد تھا۔ یہ شہزادے ان دنوں اس کے جنگل میں مویشی چرایا کرتے تھے اور اپنی خوراک کا انتظام کیا کرتے تھے۔ یہ بات یقینی ہے کہ ان کی سمجھ اور ان کے اطوار تعلیم کی عظیم بربریت کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئے تھے اور انہیں سماج اور ادبیات کی بہت کم سمجھ تھی۔ ان کے نظریات ان پہاڑوں اور صحراؤں سے آگے نہ نکل سکے جو ان کے ملک کی حدود کا تعین کرتے ہیں یا پھر قندھار اور اس کے علم وادب کے بارے میں ان کو کچھ معلومات تھیں۔ ان کو بادشاہ کی حرکات کے مطابق پالیسی بنانی پڑتی تھی، اور بعض اوقات وہ اس کو ادا کئے جانے والے خراج کی تاخیر سے ادائیگی کے لئے بادشاہ کے افسران کو رشوت دے دیا کرتے تھے۔ گھر میں ان کا اہم کام یہ تھا کہ اپنی ذات کی نگہداشت کرنا اور انفرادی طور پر خود کو مالا مال کرنا۔ اس کے علاوہ ان کا پیشہ خود کو مطمئن کرنا تھا نہ کہ عوام کی حالت پر نظر ڈالنا اور نہ ہی ان کو ملکی امور میں دلچسپی تھی۔ بہت آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایسے کردار زیادہ شہرت یافتہ نہیں ہوتے۔ تاہم انتظام و انصرام کے حوالے سے وہ قبائل پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں اور ان کو اپنے تابع رکھتے تھے تاکہ بغاوت و سرکشی کو روکا جا سکے نیز وہ ہمیشہ سرکشی فرو کرنے کو مستعد رہتے تھے۔ ہر ماہ شکار کی غرض سے ایک بار وہ مختلف سمتوں میں ضرور جاتے تھے لیکن اس کی وہ نہ تو کوئی قبل از وقت اطلاع کرتے تھے اور نہ ہی کوئی مقررہ وقت طے ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک کے تمام حصوں میں غیر یقینی کیفیت کو برقرار رکھا جائے۔ شکار کے وقت ان کے ساتھ سوار اور پیادے دونوں ہی ہوا کرتے تھے جن کی تعداد بعض اوقات دس ہزار ہوا کرتی تھی۔ دربار میں نواب اور اس کے بھائی رتبے کے حساب سے بیٹھتے تھے اور ہر ایک کے پاس

ڈھال ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی بھی ہنگامی نوعیت کے لئے اور مسلح رہتے تھے۔ عام طور پر چاروں بھائی اکٹھے کھانا کھاتے ہیں، اور بجائے الگ الگ کمروں میں جا کر سونے کے ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں اور اپنے ہتھیار اپنے پہلو میں رکھتے ہیں۔ کمرے میں روشنی نہیں ہوتی مگر دروازے پر بتی لگائی ہوتی ہے۔ ان کا ملک میں کافی رعب تھا مگر عبدالنبی کلہوڑہ ایک نئی قوت جمع کر کے سندھ پر حملہ آور ہوا۔ البتہ اس مشکل پر قابو پانا اب ان حکمرانوں کے لئے کسی بڑی مشکل کا پیش خیمہ نہ ہے۔ (این۔کرو، صفحات 15-13)

(2)

ماہ جون 1779ء میں ایک بلوچی الاصل قبیلے تالپور نے موجودہ امیروں اوران کے بڑے بھائی کی راہنمائی میں سندھ کے کلہوڑہ نوابوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اسے قندھار کی جانب بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تقریباً سو کے قریب حمایتی لوگ تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ تیمور شاہ نے فوراً ہی ایک فوج مدد خان کی سربراہی میں روانہ کی تا کہ نواب کو اس کے عہدے پر بحال کیا جا سکے اور ایسا اس وقت فوراً ہو گیا کہ جب شاہی فوج کے سندھ میں داخلے کے ساتھ ہی تالپور صحرا کی جانب نکل گئے۔ تاہم وہ لوگ واپس لوٹ آنے کے لئے بھی بڑے مستعد تھے۔ اسی لئے کلہوڑہ نواب ایک بار پھر سے بڑی آسانی سے نکال باہر کیا گیا۔ پھر اس کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس کے دشمنوں کی قسمت ان پر کتنی مہربان ہے۔ 1786ء میں کابل سے ایک اور فوج آئی تا کہ سندھ کے معاملات کو حل کر سکے مگر اس وقت تک تالپور سندھی حکومت اور مالیہ میں کافی حد تک بااختیار ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے وہ لوگ اس قابل ہو گئے کہ ایک ایسی طاقتور فوج تیار کر لیں کہ جو افغانیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہو اور یوں اس فوج نے جیوند (Jeeund) کے دیہات میں افغانیوں کو شکست دے دی۔ یہ گاؤں شکار پور کے شہر سے بیس میل دور ہے۔ وہاں سے شکست خوردہ افغانی فوج واپس فرار ہو گئی۔ اس کے بعد سے بات چیت کا آغاز ہوا اور تالپوروں نے پیش کش کی کہ وہ تمام واجب الادا خراج دینے کو تیار ہیں، اور اس کے علاوہ آئندہ بھی مالیہ باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں گے۔ تمام معاملات ان کے اور بادشاہ کے درمیان بڑے اچھے انداز سے طے پا گئے۔ جس کے بعد بادشاہ نے ایک حکم جاری کرتے ہوئے میر فتح علی جو کہ چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، اس کو

حکومت پر مقرر کیا اور اعلان کیا کہ سندھی عوام کلہوڑہ خاندان کے اقتدار سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اس خاندان کا اب صرف ایک ہی سردار باقی رہ گیا تھا جو گجرات بھاگ گیا اور وہاں پر چند برسوں کے بعد وہ کسی مقامی شہزادے کی ملازمت میں سپاہی بن گیا۔

اس معاہدے کے تین برس کے بعد تالپور امیروں نے خراج کا ایک روپیہ بھی ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اس وقت تیمور شاہ ان لوگوں کو دبانے کے لئے فوج روانہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ 1793ء میں اس کے لڑکے زمان شاہ نے اقتدار سنبھالا اور اس نے جنگ و جدل میں وقت ضائع کرنے کی جگہ چوبیس لاکھ کا خراج وصول کر لیا جو کہ دراصل واجب الادا خراج کا ایک چوتھائی بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سلطنت کو واپس لوٹ گیا۔ اس غیر سیاسی سمجھوتے نے سندھی امیروں کی آنکھیں کھول دیں اور ان کو اپنی طاقت اور اہمیت کا احساس ہونے لگا، اور پھر تو انہوں نے خراج ادا کرنے کا نام ہی نہ لیا، اور جب 1805ء میں شاہ شجاع الملک نے خراج وصول کرنا چاہا تو ان حکمرانوں نے ولی محمد خان کو اس کا مقابلہ کرنے اپنی سرحدوں پر بھیج دیا۔ اس نے اپنے وزراء میں سے فتح خان کی اس نصیحت کو بھی نظر انداز کر دیا جس میں اس نے اس کو کہا تھا کہ شاہ کو واجب الادا اکہتر (71) لاکھ کی جگہ ستائیس (27) لاکھ کا خراج قبول کرنے پر راضی کر لے۔ اس نے تو فوج کو محض بات چیت کے ذریعہ ہی واپس بھیج دیا۔

تیمور شاہ کی جانب سے سندھ کے اقتدار اعلیٰ پر میر فتح علی کی تقرری کے بعد اس سردار نے ملک کو مختلف بڑے حصوں میں تقسیم کر کے اپنے گھرانے کی مختلف شاخوں میں بانٹ دیا۔ کیونکہ اس کے خاندان نے حکومت کے حصول میں اس کی کافی مدد کی تھی۔ ان میں سے میر سہراب اور میر ٹھارہ کو وسیع پیمانے پر حصہ ملا اور اب جبکہ ان کو بغیر کسی معاہدے کے اپنے اپنے علاقوں میں مکمل بااختیار کر دیا گیا تھا تو گویا وہ لوگ وہاں پر آزاد حاکم بن گئے ہیں۔ اول الذکر کا علاقہ سندھ کے ربع شمال مشرق میں ہے جو بہاول خان کی ریاست کی جنوبی سرحدوں سے شروع ہوتا ہے اور خیر پور تک پھیلا ہوا ہے اور یہی شہر اس کا دارالحکومت بھی ہے۔ اس کے مالیہ کا تخمینہ سات لاکھ روپیہ ہے اور اس کے پاس چار سے پانچ ہزار فوجیوں کو اکٹھا کر لینے کی قوت بھی موجود ہے۔ میر ٹھارا کے اضلاع دراصل میر سہراب کے اضلاع کی جنوبی سرحد پر واقع ہیں اس کی سالانہ آمدنی تقریباً چار لاکھ روپیہ سے بھی زیادہ ہے اور اس کی فوجی قوت تقریباً چار ہزار افراد کی ہے۔

میر فتح علی کی وفات کے بعد اس کے حصے کے مالیہ کو تینوں بھائیوں نے چار حصوں میں تقسیم کرلیا جس میں سے دو حصے تو میر غلام علی نے بطور امیر اعلیٰ کے لے لئے اور باقی دو اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کو مل گئے۔ اس طرح سے ان کے مابین چونتیس لاکھ تیرہ ہزار (34,13,000) روپے کی آمدنی تقسیم ہو گئی۔ مگر اب تو یہ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میر غلام علی کو وافر حصہ ملنے کے عوض میں اسے مستقل دیوانی اور فوجی اخراجات برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ جو بہت معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھی شاہ کابل کی جانب سے خراج کی ادائیگی پر زور دیا جائے تو اسے اس میں دوگنا حصہ بھی ڈالنا پڑتا ہے۔

جب سے یہ قواعد وضوابط وضع کئے گئے ہیں تب سے ہی تینوں بھائی غیر معمولی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ملک کے انتظام و انصرام میں تعاون کرتے ہیں۔ میر غلام علی کی وفات کے بعد جب تخت نشینی کا موقع آیا تو ان بھائیوں میں سے سب سے بڑا تخت نشین ہو گیا اور متوفی کا لڑکا نیچے والی نشست پر بیٹھا جبکہ باقی دونوں بھائی اس سے ایک قدم اوپر والی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ یہ طے کرنا ناممکن ہے کہ دیکھئے کب تک ان کا موجودہ نظام محفوظ و قائم رہ سکتا ہے۔ اس وقت تو یہ چیز بڑی مضبوطی سے قائم نظر آتی ہے لیکن اس کی بنیادیں ہمیں اس نظریہ کے بالکل مخالف سمت میں نظر آتی ہیں کہ مدتوں کے تجربات نے ہمیں ایشیائی حکومتوں کی وضع سازی کے بارے میں بہت کچھ سکھایا ہے اور اسی لئے ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ان کا یہ نظام زیادہ عرصہ نہیں چل سکے گا، اور بالآخر یہ اراکین خاندان میں سے کسی بھی ایک فرد کے مشتبہ منصوبے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا جو کہ غیر مشروط اقتدار اعلیٰ کے حصول کی کوشش میں اپنے ساتھیوں کے سازشی مشوروں کے ذریعہ اقتدار میں آ جائے گا اور اس پر قبضہ کر لے گا۔ (ایچ۔ پوٹنگر، صفحات 401-398)

(3)

میر غلام علی ظالم، لالچی و حریص اور دھوکے باز ہے۔ اس کے بارے میں ایسا ہی کچھ مشہور ہے۔ میر کرم علی کا کردار اپنے بڑے بھائی کی طرح کا نہیں ہے۔ مگر اپنے زیر انتظام صوبوں میں وہ کافی حد تک ظالم حکمران ہے۔ البتہ وہ فیصلے کرنے میں اور ان پر قائم رہنے میں اتنا کمزور ہے کہ اراکین حکومت کے مابین ہونے والی کشمکش میں یقیناً وہ ان لوگوں کے آگے مجبور ہو جائے گا کہ جن

کا پلڑا بھاری ہوگا۔

میر مراد علی اپنی خوبیوں کے حوالے سے اپنے بھائیوں سے کہیں زیادہ اچھا ہے لیکن اپنے جسمانی خدوخال کے حوالے سے وہ ان ہی لوگوں سے کافی مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ پر قبضے کا منصوبہ تیار کر رہا ہے۔ میر غلام علی کی ممکنہ مداخلت بے جا کے خوف سے میر کرم علی اور میر مراد علی کے مابین باہمی مفادات کے حوالے سے اتحاد قائم کر دیا ہے۔ میر مراد علی کا فوری مقصد یہ ہے کہ میر فتح علی کی وفات کے بعد ہونے والے سالانہ مالیہ اور علاقوں کی تقسیم کے سلسلے میں بڑے امیروں کے حصوں کو برابر برابر تقسیم کیا جائے اور میر غلام علی کے سیاسی اقتدار اعلیٰ میں غلبے کو کم کر دیا جائے جس کا لازمی نتیجہ اس کا حکومت سے اخراج ہی نکلے گا۔ اگر اس طرح سے ہو جاتا ہے تو میر مراد علی کو ان مشکلات پر قابو پانے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی جو میر کرم علی کی جانب سے اُٹھائی جا سکتی ہیں۔ یوں وہ سندھ کا مختارِ کل بن جائے گا۔

میر غلام علی نے میر فتح علی کے لڑکے میر صفدر کی جانب سے حکومت پر اپنے حق کے دعوے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کی اپنی بیٹی سے شادی طے کر دی ہے۔ البتہ میر مراد علی نے اس کی سختی سے مخالفت کی ہے کیونکہ اس نے اپنے بیٹے اور اپنی بھتیجی کے مابین رشتہ قائم کرنے کی تجویز پہلے ہی دے رکھی تھی مگر میر غلام علی نے اس پر رضامندی دینے سے انکار کر دیا۔ (ایچ۔ ایلس، صفحہ 12)

(4)

بیرونی ریاستوں کو بخوبی علم ہے کہ سندھ کا اقتدار اعلیٰ ان دونو جوانوں کے ہاتھ میں ہے کہ جو باقی بچے ہیں اور جن کا ذکر ہم اس سفر کے شروع میں بھی کر چکے ہیں یعنی میر کرم اور مراد علی جو اندرون و بیرون ملک امیر اعلیٰ کہلاتے ہیں اور جن کی مہریں حکومت کی طرف سے تمام عوامی دستاویزات پر ثبت ہوتی ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی معاملات میں مخل ہوئے بغیر ہی اس خاندان کے دیگر افراد بھی دربار حیدر آباد میں اپنے ان عزت مآب امراء سے ذرا ہی کم حیثیت میں شریک ہیں۔ میر غلام علی اور میر فتح علی نے اپنی اولادیں چھوڑی ہیں جن کو ان امیروں نے انتظامیہ میں ان کا حصہ دے رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے چچاؤں کی لالچ کی وجہ سے اپنے مستقبل کا سوچ لیا ہے اور بڑی حد تک ریاست پر اثر انداز ہوتے

ہیں۔ خاص طور پر میر صفدر ولد میر فتح علی نے اپنے آپ کو عالم غفلت سے نکال کر چند ماہ کے اندر ہی ان امیروں کے برابر رتبہ حاصل کر لیا ہے، اور اس سب کا تب ہی میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جب میں سندھ سے روانہ ہوا۔ اس نے بڑی کامیابی سے باغیانہ سرگرمیاں دکھائیں تھیں۔ بلاشبہ میر محمد ولد غلام علی بھی جلد ہی اس کوشش میں کامیاب ہو سکے گا۔ مراد علی کے دولڑ کے میر نور محمد اور نصیر خان بھی حکومتی اراکین میں جلد ہی شامل کر لئے جائیں گے۔

یہ سب سرداران سندھ کے مختلف حصوں پر قابض ہیں اور اپنے اپنے حصوں سے حاصل ہونے والے مالیہ اور اس میں اپنے اختیار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میر فتح علی کے زمانے میں اس طرح کی کوئی تقسیم نہ ہونے پائی تھی اور اس کے چھوٹے بھائی اپنے وقار و اخراجات کے حوالے سے اس کی آزاد خیالی سے مطمئن تھے اس کی وفات کے بعد صوبے کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جس میں سے دو تو میر غلام علی کو دے دیئے تھے کیونکہ وہ ریاست کے عام اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ دار تھا جبکہ باقی دو میں سے ایک ایک کرم اور مراد علی کو دیئے گئے۔ 1811ء میں غلام علی کی وفات کے بعد مختلف اوقات میں مختلف تقسیمیں ہوئیں اور مراد علی نے اس بناء پر کہ وہ صاحب اولاد ہے، اپنے بھائی کا اور میر محمد کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ بلکہ ماسوائے ان اضلاع کے کہ جو میر سہراب اور ٹھارا کے قبضے میں ہیں اور جن کا ذکر آگے کیا جائے گا، اس وقت یہ ملک چار غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہے۔ جن میں سے سب سے بڑا حصہ مراد علی کے پاس ہے اور باقی حصے کرم علی، میر محمد اور صفدر کے پاس ہیں۔ مراد علی کا حصہ بھی خود اس کے اور اس کے لڑکوں کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ میں سندھ کے مالیہ کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ان کا سالانہ تخمینہ چالیس لاکھ روپیہ سے زیادہ نہیں ہے۔

متذکرہ بالا شہزادوں کے علاوہ تالپور قبیلے کے اور بھی امراء ہیں کہ جو ہر وقت دربار میں موجود رہتے ہیں۔ گو کہ وہ بھی میر یا لارڈ (Lord) کا خطاب استعمال کرتے ہیں مگر ان میں سے کسی کو بھی ریاست کے معاملات میں مداخلت کرنے کا اختیار حاصل نہ ہے، اور ان کی اہمیت اور ان کا آرام وسکون سراسر حکمران خاندان سے تعلقات کی وجہ سے قائم ہے اسی نسل سے میر سہراب اور میر ٹھارا بھی ہیں کہ جن کے اپنے الگ الگ اضلاع ہیں۔ وہ ان برے امیروں کی جاگیریں ہیں کہ جنہوں نے کلہوڑہ حکمرانوں کے اخراج کے وقت اپنی بہادری کی بناء پر علاقے کے معقول حصوں پر قبضہ کر لیا، اور یہ تب سے اب تک ان کے پاس ہیں۔ میر سہراب شکار پور میں رہتا ہے جو پنجاب کی سرحد پر ہے اور میر ٹھارا

میر پور میں رہتا ہے جو تھر کے علاقے میں ہے۔ یہاں پر ان لوگوں کے اپنے الگ الگ دربار لگتے ہیں۔ میر سہراب گو کہ ابتداء میں فتح علی کا مخالف رہا مگر وہ عموماً امیروں کی حمایت کرتا رہتا ہے۔ مگر میر ٹھارا نے کئی بار امیروں سے جنگ کی اور کئی بار اپنی اس سخت پالیسی کی سزا پائی ہے۔ وہ دونوں ہی بوڑھے ہو چکے ہیں اور میر ٹھارا تو کئی برسوں سے نابینا بھی ہے۔ اس کا لڑکا علی مراد سندھ دربار کا غالباً سب سے پیچیدہ رکن ہے، اور اس نے میناہ (Meanah) غارتگروں سے تحفظ حاصل کرنے کے لئے برطانوی حکومت اور کچھ (Cutch) حکومت سے تعلقات قائم کئے ہیں۔ ان سرداروں کی امیروں سے رشتہ داری کے لئے تالپوروں کا نسبی شجرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

سرسری سے جائزہ کے بعد یہ چیز عیاں ہو جاتی ہے کہ سندھ میں طاقت کا توازن دراصل حکومت کی اشرافیہ کے مابین مساوی تقسیم ہے۔ لیکن اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ گو خطاب تو سب ہی استعمال کرتے ہیں مگر حقیقی اختیار فردِ واحد کے پاس ہے اور وہ شخص میر مراد علی ہے جس کے کردار کی اعلیٰ صفات نے اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ اپنے خاندان کی دیگر شاخوں کے جذبات اور حمایت حاصل کر سکے۔ وہ اپنے بھائی سے بھی چھوٹا ہے لیکن مئوخر الذکر اپنے بھائی کے خیالات کے مکمل تابع ہے اور دیگر کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس کو واحد باصلاحیت سردار اور نمائندہ تصور کرتا ہے۔

اس حقیقت کے بنیادی سبب کے طور پر میں اپنے جذبات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتا دوں کہ دیگر ایشیائی حکومتوں کی نسبت اس خاندان میں صرف ایک خوبی ہے کہ جس کی بناء پر اسے امتیاز بخشا جا سکتا ہے کہ انہوں نے گزشتہ تیس برسوں سے اپنی عظمت کو، اور سندھ نے اپنے امن وسکون کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ میں اس ضمن میں میر فتح علی کے بارے میں اپنے ذاتی تعلق کے حوالے سے یہ بات کہوں گا کہ اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنی حصہ داری مساوی طرح سے تقسیم کی، اور یوں اس نے ان کو دوسروں کے اقتدار کو غضب کرنے سے روکے رکھا۔ گو کہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے متصادم اور متضاد مفادات اس سارے نظام کو کمزور کر کے تباہ کر سکتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر اس خاندان کی تمام شاخوں میں چھوٹا ہمیشہ بڑے کی اطاعت گزاری کے لئے تیار رہتا ہے، اور ہر کوئی اپنے سے بزرگ کی زندگی میں اپنے مشتبہ منصوبوں کو زیرِ عمل نہیں لاتا۔

مراد علی تقریباً پچپن برس کا آدمی ہے۔ اس کا قد ذرا چھوٹا ہے جسم کافی لحیم شحیم اور رنگت قدرے صاف ہے۔ اس کے اطوار نرم مگر خطرناک ہیں۔ بعض اوقات مسکرا کر جواب دیتا ہے۔ وہ زیادہ تر اپنے

خاندان کے اراکین کے ساتھ ہی موجود ہوتا ہے، خواہ یہ اس کی شفقت ہے کہ وہ ان سے حسن سلوک کرے یا پھر اس کی طاقت کا خوف ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بہرحال عوام پر اپنی ہیبت کی وجہ سے وہ سندھ کی قسمت پر پورا حقیقی اختیار قائم کرنے کے قابل نہیں ہے۔ عوام میں سے بعض لوگ تو اس کی ذاتی بہادری کا بھی انکار کرتے ہیں مگر یہ بات بظاہر درست نظر نہیں آتی۔ کیونکہ میں نے تو اسے کئی بار اس کی جسمانی کمزوریوں کی وجہ سے راتوں کو جاگتے بھی دیکھا ہے۔

مراد علی کے کردار کے ظاہری پہلو لالچ و حرص سے بھرپور نظر آتے ہیں، اور وہ اپنے مفادات کے لئے اپنی عظمت اور اپنے عوام کے مفادات کو قربان کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔ کبھی کبھار وہ وعدہ کو بھی لے تو انہیں شاذ و نادر ہی پورا کرتا ہے۔ گوکہ اس کا کردار خودغرضانہ اور سیاہ ہے مگر یاد رہے کہ ایشیائی شہزادے بھی، فلپ دوم کی طرح سے کسی سلطنت پر حکمرانی کرتے ہیں تو وہ دماغ کی قوت سے کرتے ہیں نہ کہ انسانی دل سے وابستہ جذبات سے۔

میر کرم علی کا کردار اپنے بھائی سے کردار سے بالکل الٹ ہے۔ وہ ایک مانا ہوا بہادر انسان ہے اور آداب دربار سے خوب واقف ہے۔ وہ بہت خوش باش انکسار پسند اور خوش اخلاق ہے۔ لباس اور رکھ رکھاؤ کا بہت شوقین ہے۔ گو وہ کافی آزاد خیال ہے مگر یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ دربار سندھ کی عمومی حکمت عملی کی پیروی بھی کرتا ہے۔ میں نے حیدرآباد میں اس کی حمایت میں بہت عوامی چرچے سنے ہیں۔ عوام پر وہ بہت مہربان ہے اور ساتھ ہی اپنے ملازمین پر بھی۔ اس کے علاوہ وعدے بھی پورے کرتا ہے۔ اس کا قد درمیانہ اور اطوار بہت اچھے ہیں۔ گوکہ وہ مراد علی سے صرف پانچ سال بڑا ہے لیکن اس کے خدوخال میں بڑھاپے کی جھریاں نظر آتی ہے۔ اُس نے ہمیشہ ہر معاملے میں تعاون نہ کرنے کا رویہ اختیار کیا۔

اگرچہ کرم علی کی تعلیم و تربیت بہت اچھے طریقے سے ہوئی ہے مگر اس کے اندر شعبدے بازی کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ اس نے اپنے کردار کا زیادہ تر حصہ دوسروں کی ہدایات اور خواہشات کے مطابق بنایا ہے۔ بظاہر اسے ایسا ہی کردار اپنانا پڑے گا کیونکہ اس کی اپنی اولاد تو ہے نہیں اور بعد میں اس اتنی طاقت بھی نہ رہے گی کہ اپنے بھتیجوں کے اوپر کچھ اختیار حاصل کر سکے۔ دوسری جانب بھائیوں کے درمیان اس طرح کے شفقت آمیز جذبات موجود ہیں کہ ہر کوئی پہلے مرنے کی خواہش کرتا ہے۔ بلاشبہ مراد علی ہی تمام مقبوضات اور خزانوں کا وارث ہوگا اور اسی طرح سے تمام اختیارات صرف اور صرف

اسی کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔

غلام علی کا لڑکا میر محمد خان، اعلیٰ امیروں میں اگلے نمبر پر آ تا ہے۔ وہ تقریباً تیس سال کا ہے۔ بہت خوبصورت ہے مگر اس کا ایک ہونٹ خراب ہے۔ اس نے اپنے باپ کی جانب سے بڑی دولت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے سندھ میں سیاسی اثر ورسوخ بھی وراثت میں پایا۔ کچھ عرصہ تک اس نے اپنے چچاؤں کے مساوی مسند پر جگہ بنائے رکھی اور حیدر آباد میں بڑے اعزازات کو بھی حاصل کیا۔ جب وہ ملک سے باہر گیا تو اس کا کردار غیر مشتبہ ہونے کے باوجود اس کی تمام تر عظمت خاک میں ملا دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی جائیداد کا بہت بڑا حصہ ضبط کرلیا گیا جس پر مراد علی اور اس کے پسندیدہ ملازمین نے قبضہ کرلیا۔ ان لوگوں نے ایسا اس وجہ سے کیا کہ غالباً وہ ان امور پر قابو نہیں پاسکتا تھا یا پھر اپنے معاملات پوری طرح سے طے نہیں کرسکتا تھا۔ فطرتاً وہ بہت اچھا ہے مگر ریاستی امور سے کچھ زیادہ الگ تھلگ نہیں ہے۔ اس کے ملازمین میں سے اکثر لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں خاص طور پر وہ کہ جنہوں نے اس کی ملازمت میں رہ کر ترقی حاصل کی۔

میر محمد کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور میں یہاں پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ دربار سندھ میں رواج ہے کہ ان تمام بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے جو لونڈیوں سے پیدا ہوں۔ یہ ظلم و بربریت بہت زیادہ دہشت پھیلا دیتی ہے مگر مجھے اس بات کا پکا یقین ہے کہ ایک بار اس خاندان کے ایک فرد نے اپنی کم وبیش ستائیس ناجائز اولادوں کو کسی درگاہ پر وقف کر دیا تھا مگر ان کو مارا نہیں یا مرنے نہ دیا، ارباب اختیار ہندوؤں کے مابین ہونے والی ستی اور طفل کشی کی رسوم پر پابندی عائد کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ ایسے مواقع پر علاوہ ترس کھانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ جب کوئی فخر کا مارا ہوا راجپوت اپنی لڑکی کو مار ڈالتا ہے۔ یا پھر کچھ (Cutch) میں رواج کے مطابق اس لڑکی کا خاتمہ جسم فروشی کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی ہے اور بربریت ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں یہاں پر قرآن پاک کے اس حصے کا حوالہ دوں گا کہ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کام (لڑکی کی پیدائش) تو فطرت کا اصول ہے۔ حضرت محمدؐ نے بتایا ہے کہ ''وہ لوگ یقیناً تباہ ہوگئے کہ جنہوں نے بے وقوفی میں بغیر علم کے اپنی اولادوں کو قتل کر دیا، اور اپنے اوپر وہ خوراک حرام کر لی کہ جو خدا نے ان کو عطا کی، بے شک وہ لوگ خدا سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں۔''

میر مراد علی کا سب سے بڑا لڑکا نور محمد جو تقریباً 30 سال کا ہے وہ اپنی تمام بری عادات میں

(علاوہ چند ایک اچھی عادات کے) اپنے باپ کی طرح ہے۔ وہ بہت بدنام ہے۔ میں نے اس میں کسی خوبی کے بارے میں آج تک نہیں سنا۔ علاوہ اس کے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ بھی خودغرضانہ رویہ رکھتا ہے۔ دولت کا حصول اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ سردار اپنے خاندان کا واحد رکن ہے کہ جو اَن پڑھ ہے۔ میں نے ایک موقع پر خود دیکھا کہ اس نے اپنے والد کو فارسی میں رقعہ تحریر کرنے کے لئے ایک ملازم کو کہا کہ وہ لکھ دے۔ اس کا ایک بہت خوش شکل لڑکا ہے جس کا نام میر شہداد ہے اس کی عمر 12 سال ہے۔

میر محمد نصیر خان، مراد علی کا دوسرا لڑکا ہے اور وہ سندھ میں حکمران خاندان میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اس کی عمر 25 سال ہے اور جسمانی خدوخال بھی بہت خوبصورت ہیں۔ اس کے اطوار بھی بہت اچھے ہیں۔ اپنے باپ یا بھائی سے اس کی مشابہت بہت کم ہے۔ خوش قسمتی سے اپنے کردار کے ساتھ ساتھ ظاہری خدوخال میں بھی ان سے بہت مختلف ہے۔ نصیر خان اتنا ہی سخی و فیاض ہے جتنا کنجوس ہے۔ البتہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ بھی ہے کہ جسے ہم آزاد خیالی کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خاصیت، خواہ خوبی سمجھی جائے یا خامی سمجھی جائے کہ جس کا ہمیشہ چرچا ہوتا ہے خاص طور پر ایشیائی ممالک میں۔

نصیر خان نے ہمیشہ سے برطانوی حکومت کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ وہ حیدرآباد میں ہمیشہ ہمارے مقامی نمائندے کے پاس رہتا ہے، اور جب تک میں وہاں پر رہا ہوں تو اس نے مجھے دوسروں پر ترجیح دی ہے۔ فنون حرب میں ماہر ہونے کے علاوہ ہر طرح کی ورزش بھی کرسکتا ہے۔ خاندان کے اکثر لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ وہ کبھی سخت مزاج ثابت نہ ہوا۔ اس کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ عوامی رائے ہمیشہ سے اس کی حمایت میں رہی ہے۔

مجھے میر صفدر کو قریب سے جاننے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ کیونکہ جب میں سندھ میں تھا تو وہ اکثر دربار میں الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر امیروں نے اس کے ساتھ میرے بات کرنے پر ہمیشہ اعتراض کیا۔ وہ اس فتح علی کا لڑکا ہے جس کی وجہ سے تالپور خاندان کو حکومت حاصل ہوئی ہے۔ 1801ء میں پیدا ہوا یعنی اپنے باپ کی وفات سے چند گھنٹے قبل، اس کے باپ نے مرنے سے قبل اپنے بھائیوں سے اس نومولود کے لئے محبت اور شفقت کی استدعا کی تھی۔ کئی برسوں تک صفدر کو کرم علی نے اپنا متبنیٰ بیٹا بنائے رکھا۔ مگر اسے مرگی کا مرض تھا۔ ایک روز تو بھرے دربار

میں گر پڑنے کی وجہ سے مرادعلی نے اپنے بھائی کو ڈانٹا بھی۔ بس تب ہی سے اس کے لئے پچیس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن جاری کر دی گئی۔

قدرتی طور پر صفدر کو اپنی بدقسمتی کا آغاز مرادعلی کی جانب سے محسوس ہوا۔ جب یہ شہزادہ خطرناک بیماری سے دوچار تھا تو وہ اور اس کے چند حمایتی اس کی متوقع موت پر خوشی و مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس واقعہ کے ساتھ ساتھ اس کی جانب اپنے حقوق کی بحالی کے اعلانیہ دعوے نے مرادعلی کو برافروختہ کر دیا۔ گو کہ صفدر ایک فرمانبردار شخص تھا مگر میں نے یہ دیکھا ہے کہ امیروں کے حکم سے دربار میں کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اس کی عزت کی جاتی تھی۔

لیکن مرادعلی نے صفدر کے کردار کا اندازہ لگانے میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ صفدر خفیہ طور پر اپنے باپ کے چند باقی ماندہ دوستوں اور میر ٹھارا کے لڑکے میر علی مراد کے ساتھ سازباز کر رہا تھا تا کہ اپنے موروثی حق کو حاصل کر سکے۔ میری موجودگی میں وہ اپنے منصوبے کو پورا نہ کر سکا مگر جیسے ہی میں نے حیدرآباد چھوڑا تو اس نے صحرا میں اسلام کوٹ کے قلعہ میں فرار ہونے کا انتظام کر لیا جہاں پر وہ پانچ یا چھ روز میں سازشیوں اور دیگر ساتھیوں سے جا ملا۔ ان کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں نے براہ راست حیدرآباد کی جانب پیش قدمی کی۔ بڑے امیر اس ناگہانی آفت سے بالکل بے خبر تھے۔ انہوں نے آخرکار معاملات معاہدہ کر کے طے کئے، اور صفدر کو ملک کا ایک حصہ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نوجوان شہزادے کی یہ چڑھائی خاندان کے دیگر تمام افراد کے لئے غیر تسلی بخش تھی اور اب وہ لوگ اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی موقع ملے تو اس کو اس کام کا مزہ چکھا دیا جائے۔

میر صفدر کے جسمانی خدوخال اچھے ہیں۔ اس کا قد درمیانہ ہے اور نقش بھی ٹھیک ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تعلیمی زندگی میں بڑی رکاوٹیں آئیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ذہن کمزور ہے مگر علم و ادب کے حوالے سے اسے بدذوق نہیں کہا جا سکتا۔ اس نے کئی ایک فارسی کتب اور شاعری کا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔

سندھ کے امیر دیگر مسلمان شہزادوں یا نوابوں کی نسبت شعوری اعتبار سے بھی اور بخشش و عفو و کرم کے حوالے سے کافی لاپرواہ ہیں۔ وہ لوگ بہت مغرور اور شکی مزاج نظر آتے ہیں۔ ایک موقع پر مرادعلی

نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس کے دارو (شراب) پینے پر مجھے کوئی اعتراض ہے۔ لفظ ''دارو'' مخصوص اصطلاح ہے۔ میں نے اسے وضاحت کی کہ سب کے سامنے نشہ کرنے سے خاص طور پر شراب پینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اسی وقت اس نے میری بات میں مداخلت کرتے ہوئے مجھ سے التجا کی کہ میں ایک سچے مومن (یعنی امیر کی) کی موجودگی میں ممنوعہ انگوری شربت کا اصل نام نہ لوں۔ بعدازاں مجھے پتہ چلا کہ امیر کی مراد صرف انار سے تھی۔ بھری مجلس میں اس طرح کی بات کرنا موزوں نہ تھا۔ بہر حال مجھے پورا یقین ہے کہ سندھ کے امیر کبھی نشہ آور اشیاء میں ملوث نہیں رہے۔ انہوں نے ہمیشہ ان لوگوں کو اپنے سامنے سے اُٹھا دیا جو شراب نوشی میں ملوث نظر آتے۔ ایک اعلیٰ رتبے والا بلوچ سردار بہادر خان کاکڑ (Cokur) جب حالت نشہ میں پایا گیا تو اسے کافی عرصے تک اس کے عہدے سے معطل رکھا گیا۔ امیروں نے ہمیشہ اس الکحلی مرکبات (Tinctures) کی شکل میں نشہ کے استعمال پر زبردست اعتراض کیا ہے۔ دربار میں نہ تو شراب نظر آتی ہے اور نہ ہی خاندان کا کوئی شخص افیم کھاتا نظر آتا ہے۔ اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ حکمرانوں کا یہ رویہ عوام کو ضرور متاثر کرے گا۔ البتہ تجربہ مجھے یہ بتانے پر مجبور کرتا ہے کہ اکثر فوجی اور بہت سے درباری بھی ہمیشہ ان اشیاء کے عادی رہے ہیں کہ جو یا تو ذہن کو متاثر کرتی ہو یا جسم کو۔ سندھ میں افیوم کا استعمال بھی اتنا ہی عام ہے جتنا کہ کچھ (Cutch) میں ہے۔ (جے۔ برنس، صفحات 89-59)

(5)

یہاں حیدرآباد میں اس وقت امیر مراد علی، اس کے لڑکے نور محمد اور نصیر خان، امیر صفدر اور میر محمد ہیں۔ مراد علی ان سب میں بڑا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہی حکومت کا کرتا دھرتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے باقی لوگوں کی بھی حکومت میں حصہ داری ہے اور اس کا بھتیجا امیر صفدر کسی قدر نافرمان اور سرکش ہے۔ مراد علی کو عوام پسند نہیں کرتے اور سندھ سے علاوہ کسی بھی دوسرے علاقے میں اپنے حکمران کی اتنی زیادہ مخالفت نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی سندھ میں ہوتی ہے۔ اگرچہ میں تین چار ماہ حیدرآباد میں رہا ہوں مگر میں نے اس کے کسی ظلم یا بربریت کے بارے میں نہیں سنا۔ اس کے برعکس لوگوں کو ذات و جائیداد کی پوری آزادی ہے اور انہیں تحفظ بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ (سی۔ میسن۔I، صفحہ 363)

(6)

چونکہ کئی برطانوی وفود حیدرآباد کے شاہی خاندان سے مل چکے ہیں اس لئے دیگر حکمرانوں کی نسبت ان ہی کے بارے میں زیادہ بہتر معلومات حاصل ہیں۔ ان کے علاقے میں جنوبی حصہ شامل ہے کہ جسے ''زیریں سندھ'' بھی کہا جاتا ہے۔ 1786ء میں اپنے اولین قیام کے بعد سے یہاں پر بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، اور حکومت کی باگ ڈور جو پہلے چار بھائیوں کے ہاتھ میں تھی وہ اب بغیر قتل و غارت آخری بھائی کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ مگر مراد علی خان جو اب ساٹھ سال کا ہو گیا ہے جب وہ مر جائے گا تو پھر جانشینی کے جھگڑے کھڑے ہوں گے اور ان بھائیوں کی مساوات بھی ماضی کا حصہ بن جائے گی، اور غالباً اس کا نتیجہ خانہ جنگی ہی ہوگا۔ ایک امیر تو بغیر اولاد کے مر گیا ہے۔ دو نے اپنی اولادیں چھوڑی ہیں جو اب جوان ہو گئے ہیں۔ جو امیر زندہ بچا ہے اس کے پانچ بچے ہیں جن میں سے دو یعنی نور محمد اور نصیر خان اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ مساوی درجہ پر دربار میں بیٹھنے لگے ہیں۔ ان کے یہ چچازاد بھائی صفدر اور محمد ہیں۔ دربار سندھ میں ان چاروں کی الگ الگ جماعتیں بن چکی ہیں اور ہر کوئی اپنے منصوبوں کو کامیاب کرانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس جھگڑے کا ہی خاتمہ کر دیا جائے۔ ان میں سے تین تو اپنے والدوں کے امیر ہونے کی حیثیت سے برابر حصے داری کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ مگر مراد علی خان کے دوسرے لڑکے کے حق میں توازن سہولت بہت زیادہ ہے اور اگر یہ پہلے کھڑا ہو گیا تو سندھ کے امیروں کی حکومت کو کبھی خاندانی نہیں کہا جائے گا۔

میر نصیر خان کہ جس کے اثر و رسوخ کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ اس کو اس کے باپ نے برطانیہ کے ساتھ بات چیت کے لئے آگے آگے رکھا ہے، اور اگرچہ وہ اپنے باپ کے بشمول درجے میں چوتھے نمبر پر ہے لیکن وہ ہی ہمیشہ حکومت برطانیہ سے بات چیت کرتا ہے اور حکومت بھی اسی سے بات کرتی ہے۔ وہ اعلانیہ انگریزوں سے اپنی وابستگی ظاہر کرتا ہے۔ اس نے مجھے بذریعہ خطوط کے علاوہ دوبار کھلے دربار میں مطلع کیا کہ وہ دریائے سندھ کے راستے ایک برطانوی وفد لاہور روانہ کرنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس کے والد جو برطانویوں سے اتنا حسد رکھتے ہیں اس نے بھی اپنے لڑکے کو ایسا کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ میرے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی یقین ہے کہ یہ شہزادہ ہماری حکومت کی جانب سے امداد کی توقع پر یہ سب کچھ کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے مصیبت کے

وقت ہم اس کی مدد کریں گے۔ اسی طرح سے نصیر خان نے کابل کے زوال پذیر شاہی خاندان کے بہت سے اراکین سے بھی تعلقات بنا رکھے ہیں، اور جب ہم حیدرآباد میں تھے تو وہ ہرات میں کامران کے لئے تحائف بھیج رہا تھا۔ یہ شہزادہ کافی شریف طبع اور دلچسپ شخص ہے کھیلوں میں دلچسپی رکھتا ہے، اور اپنی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ آزاد خیال ہے۔ اسے مشکل اوقات کے بارے میں اپنے کردار کی ادائیگی کا کم ہی علم رہتا ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار اپنے باپ کی دولت پر قبضے سے وابستہ ہے۔ کیونکہ دولت ہی جنگ کی طاقت ہوتی ہے، اور سندھیوں جیسے ضمیر فروش لوگوں کی حمایت اس صورت میں کبھی حاصل نہیں کی جا سکتی کہ جب اپنی موروثی جائیداد لٹا دی جائے۔ نصیر خان کا بڑا بھائی نور محمد اپنے دیگر اہل خانہ کی نسبت سکھوں سے کہیں زیادہ تعلقات بڑھا رہا ہے لیکن اس میں کامیابی حاصل کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی بری عادتوں اور بدخصلتوں سے بھی وابستہ ہے۔ مگر یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ حکمران وقت کا سب سے بڑا لڑکا ہے۔

میر محمد کو یہ خطرہ بلاوجہ ہی نہیں ہے کہ اس کے باپ غلام علی کی خدمات کی وجہ سے اس کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ اس نے مجھے خفیہ طور پر اور ذاتی طور پر یہ پیغام بھیجا تھا کہ برطانوی حکومت اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ساز باز کر لے مگر میں نے بعض ظاہری اسباب کی بناء پر یہ تجویز قبول نہ کی۔ صفدر، مراد علی کا حقیقی جانشین ہے کیونکہ وہ اس شاہی خاندان کے بانی کا بیٹا ہے۔ امیر اس کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن تیس لاکھ اسٹرلنگ کے علاوہ وہ تین لاکھ سالانہ آمدنی کی زمین کا بھی مالک ہے اسی وجہ سے اس کے ساتھ بہت سے سردار اور فوجی بھی ہیں جو اس کے والد کی خوبیوں کے اعتراف میں اس سے وابستہ ہیں۔ وہ بھی اس خاندان کا لائق ترین رکن ہے اور ایک بغاوت کے ذریعہ اپنے حق کو ثابت بھی کر چکا ہے۔ غالباً اصل مقابلہ صفدر اور نصیر خان کے درمیان ہوگا، اور اگر ان دونوں نے اسی طرح سے سندھ پر حکمرانی کرنے کی ٹھان لی کہ جس طرح سے ان کے پیش رووں نے برادرانہ تعلقات قائم رکھتے ہوئے کی تھی تو وہ دونوں ہی خطاب کے ساتھ ساتھ سندھ کے امیروں کے اختیارات بھی حاصل کر لیں گے۔ اس وقت میر صفدر اپنے چچا کے خوف سے اپنے منصوبوں اور ارادوں کو پوشیدہ ہی رکھتا ہے۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ وہ سندھ کے امیر کے دائیں جانب بیٹھتا ہے اور جب میں نے (دربار کے رسمی اطوار کے مطابق) اس سے صحت کے بارے میں پوچھنے کے بعد اس سے اپنا دوسرا انٹرویو شروع کیا تو اس کو میر نصیر خان کو ساتھ رکھنے کی ہدایت کر دی گئی۔ کیا مراد علی خاصا بوڑھا ہو پائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو دیگر وہ

لوگ بھی اس مقابلے میں آ جائیں گے کہ جو ابھی کم سن ہیں۔ پھر ان میں سے سب سے زیادہ بہادر اور بے باک شخص ہی جانشین ہوگا اور طاقت ور بھی ہو جائے گا۔

خیر پور کا نواب میر رستم خان ہے جو اپنے والد کی بالکنی سے گر کر فوت ہونے کے بعد حکمران بنا۔ وہ تقریباً پچاس سال کا آدمی ہے۔ اس کے دو بھائی اور پانچ بیٹے ہیں۔ یہ خاندان اتنا شہرت یافتہ ہے کہ آج بھی اس کے چالیس ایسے مرد اراکین زندہ موجود ہیں جو میر سہراب خان کی حقیقی نسل ہیں۔ یہ نواب حیدر آباد کی نسبت کہیں بڑی ریاست کا انتظام کرتا ہے۔ یہ علاقہ بہت وسیع اور زرخیز ہے۔ یہ دریا کے مشرقی کنارے پھیلتا ہوا سہون شہر کے شمال میں 30، 28 عرض البلد تک لمبا ہے اور مغربی کنارے پر یہ شکار پور سے مٹھن کے مقام تک 15 میل اندر ہے جہاں پر پنجاب کی سرحد آ جاتی ہے۔ اس کے مغرب میں کوہ گنداری (Gendaree) کے پہاڑ اور کچ گنڈاوا (Cutuch Gundava) کے میدان ہیں۔ حیدر آباد اور خیر پور کے امیروں کے مابین ابھی تک اچھے تعلقات ہیں۔ ان کے مابین افیوم پر ٹیکس تنازعہ کے حوالے سے اختلافات بڑھ رہے ہیں۔ خیر پور کا امیر اس میں اپنا حصہ مانگتا ہے مگر حیدر آباد والا اسے دینے کو تیار نہیں۔ یہاں کا پورا نوابی خاندان اپنی برطانوی حکومت سے دوستانہ وابستگی ظاہر کرتا ہے، اور ہمارے ہر مشن کو یہ جتاتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بہت مہربان ہیں اور بڑے مخلص ہیں۔ ان میں سے کسی نے پہلے کبھی کسی یورپی باشندے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ خزانہ جو تیس لاکھ روپیہ تک پہنچ گیا ہے اب وہ علی مراد کے قبضے میں ہے جو میر رستم خان کا سب سے چھوٹا بھائی ہے اور اس نے سہراب کی وفات کے وقت اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ تا حال یہ اسی کے پاس ہے۔ اس واحد جھگڑے کے علاوہ یہ پورا خاندان متحد ہے اور ان میں آپس میں کوئی دوسرا جھگڑا نہیں چل رہا۔

سندھ کے معاملات میں خیر پور کے امیروں کا اثر و رسوخ قابل غور ہے۔ ملک کی بہبود کے بارے میں اس سے مشورہ کئے بغیر کوئی معاہدہ عمل میں نہیں آتا، اور نہ ہی اس کی منظوری کے بغیر کوئی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ داؤد پوتا قبیلے کے لوگوں کے تحفظ کے لئے جنگ میں میر سہراب کی جانب سے شراکت سے انکار اور سکھوں کی مداخلت نے سندھ کے امیروں کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ اگرچہ دونوں خاندان ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور آزاد ہیں مگر وہ دونوں مل جل کر ہی کام کر سکتے ہیں۔ حیدر آباد کے نوابی خاندان کی نسبت میر رستم خان کے اپنی پڑوسی ریاستوں سے زیادہ اچھے تعلقات ہیں۔ اس کے ہاں جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں کے سفیر موجود ہیں۔ داؤد پوتا قبیلے کا نمائندہ

بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا ریذیڈنٹ بھی رہتا ہے۔ لاہور میں سکھوں سے بھی اس کے تعلقات اچھے ہیں۔ البتہ میر رستم سندھ کی موجودہ حدود کے تحفظ کی غرض سے ہر وقت اپنی افواج کو تیار رکھتا ہے تاکہ کسی بھی بیرونی مدخلت کو روکا جا سکے۔ وہ اس سے قبل اپنی افواج اس موقع پر فراہم بھی کر چکا ہے کہ جب افغانوں نے حیدرآباد کے نواب سے شکارپور چھیننے کی کوشش کی تھی۔

میرپور کے نوابی خاندان جس کی سربراہی علی مراد کرتا ہے۔ اس خاندان کا سندھی امیروں پر بہت کم اثر ورسوخ ہے۔ حیدرآباد سے نواح میں ہونے کے علاوہ اس کے علاقے کی کم زرخیزی نے اس کو بڑے امیروں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ تاہم اس کا علاقہ کچھ (Cutch) سے ہونے والے فوجی حملے کی بالکل آخری حد پر موجود ہے۔ اس امیر کو کسی بھی مہم کے لئے جنگی سامان فراہم کرنا پڑتا ہے۔ یہ خاندان صفدر کا اتحادی ہے اور پورا امکان ہے کہ حکومت کی تبدیلی پر اسی شہزادے کی قسمت میں حصہ داری بھی کرے گا۔ (اے۔ برنس۔III، صفحات 225-219)

(7)

حیدرآباد کا موجودہ امیر، میر مراد علی خان تقریباً ستر سال کا ہے۔ تاہم پھر بھی وہ ایک صحت مند اور لحیم وشحیم مگر ضعیف شخص ہے، اور نظر آتا ہے کہ چند برس اور زندہ رہے گا۔ اس کا کردار کسی جابر اور مطلق العنان شہزادے کا سا ہے۔ اگرچہ وہ ظالم مشہور ہے مگر میں نے اس کی طرف سے کشت وخون کا کوئی واقعہ خود نہیں دیکھا ہے۔ سندھ میں وہ سب سے زیادہ صاحب ادراک اور قابل ترین شخص ہے۔ ہمارے سابقہ وفد کے ساتھ معاہدے کے وقت اس پر مہر ثبت کرنے سے قبل مراد علی نے پورا معاہدہ خود پڑھا اور ایک غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے منشی سے اس تصحیح کی توثیق کرنے کو کہا۔ فطری طور پر اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی دوراندیشی بھی بڑھتی چلی گئی ہے، اور اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے تیرہ کروڑ روپیہ (یعنی تیرہ ملین) اکٹھا کر لیا ہے۔ اس کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے دو جوان ہو چکے ہیں۔

میر مراد علی کا سب سے بڑا لڑکا نور محمد خان تقریباً پینتیس سال کا ہے۔ وہ ایک بے مقصد شخص ہے۔ اس میں نہ تو طاقت ہے اور نہ صلاحیت ہے۔ اپنے مزاج کے حوالے سے بھی وہ کافی سخت ہے۔ وہ اپنے باپ کی ہی طرح سے حریص اور لالچی ہے۔ سندھ کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اور کہا جاتا

ہے کہ وہ ہر برے کام میں ملوث ہے۔ اس کے دولڑکے ہیں۔ جن میں سے شہداد خان سولہ سال کا ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی تک بچہ ہی تصور کیا جاتا ہے۔

میر نصیر خان، مراد علی کا دوسرا اور چہیتا لڑکا ہے۔ وہ کافی آزاد خیال ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ بہت فضول خرچ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہادر بھی ہے مگر اس کے اس ملک کے حکمران بننے کا امکان بہت کم ہے۔ لوگوں کی کافی تعداد اسے پسند کرتی ہے مگر تفتیش کرنے کے بعد لوگوں کے رویوں سے یہ بات بھی اخذ کی جاسکتی ہے کہ اس کے ساتھ لوگوں کی یہ وابستگی ان لالچی جذبات کی وجہ سے ہے جو دوسروں کی نسبت اس کے ساتھ زیادہ ہیں۔ خدوخال کے حوالے سے میر نصیر خان دراز قد اور خوش شکل ہے۔ مگر ذرا بھدا اور موٹا سا بھی ہے اور یہ چیز یورپی لوگوں کو پسند نہیں ہوتی۔ برطانوی حکومت اور دیگر تمام حکومتوں کے ساتھ بات چیت کے مواقع پر اس کے باپ نے ہمیشہ اسی کو آگے کیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مراد علی خان اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہی اس کا جانشین ہو جبکہ باقی دوسرے سب جانشینی کے جائز حق سے محروم کردیئے جائیں۔

ان دوشہزادوں کے علاوہ تین چھوٹے بچے بھی ہیں اور مراد علی کے دو بھتیجے یعنی اس کے بھائیوں میر فتح علی اور میر غلام علی کے لڑکے بھی ہیں۔ ان میں سے اول الذکر بہت باصلاحیت اور قابل کردار کا حامل تھا۔ وہی وہ شخص تھا کہ جس نے 1781ء میں کلہوڑہ خاندان کا تختہ اُلٹ کر سندھ کے موجودہ حکمران کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد اس نے بڑے کھلے دل سے اپنے تینوں چھوٹے بھائیوں کو حکومت میں شامل کرلیا۔ میر صفدر ان ہر دو بھتیجوں میں بڑا ہے اور مرحوم میر فتح علی کا لڑکا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مسند کا صحیح حقدار ہے۔ دوسرے بھائیوں کی جانب سے اس کی ہمیشہ بےعزتی کی گئی ہے۔ 1801ء میں اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی پرورش بڑی غربت میں اور غفلت کے تحت کی گئی ہے۔ 1828ء تک اس کے یہی حالات تھے۔ تب وہ حیدرآباد سے فرار ہوگیا اور پندرہ ہزار کے قریب اپنے ساتھی اور حمایتی جمع کرلئے۔ یہ کام اس نے تلون (Tilloon) کے دیہاتوں کے پاس دریائے گونی (River Goonee) کے کنارے کیا۔ پھر بڑی بہادری سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ میر صفدر کو اس کے حقوق سے محروم کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی زندگی میں، اپنے باپ کی جانب سے امیر مقرر نہ کیا گیا تھا۔ میر صفدر بہت قابل، آزاد خیال اور اعلیٰ کردار کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ اسے سندھ کے جن طاقتور سرداروں اور امیروں کی حمایت حاصل

ہےان میں میر پور میر مرادعلی خان بھی شامل ہے۔اس کے پاس تخت کے حصول کا کافی نادرموقع موجود ہے۔ یہ بھی یادرہے کہ میر صفدر کا ایک کم سن بچہ بھی موجود ہے۔

میر محمد خان میر غلام علی کا لڑکا ہے اور چار بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس میں وہ تمام کرداری صلاحیتیں موجود ہیں کہ جو میر صفدر میں ہیں۔ سندھ کے عوام اسے بہت کم پسند کرتے ہیں۔ اپنے باپ کی زندگی میں ہی سے اتنی اراضی دے دی گئی تھی کہ جس سے تین لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی مل جاتی تھی۔ نیز سندھ کے سب سے بہترین شہروں میں سے ایک شہر مغرابی (Muograubhey) بھی اسی کی ملکیت ہے۔ جب برطانوی وفد سندھ میں تھا تو نہ ہی میر صفدر اور نہ ہی میر محمد کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ وفد کے کسی رکن یا ان کے نمائندے سے بات بھی کرسکیں۔ اس وقت ہمیں ان شہزادوں کی اداسی پر ان سے بہت ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اس سب کے باوجود میر مرادعلی خان نے عوامی دربار میں میر محمد کو اکیلے ہی کھڑا کر کے سفیر سے متعارف کروایا، اور یہ کہا کہ یہ شہزادہ اس گھرانے کا سربراہ ہے۔ مگر یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ محض اس بوڑھے امیر کی دورُخی حکمت تھی، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ سب کو یہ جتلائے کہ میر محمد ہی اپنے باپ کی زندگی میں تخت کا سب سے زیادہ حقدار قرار دے دیا گیا ہے بجائے اس کے کہ کوئی اور شہزادہ موروثی حق کی بناء پر اس طرح کا دعویٰ کرنے لگے۔ چونکہ مرادعلی یہ جانتا ہے کہ میر محمد سندھ کی حکمرانی کے اہل نہیں ہے اس لئے وہ اپنے ہی کسی اور لڑکے کو آگے لانا چاہتا ہے۔

نصیر خان اپنے باپ کے دو جوان لڑکوں میں سے ایک ہے، اور اپنے باپ کا بہت لاڈلا ہے۔ امیر کی خواہش رہتی ہے کہ ہر موقع پر اس کو آگے لایا جائے، اور یوں وہ تخت پر اس کی جانشینی کے مواقع پیدا کررہا ہے۔ تاہم میر صفدر کو سندھ کے عوام کی بہت زیادہ حمایت حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے باپ کی خدمت اور یادداشتوں کی بناء پر اس کو سندھی کردار، عزت اور توقیر کا بہت فائدہ رہا ہے نیز کچھ اس وجہ سے بھی کہ اس میں بڑی صلاحیتیں اور اس کے پاس طاقت موجود ہے اتنی کہ جتنی اس کے مقابلے پر کسی اور کو میسر نہیں ہیں، اور وہی اس ملک کا اچھا حکمران ثابت ہوسکتا ہے۔ میر نصیر خان نے برطانوی حکومت پر ہمیشہ توجہ دی ہے اور ان کی عزت وتوقیر کی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دیگر تمام چھوٹے شہزادے موقع ملنے پر یہی رویہ اختیار کریں گے۔ ہر شہزادہ کسی بھی قسم کی شرائط ماننے کو تیار رہے گا۔ اس صورت میں ہونے والی خانہ جنگی میں کسی کی طرف داری کرنے سے بہتر یہ ہوگا

کہ پورے ہی ملک پر قبضہ کر کے خاندان کی چھوٹی چھوٹی شاخوں کو بالکل خارج کر دیا جائے۔

وسعت کے حوالے سے اگلی ریاست خیر پور کی ہے جس کا سربراہ میر رستم خان تالپور ہے جو حیدرآباد کے نوابی خاندان کا اتحادی ہے۔ یہ امیر بہت نرم دل، شریف اور خوش مزاج ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ریاست حیدرآباد کی نسبت اس کی ریاست کے عوام کو کم مشکلات کا سامنا ہے۔ میر رستم کیسا بھی ہو بہر حال اب وہ اس قابل نہیں ہے۔ اس کے آٹھ بیٹے اور تین بھائی ہیں۔ مئوخرالذکر حضرات کو حکومت میں کوئی دخل حاصل نہ ہے۔ ہاں البتہ میر مبارک خان جو اس کا دوسرا بھائی ہے وہ بہت جاہل اور مکار آدمی ہے اور مکمل طور پر حیدرآباد کے حکمرانوں میں سے مراد علی خان کے زیر اثر ہے۔ اسی لئے وہ ریاستی حکمت عملی سے متعلقہ ہر اہم معاملے میں مداخلت کرتا ہے۔ سب بھائیوں میں چھوٹا جو چوتھے نمبر پر ہے یعنی میر علی مراد خان وہ ذرا کم تر درجہ کا حامل ہے اور بڑا جابر نیز بہت حریص و لالچی ہے۔ اس کے قبضے میں خیر پور کا تقریباً نصف علاقہ ہے اور خزانے کے بڑے حصے پر بھی قابض ہے۔ مگر ملک میں اس کا سیاسی اثر و رسوخ برابر بھی نہیں ہے۔ علی مراد، دیگر سرداروں کا واحد سوتیلا بھائی ہے، اور اپنی کثیر دولت اور وسیع علاقے کی وجہ سے وہ ہمیشہ دباؤ میں رہتا ہے۔ اس کی ماں جو جوان اور خوبصورت ہے وہ پرانے امیر (میر سہراب خان) پر اس کی موت سے قبل بہت اثر رکھتی تھی۔ یوں اس نے اس سے اپنے اس اکلوتے لڑکے کے حق میں مرضی کی وصیت تحریر کروالی تھی۔ علی مراد اور اس کے بھائیوں کے درمیان مفاہمت بہت کم معلوم پڑتی ہے۔ اس کے بھائی اس سے عمر میں دوگنے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے کسی بھی تنازعے کی صورت میں وہ برطانوی حکومت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میر رستم کے اکثر لڑکے اب جوان ہو گئے ہیں مگر ان کو سندھ کے دیگر بلوچیوں سے کسی بھی طرح سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح جاہل اور توہم پرست ہیں۔ سندھ کے اس علاقے میں جانشینی کی کیفیت اتنی ہی غیر یقینی ہے جتنی کہ حیدرآباد میں ہے۔ میر پور کی ریاست کہ جس کا صدر مقام حیدرآباد کے شمال میں تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے وہ اس علاقے کی تیسری ریاست ہے اور تمام سندھی ریاستوں میں سب سے چھوٹی ہے۔ وفد نے اس بات کا دورہ نہیں کیا تھا لہٰذا اس کے بارے میں کچھ بھی تحریر کرنا موزوں نہیں۔ عام خیال کے مطابق اس کا موجودہ امیر، علی مراد خان تالپور کم تر حیثیت کا حامل ہے اور سندھ کی باقی دو حکومتیں اسے اپنا چھوٹا دشمن خیال کرتی ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر حیدرآباد کی حکومت سے دہشت زدہ اور ناراض نظر آتا ہے

اور خیر پور کے سردار کے برعکس خارجہ پالیسی میں نہ تو حیدرآباد حکومت سے راہنمائی لیتا ہے نہ ہی اس پر انحصار کرتا ہے۔ مراد علی خان کی وفات کے بعد جب اس کے جانشینوں میں جھگڑا ہوگا اور حیدرآباد کے مسند کے حصول کے لئے کھینچا تانی ہوگی تو میر پور کا علی مراد بہرصورت میر صفدر خان (ولد میر فتح علی) کے ساتھ ہوگا، اور اس کا حال وہی ہوگا جو اول الذکر کی قسمت ہوگی۔(ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحہ 17-11)

(8)

میر مبارک خان بہت چالاک اور دھوکے باز آدمی ہونے کے علاوہ ظالم بھی ہے۔ لوگ اسے بہت ناپسند کرتے ہیں خاص طور پر ہندو۔ میر علی مراد البتہ بہت پسندیدہ شخصیت ہے جس کی وجہ سے دیگر تمام بلوچی سردار بہت زیادہ ذلیل ہوگئے ہیں۔

البتہ میر رستم خان ملک میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ شخص ہے۔ وہ انسانیت پسند اور رحم دل ہے اور اس کی جانب تو صرف ایک ہی غلطی منسوب کی جاتی ہے وہ یہ کہ وہ نشے کا عادی ہے جیسے بھنگ، افیوم وغیرہ۔ یہ چیزیں اسے وزیر فتح محمد خان غوری کا محتاج بنا دیتی ہیں جو دراصل تمام ریاستی کام سرانجام دیتا ہے۔ وزیر ذاتی طور پر ایک چالاک آدمی ہے اور میر رستم خان کے ساتھ بڑی حد تک وابستہ ہے مگر اجنبی ہونے کی وجہ سے (کیونکہ وہ مارواڑ سے تعلق رکھتا ہے) وہ اتنا پسند نہیں کیا جاتا جتنا کہ اسے پسندیدہ ہونا چاہئے۔ یہ اس خاندان کی سب سے چھوٹی شاخ ہے۔ میر رستم خان کے چار بیٹے ہیں اور میر مبارک کے تین اور علی مراد کے دولڑکے ہیں۔

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ میر رستم نے اپنے سب سے بڑے بیٹے میر محمد حسن کو اپنا جانشین بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ میں نے اس شخص کو صرف ایک ہی باہر دیکھا ہے۔ یہ 38 یا 40 سال کی عمر کا آدمی ہے اور کہا جاتا ہے کہ لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔

میر رستم کا دوسرا لڑکا میر علی اکبر ہے جو پچیس سال کا ہے اور کسی حد تک حیدرآباد کے میر نصیر خان سے مشابہت رکھتا ہے۔ میں اسے اکثر و بیشتر دیکھتا رہتا ہوں۔ بظاہر وہ اچھی فطرت کا معلوم ہوتا ہے مگر ایسا ہرگز نہیں اور بالکل بے وقوف ہے۔

تیسرا بیٹا میر شیر محمد ہے جو بیس سالہ نوجوان ہے۔ اس کے ساتھ گفتگو کرنے کا مجھے کبھی

موقع نہیں ملا۔

چوتھے لڑکے میر غلام کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ پاگل پیدا ہوا ہے اور 18 سال کا ہے____ میر مبارک کے بیٹے میر نصیر خان، میر علی یار خان اور میر فضل محمد ہیں۔

ان میں سب سے بڑا اپنے باپ کا لاڈلا ہے۔ وہ میر رستم خان کے تمام لڑکوں کی نسبت عوام میں زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نصیر خان بہت خوبصورت ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے تمام فوجی مشقیں کی ہوئی ہیں۔

میر علی یار خان بہت اچھا اور شریف نوجوان ہے۔ وہ ہر وقت باخبر اور چوکنا رہتا ہے۔ وہ میر رستم خان کا بھتیجا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا داماد بھی ہے۔

فضل محمد کے ساتھ کبھی بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہ زیادہ مشہور نظر نہیں آتا۔

میر علی مراد کے دونوں لڑکے ابھی بچے ہیں۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفر نامہ، صفحات 22-221)

(9)

چاروں بھائیوں میں سے آخری بچنے والے میر مراد علی خان نے پورے سندھ پر اقتدار حاصل کیا ہوا ہے۔ گو کہ یہ الگ بات ہے کہ دیگر امیر بھی حکومت میں شراکت رکھتے ہیں۔ اس نے یہ مقام اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بلوچی دوستوں کو ساتھ ملائے رکھنے کو بھی بڑا دخل ہے۔ میر مراد علی خان باہوش و حواس آدمی ہے اور اس کے ثبوت میں میں اس کا وہ واقعہ بیان کر چکا ہوں کہ اس نے ہمارے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے سے قبل ہماری موجودگی میں ہی بھرے دربار میں اسے دوبار بڑی احتیاط سے پڑھا اور ہر جملے پر غور کیا پھر وہ لفظ ''Resident'' پر آ کر رک گیا اور کہا اسے اس لفظ کا مطلب پوری طرح سے واضح کیا جائے۔ دوبارا سے اس لفظ کی وضاحت کی گئی۔ اس کے بعد اس نے معاہدے پر مہر ثبت کی۔ اس واقعہ میں گو کہ کوئی بھی بات غیر معمولی نہ ہے لیکن جو بھی اس موقع پر اس ساری بات کو مشاہدہ کر لیتا وہ یقیناً یہ کہتا کہ امیر کو امور سلطنت کا اچھا خاصا تجربہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میر مراد علی خان نے موجودہ عہد نامہ تھوڑی سی مشکل کے بعد قبول کیا ہے۔ اس نے یقیناً ان تمام بلوچی سرداروں اور دیگر امیروں پر غلبہ پانے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ جو سب کے سب ماسوائے نصیر خان کے، عزت مآب گورنر جنرل کی جانب سے کسی بھی درخواست یا تجویز کو قبول کرنے

میں خوش نہیں ہیں۔

میں میر مراد علی خان کے پورے رویے سے یہ اندازہ کرسکتا ہوں کہ اس کے سامنے کوئی بہت بڑا مقصد ہے جس کے بارے میں اسے یہ امید ہے کہ یہ مقصد برطانوی حکومت کی مداخلت سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔ میر مراد علی خان بہرحال ایک ایسا سمجھدار آدمی نہیں ہے جو ریاست سندھ کے حالات سے پورا واقف نہ ہو۔ وہ صاف طور پر اپنی موت کے نتیجے میں ہونے والی ملکی خانہ جنگی سے واقف ہے۔

اس وقت حیدرآباد میں مسند کے چار سے کم امیدوار نہیں ہیں۔ وہ مراد علی خان کے مرتے ہی ہتھیار اُٹھانے کو تیار ہیں۔ وہ لوگ میر صفدر، میر محمد، میر نور محمد اور میر نصیر خان ہیں۔

ان میں سے اول الذکر میر فتح علی کا بیٹا ہے جو اپنے باپ کی وفات کے وقت کم سن تھا۔ اسی وجہ سے دیگر امیر اسے جائز تسلیم نہیں کرتے۔ جنوری 1828ء تک اس کے ساتھ ہمیشہ ذلت کا برتاؤ روا رکھا گیا تھا۔ اس وقت جا کر اس نے ایک سخت قدم اُٹھایا اور میر مراد علی اور دیگر امیروں سے اپنا حق تسلیم کروایا۔

اس کے بعد میر محمد ہے جو میر غلام علی کا لڑکا ہے اسی بناء پر وہ خود کو صحیح جانشین سمجھتا ہے۔ اس کے بعد میر نور محمد آتا ہے۔ وہ میر مراد علی کا سب سے بڑا لڑکا ہونے کی بناء پر اپنے حق کا دعوے کرتا ہے۔ سب سے آخر میں میر نصیر خان ہے۔ وہ بھی جانشینی سے کبھی دست بردار نہ ہوگا کیونکہ اس کے باپ کا ترجیحی سلوک اسے اس جانب راغب کرتا ہے۔

پہلے تین شہزادے تو کافی حد تک امیر ہیں جبکہ سب سے آخری غریب ہے مگر وہ سب سے زیادہ شہرت یافتہ ہے۔ یہ چاروں جماعتیں ایک دوسرے سے اپنی اپنی نیتیں پوشیدہ رکھتی نظر نہیں آتیں کیونکہ سب کے سب ہی واقف ہیں کہ موقع آنے پر ہر کوئی اپنے ساتھیوں کو میدان جنگ میں لے آئے گا۔

میر صفدر کی جانب میر مراد علی خان بہت کم خیر سگالی کا اظہار کرتا ہے۔ جبکہ میر صفدر اس سے ڈرتا ہے۔ مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ وہ میر محمد کو بہت ناپسند کرتا ہے۔ گو کہ میر نور محمد اس کا سب سے بڑا لڑکا ہے اور ہر معاملے میں اپنے باپ کا متبادل نظر آتا ہے مگر پھر بھی وہ عوامی جلسوں اور اجتماعات میں میر مراد علی خان کے ساتھ کبھی بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے بعد میر محمد کو سربراہ خاندان قرار دیا ہوا ہے۔ مگر برطانوی حکومت کے ساتھ تمام تر خط و کتابت اور معاملات میر نصیر

خان کرتا ہے جسے اس کے باپ نے ہی متعارف کروایا ہے، اور خیال ہے جب امیر مرنے کے قریب ہوگا تو حیدرآباد کی حکومت کے حصول کے لئے برطانوی حکومت کو میر نصیر خان کی حمایت کرنے کے لئے کہے گا۔ میرا خیال ہے کہ میر مراد علی کا منصوبہ یہی ہے۔ البتہ یہ تو وقت اور حالات ہی بتائیں گے کہ وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ بہرحال جب بھی یہ موقع آئے تو موجودہ معاہدے میں تبدیلی لانے کا یہ بہترین موقع ہوگا۔ (ای۔ڈلہوسٹ۔ یادداشتیں، صفحات 9-7)

(10)

اس کے علاوہ تالپوروں میں بہت سے فضول خرچ سردار بھی ہیں۔ میر کرم علی نے اپنی سخاوت کی وجہ سے شہرت حاصل کی، اور ناصر خان کا یہ حال تھا کہ اپنی موت سے چند سال قبل اس نے اتنی فضول خرچی کی کہ اپنے بھائی نور محمد کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ یہ بات ہمیں شہداد کے ساتھ گفتگو کے دوران پتہ چلی۔ چچا کی یہ عادت بھتیجے کی عادت سے ذرا ہی مختلف ہے۔ نور محمد اور صفدر دونوں کے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے۔

دوسری طرف بعض امیروں ___ جیسے ناصر خان ___ کے اطوار بہت زیادہ دلکش تھے۔ وہ بڑا بھاری بھرکم شخصیت کا مالک تھا اس کی شکل بہت خوبصورت تھی۔ اس کی خطابت اور انداز گفتگو میں دل موہ لینے والی طاقت موجود تھی۔ اگرچہ اس کے اطوار اور رہن سہن کسی شریف انگریز جیسا تھا اور بہت امیرانہ تھا مگر بلوچی لوگ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ بلکہ اس کے بھائی نور محمد سے بھی زیادہ پسند کرتے تھے۔ میں نے نور محمد کو کبھی نہیں دیکھا لیکن مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دولت کا دیوانہ تھا، اور شکل وصورت میں ناصر خان کا بالکل اُلٹ تھا۔ پتلا، دُبلا، مکارانہ شکل، تیزی سے جھپکتی آنکھیں وغیرہ ___ گویا کہ وہ کوئی دوسرا لوئس آنز (Louis Onze) ہو۔ اس کا لڑکا شہداد اپنے انداز میں بالکل اسی کے مشابہ ہے۔ اس کی عمر تقریباً پچیس سال ہے۔ ان دو استثناؤں کے ساتھ امیروں کا پورا خاندان خوش شکل معلوم ہوتا ہے اور یورپیوں کو اچھا لگتا ہے۔ میر صفدر کہ جو میانی (Miani) کی جنگ کے بعد اپنے خاندان کو برباد کرنے میں برابر ملوث تھا وہ صاف شکل، باحواس اور شریفانہ اطوار کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ ان چار امیروں میں سے سب سے بڑے امیر کا بیٹا ہے جس نے کلہوڑوں کے بعد سب سے پہلے تخت سنبھالا۔ اسے کچھ عرصے تک اس کے پیدائشی حق سے محروم رکھا گیا۔ بہرحال 1828ء میں وہ

دارالحکومت سے فرار ہو گیا اور بڑی تعداد میں بلوچیوں نے اس کی مدد کی یہاں تک کہ وہ پندرہ ہزار فوجیوں کا سردار بن گیا جس کے ساتھ اس نے دیگر امیروں کو مجبور کیا کہ اسے وہ علاقہ واپس دیا جائے جو اس کے باپ فتح علی کی ملکیت تھا۔ اس لڑائی کی وجہ سے اور دیگر وجوہات کی بناء پر بھی، وہ ہمیشہ باقی خاندان سے الگ تھلگ ہی رہا ہے۔ جب لارڈ کینی (Lord Keane) نے یہاں پر قدم رکھا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام امیر ہماری افواج پر حملہ کرنے والے تھے مگر ایسے میں صفدر نے ان کی حمایت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی لئے پھر اس کی برطانیہ سے وابستگی کو کس طرح سے شک کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے؟ اس بات کا جواب کوئی آسان بات نہیں ہے۔

یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے فوجی دستے میانی کے میدان جنگ میں موجود تھے مگر اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ واقعی وہاں موجود تھے اور اگر واقعی میں سب موجود تھے کیا وہ محض الگ تھلگ رہے تھے، اور دوسرے یہ بھی کہ صفدر نے ان کو روکے رکھنے کی کس حد تک کوشش کی۔

کچھ لوگ امیروں کو جاہل اور بربریت کا حامل تصور کرنے پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی یہ بات اس بات سے کہیں زیادہ معنی خیز ہے جتنی کہ ہم ان پر الزام لگاتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر ہمارے ریذیڈنٹ اور نور محمد کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی اور ریذیڈنٹ نے نور محمد کو اپنی حکومت کی نیک نیتی اور بے غرضی کے بارے میں بتلایا۔ نور محمد نے آدھی بات سنی اور آدھی اَن سنی کر دی، اور موضوع کو بدلتے ہوئے کہا کہ "تم یورپی لوگ بہادر شاہ کے دور میں ہندوستان آئے تھے۔ ہیں نا۔" ریذیڈنٹ نے جواب دیا کہ "نہیں، سورت میں پہلی انگلش فیکٹری جہانگیر کے دور میں قائم ہوئی تھی۔" یوں ماضی کا یہ واقعہ بغیر کسی فیصلے کے ختم ہو گیا۔ منشی سے گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ گجرات کی ایک تاریخ اکبر کے دور میں اس صوبے کے مغل اقتدار میں چلے جانے سے قبل کی ہے۔ اس میں گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کے پرتگیزیوں کے ہاتھوں بہیمانہ قتل کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ نور محمد نے اس طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مشرق کے ساتھ ہونے والے تمام واقعات کے حوالے سے یورپیوں کی اس نیک نیتی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ جس پر ریذیڈنٹ لمبا درس دے رہا تھا۔

ہمارے ریذیڈنٹ اور اس کے نائبین کے ساتھ ہر معاملے میں یہاں کے امیر نرم مزاج اور مؤدب ہیں۔ ایک بار ان کے رویے میں ان کی بہادری و شجاعت کو چھیڑنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار جب نصیر خان کو ایجنسی میں بلایا گیا تو وہ اس لاعلمی میں کہ وہاں پر عورتیں بھی رہتی

ہیں، وہ ایک ایسے کمرے میں داخل ہوگیا کہ جہاں ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ فوراً ہی وہاں سے واپس لوٹا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حیدرآباد چلا آیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد ایک پیغام رساں اس کی جانب سے آیا۔ اس نے اس کا خط دیا جس میں اس نے غافلانہ طور پر غلطی سے کمرے میں داخل ہونے پر معذرت کی گئی اور ایک سو (100) سونے کی مہروں (یعنی ڈیڑھ سو پاؤنڈ) کی پیش کش کی گئی۔ دراصل اس کو اس بات کا سخت دکھ تھا کہ وہ کسی عورت کے کمرے میں اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں چلا گیا ہے۔ میانی کی خطرناک جنگ سے قبل اسی امیر کے ساتھ یہ عہد نامہ ہوا تھا کہ وہ کسی بھی حال میں انگریزی حکومت کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ مگر یہ سب بے سود ہوا کیونکہ بلوچی سرداروں نے اسے میدان جنگ میں جانے پر مجبور کر دیا، ان لوگوں نے اس کے پاس عورتوں کا لباس بھیج دیا۔ اس کو غصہ دلانے کے لئے بس یہی کافی تھا۔ اس نے کہا کہ ''ان کا خیال ہے کہ میں خوف کے مارے اپنے اقتدار کو داؤ پر نہیں لگا تا تو ان کو پتہ چل جائے گا کہ وہ غلطی پر ہیں۔'' اور پھر وہ فوراً ہی فوجوں کے ساتھ جا ملنے کو اپنے محل سے نکل پڑا۔ (ڈبلیو۔ جے۔ ایسٹ ویک، صفحات 13-208)

(11)

جو سردار حیدرآباد میں رہتے ہیں ان میں سب سے بڑا سردار نصیر خان تھا (جو مراد علی کا آخری زندہ بیٹا ہے)۔ وہ بہت خوش اطوار اور خوبصورت ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ بڑی مشکل سے چل پھر سکتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً 45 سال ہے۔ اس شہزادے کے کردار کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب اس کی محدود حکمت عملی اور حد سے زیادہ لالچ تھے۔ ان چیزوں نے اس کی جائیداد کو ہی نقصان نہ پہنچایا بلکہ ذرائع آمدنی میں اس کا حصہ بھی کم کر دیا۔ اسی وقت سے خاندانی تنازعے بھی شروع ہوگئے۔ البتہ نیم بربریت اور محدود تعلیم کی وجہ سے اس میں جو برائیاں ہونی چاہئیں تھیں وہ اس میں نہیں تھیں، اور ہمارے حکومتی افسران میں سے جو لوگ بھی اس سے ملے انہوں نے اسے اس کی شہرت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے بہت پسند کیا۔ دماغی صلاحیت سے محروم ناصر خان ہمیشہ ان گروہوں کے ہاتھ میں کھیلتا رہا کہ جنہوں نے خاندان میں جھگڑے قائم کئے۔ اس کا ایک بیٹا تھا۔ جب اس تحریر کے مصنف نے آخری بار اس ملاقات کی تو وہ اس نوجوان کو انگریزی پڑھا رہا تھا۔ اس نوجوان کے باپ نے وضاحت بھی کی کہ اس لئے ہے تاکہ آئندہ وہ مترجمین اور منشیوں کا محتاج نہ بنے بلکہ اپنے

معاملات خود طے کرے۔ ناصر خان اپنے بڑے بھائی نور محمد کی وفات پر تالپور گھرانے کا سربراہ بن گیا مگر اس کے دونوں بھتیجوں نے جب جائیداد اور مقبوضات میں اپنے باپ کا حصہ حاصل کیا تو انہوں نے دربار میں بھی اس کی حیثیت حاصل کرلی اور اس کے برابر کرسیوں پر براجمان ہونے لگے حالانکہ انہیں اصولاً ایک سیڑھی نیچے بیٹھنا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ سے بڑے امیر کا اثر و رسوخ بہت کم ہوگیا ہے۔ مزید اس وجہ سے بھی کہ ان نوجوانوں کو اپنے معاملات میں برطانوی حکومت کے پاس براہ راست اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ ان میں سے چھوٹے بھتیجے نے اپنے چچا کے خیالات کو اپنے مفاد کے خلاف خطرہ سمجھ کر اس کے خلاف بڑا مضبوط گروہ تیار کرلیا ہے۔ البتہ ناصر خان نے اپنے مرحوم بھائی کی طرح سے اپنے ذاتی وقار کو برقرار رکھنے کی غرض سے بڑے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔

میر محمد ولد غلام علی تالپور جو ناصر خان کا چچیرا بھائی ہے وہ صفدر ولد فتح علی بانی حکومت تالپور کے ساتھ مساوی درجہ پر تھا۔ میر محمد بوڑھا آدمی تھا اور اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ البتہ وہ با مقصد تھا لیکن اس کی ذہانت بہت کمزور تھی اور وہ اپنے چچا زاد بھائی نصیر کے اشاروں پر چلتا تھا جس نے اس کی موت پر اس کی پوری جائیداد پر قبضہ کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ صفدر کلیتاً غیر جارح شخصیت کا حامل تھا۔ 1839ء میں کابل کے خلاف دیگر امیروں کی جانب سے افواج بھیجنے کی عمومی مخالفت کے باوجود وہ ان سے کافی اختلاف رکھتا تھا اور اس نے دیگر تین امیروں پر عائد خراج میں حصہ ڈالنے کی پیشکش کی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایسے کسی فعل سے بچنے کی کوشش کی کہ جس کی وجہ سے کسی بھی مشکل میں اُلجھنا پڑے، اور یوں برطانوی حکمرانوں کی نیک نیتی کو تسلیم کرلیا۔ اس کو خراج سے مستثنیٰ کئے جانے کی وجہ سے خاندان کے دیگر اراکین اس سے حسد کرنے لگے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ ان میں پسند نہ کیا جاتا تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے۔

مرحوم نور محمد کے بیٹے یعنی شہزادے شہداد خان عمر 29 سال اور حسین علی خان عمر 20 سال وہ اپنے چچا کے نظریات کے تابع رہتے ہوئے اور اس کی قانونی نگہداشت کی وجہ سے بھی بہت کشیدہ خاطر ہوگئے تھے۔ شہداد خان کردار میں اپنے باپ سے بہت متاثر ہے (یعنی عظیم صلاحیت، نیکی اور دورُخی حکمت عملی) وہ اپنے طوار کے حوالے سے بھی پسند کیا جائے۔ البتہ وہ اپنے وطن کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 7-205)

(12)

خیر پور کا سردار میر رستم ہمیشہ دربار کی سربراہی کرتا ہے اور اس کے سامعین میں نصف تو شہزادے ہی ہوتے ہیں جو زیادہ تر اس کے اپنے یا اس کے بھائی کے خاندان کے ہیں۔ اس کا وزیر اور اس کے کئی لڑکے حکومت کی گاڑی کو دھکا دے کر چلا رہے ہیں۔ دربار میں بلوچی بہت ہیں یہی وجہ ہے کہ وہاں پر کردار اور رسوم کے حوالے سے قومیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ غربت کی وجہ سے ریاست خیر پور کی مالی حیثیت بہت غیر اطمینان بخش ہے۔ ملک اور حکومت کی تقسیم جاگیردارانہ نوعیت کی ہے اور کئی سرداروں کو اراضیاں دی گئی ہیں۔ امیر کی بس اتنی ہی آمدنی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے اپنے اور اپنے خاندان کے اخراجات برداشت کر سکے۔ بلکہ اکثر و بیشتر اسے اپنے اخراجات کے لئے معقول رقم کی وصولی کے لئے کافی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے دربار خیر پور اپنے عوام کے ساتھ بالخصوص شمالی سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ برا سلوک اختیار کرتا ہے۔

خیر پور زرخیز میدان کے وسط میں واقع ہے، اور جب روہڑی میں دریا کے کنارے کنارے یہاں آیا جائے تو راستے میں بہت سے باغات پڑتے ہیں۔ جہاں پر سندھ کی تھکا دینے والی دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ مل جاتا ہے۔ خیر پور میں کوئی ایسی بات نہیں کہ اسے دارالحکومت کہا جائے ماسوائے تقسیم ملک کے۔ بلکہ جب سے سندھ کے امیروں نے یہاں رہائش اختیار کی ہے تب سے تو اس پر اور بھی کم توجہ دی جاتی ہے۔ ان کی رہائش گاہ شہر کے وسط میں چھوٹا سا مٹی کا بنا ہوا قلعہ تھا۔ اس کی حدود بھی بہت مختصر سی تھی اور اتنی بھی نہ تھی کہ کافی تعداد میں (یعنی 17) سردار یہاں پر رہ سکیں۔ بلوچی تو ویسے بھی اس حوالے سے کوئی خاص رکھ رکھاؤ نہیں رکھتے۔ خاندان تالپور کی اس شاخ نے اپنے اجداد کے بہت سے قدیم اطوار اور رسوم و رواج کو دربار کے علاوہ گھریلو امور میں بھی آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ یہ ان کی عظمت کی علامت خیال کئے جاتے ہیں۔ مگر ان کا خزانہ مضبوط ہونے کے باوجود بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ ان کی بہت سی روایات کو پورا کر سکے۔

خیر پور کے تالپوروں کا سربراہ میر رستم ولد میر سہراب تھا (جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اور جسے شمالی سندھ کا یہ علاقہ فتح علی نے جاگیر میں دیا تھا)۔ وہ نرم مزاج بوڑھا شخص تھا، اور بہت اعلیٰ اقدار کا حامل تھا۔ وہ اتنا آزاد خیال تھا کہ ریاستی معاملات خود طے کیا کرتا تھا۔ حالانکہ اصل میں وہ سب ہی

دوسروں کے ذمے ہوتے تھے مگر صرف ایک ہوشیار اور چالاک شخص کے۔ یہ شخص اس کا وزیر فتح محمد غوری ہے۔ میر رستم کا بہت بڑا خاندان ہے اور اس کے بیٹوں کی تعداد ہی آٹھ سے کم نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی دربار میں سازشوں کا شکار ہوتا رہتا ہے اور اپنے آخری ایام میں خود کے اور اپنے بچوں کے درمیان نااتفاقی کے بیج بو کر تباہی کی راہیں تیار کر رہا ہے۔ پورے سندھ میں اس امیر جیسا بامقصد اور غیر جارح کردار کا حامل شخص ملنا مشکل ہے۔ وہ صرف اپنی عمر کی وجہ سے کمزور ہوگیا ہے۔ اس کے بال بھورے ہیں اور وہ بہت مہربان معلوم ہوتا ہے۔ سب ملنے والوں سے اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ البتہ اس نے حکومتی اور ریاستی امور کی جانب بڑی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے، اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اس نے باگ دوڑ دے رکھی ہے ان لوگوں نے اپنی کوتاہ نظری اور خودغرضی کی وجہ سے اس کے لئے بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں اور خاندان میں بھی اس کے لئے بڑے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ باہمی عدم اعتماد، تنازعات، حسد و رقابت اور خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے خیر پور کا حکمران خاندان جنوبی سندھ میں حکمران اپنے بھائیوں کا پوری طرح سے دست نگر تھا۔ بعد کے حالات تو بہت ہی بدتر ہو گئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ میر رستم کو اس کے درباری اور اس کے عوام کے تمام طبقات بہت پیار کیا کرتے تھے اور اس کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ مگر یہاں پر ایک ایسے حکمران کی ضرورت لازمی امر ہے کہ جو سارے معاملات کو سنبھال سکے۔ کوئی بوڑھا شخص تو اس طرح کا کردار ادا ہی نہیں کر سکتا اور اس کے دربار میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو پورے سندھ کے اندر سب سے زیادہ بے چین ہیں اور رنجشی یا رقابتی کردار کے حامل ہیں۔ اس کا نتیجہ خاندان میں افراتفری کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ جب بوڑھا سردار فوت ہو جائے گا، ایسا ہی فطرت کا تقاضا ہے جو جلد ہی وقوع پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ تو خیال یہ ہے کہ اس کی جانشینی کا مسئلہ برطانوی حکومت کے سابقہ انتظامات کے مطابق حل کرنے کے لئے حیدرآباد کے حکمرانوں کو ہی مداخلت کرنی پڑے گی۔ شاید اس کے چھوٹے بھائی کو آگے لایا جائے گا جو پہلے ہی شیر کی مانند اپنا حصہ لینے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ اس کا اگلا بھائی میر مبارک 1839ء میں فوت ہوگیا ہے اور اپنے پیچھے اس نے پانچ بیٹوں پر مشتمل بڑا گھرانہ چھوڑا ہے۔ جن میں سے سب سے بڑے ناصر خان نے اپنے باپ کی جائیداد کے بڑے حصے کو ترکہ میں حاصل کیا ہے اور اپنے بھائیوں کے لئے معقول وظیفے جاری کر دیئے ہیں۔ غلام حیدر ولد میر طرہ بھی اسی خاندان کا رکن تھا۔ لیکن اس کا چھوٹا بھائی میر علی مراد خان خیر پور کا سب سے منفرد کردار ہے۔ مضبوط ارادے اور بڑے بڑے داؤ پیچوں

کے امتزاج نے اس کو قابل ذکر صلاحیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اس شہزادے نے ہمیشہ آزادی سے متعلق اپنے مقصد میں ہمیشہ استقلال اور ثابت قدمی دکھائی ہے۔ میر علی مراد خوبصورت ہے۔ اس کا رنگ البتہ ذرا سانولہ ہے اور تقریباً چالیس سال کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں بلوچوں کے مری قبیلے سے تھی۔ اسی بناء پر اس کے خدوخال ذرا امتیازی معلوم پڑتے ہیں۔ یہ سردار مہربان، باوقار اور باصلاحیت نظر آتا ہے۔ لیکن یہ شراب کا بہت عادی ہے اور ایسے تمام نشے کرتا ہے جو قرآن کی رو سے ممنوع ہیں۔ البتہ اس عادت نے ابھی تک میر کی صحت یا اس کے کردار کو متاثر نہیں کیا ہے۔ اسے اپنی جوانی پر غرور ہے۔ اس کا ذہن بھی صاف ستھرا ہے۔ وہ تا حال اپنے وقار کو پیش آنے والے مسائل کو دور کر سکتا ہے۔ میر علی مراد ہر اس شخص سے حسد کرتا ہے جو اس کے معاملات میں مداخلت کرے۔ وہ اس بلوچی خاندان سے الگ تھلگ ہی دکھائی دیتا ہے جس کی شاخیں حیدرآباد اور خیرپور پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ اس کے کارندے، کاردار، ساتھی اور دیگر اہل معاملہ سب غیر ملکی ہیں اور اس کی ساری فوج جو زیادہ تر پیدل پر مشتمل ہے، وہ ہندوستان، کابل، پنجاب اور بہاولپور کے لوگوں سے تیار کی گئی ہے۔ بلوچی جاگیرداریت اس کے نظام کا ثانوی حصہ ہے اسی لئے وہ اپنے ملک کے رواجوں پر قائم ہے اور اپنے دیگر بھائیوں کی نسبت ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ثابت قدمی نے ہی علی مراد کو اس بات پر اُکسایا ہے کہ وہ حکومت کے امور اور اجداد کی روایات سے قطعاً مختلف و مخالف حکمت عملی اختیار کرے، اور اسی لئے غالبًا اسے حیدرآباد یا خیرپور کے درباروں میں جھگڑے کا سامنا کرنا پڑا ہے کیونکہ اس نے فوج میں سارے ہی غیر ملکی بھرتی کئے ہیں۔ اس کے منصوبے مشکل سے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ البتہ وہ برطانوی حکومت کے بھی قریب آنا شروع ہو گیا ہے۔ یوں اگر اس کے نظریات کی صحیح راہنمائی کی جائے تو یہ نظریات نہ صرف شعوری ہو سکتے ہیں بلکہ ان کا نتیجہ بھی شعوری ہی نکلے گا۔ میر علی مراد کا اہم کام شہر دیجی (Digi) پر قبضہ کر لینا ہے جو قلعوں کا مجموعہ ہے اور اس کی بہت نگرانی کی جاتی ہے۔ سندھ میں ہمارے داخلے کے بعد بہت عرصہ گزرنے کے باوجود میر نے کسی بھی برطانوی افسر کو اپنے قلعوں میں داخل ہونے سے منع کیا ہے۔ یہاں تک کہ خیرپور کی شہزادی کے ساتھ اپنی شادی کے موقع پر بھی امیر نے جب دیجی کی سیر کرائی تو ہر قلعہ سے ہمارے نمائندے اور اس کی جماعت کے لئے سلامی کی توپیں داغی گئیں مگر تب بھی اس نے اپنی طاقت پر شبہ نہ ہونے دیا۔ اس وقت اس نے اپنے رہائشی گاؤں کے نزدیک اپنے مہمانوں کی بڑی

تواضع کی مگر افواج اور خزانے سے بھرے ہوئے اپنے اس مرکز پر کسی اجنبی نظر کو کسی بھی قسم کی جاسوسی کا موقع نہ دیا۔ میر علی مراد کا یہ نظام کہ جس نے برطانویوں کو بھی متاثر کیا ہے نہ تو ہماری حمایت میں ہے نہ ہی ہمارے خلاف ہے البتہ ہماری جانب ایک ایسا منفی کردار ہے کہ جس سے وہ اپنی آزادی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیز اس نے ان تمام اجنبیوں کو پورے عزت واحترام سے نوازا جنہوں نے اس کے ساتھ ملاقات کی۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 17-213)

(13)

سندھ کے سرداروں کا طرزِ رہائش اور ان کے گھریلو اخراجات کلیتاً ان کے کردار اور ان کی عادات سے متعلق ہیں۔ ان میں اکثر ان کی آبائی باتیں شامل ہیں۔ کسی مسلمان شہزادے کے گھریلو معاملات خفیہ ہی رہتے ہیں اور ان کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ بعض اوقات کسی فعل کی زیادتی اس کا انکشاف کر دیتی ہے۔ اس طرح کی کوئی ایک مثال تالپوروں کی ابتدائی تاریخ میں بھی بیان ہوئی ہے لیکن اس چیز کا براہ راست مشاہدہ کبھی نہ کیا گیا ہے۔ سندھ کے امیروں کے خاندانوں کے وہ حصے جہاں پر ان کی بیویاں اور دیگر عورتیں ہوتی ہیں وہاں جانا ممنوع ہے۔ گو کہ وہاں کوئی زیادہ پہرہ نہیں لگایا جاتا ہے لیکن اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ازدواج کی قانونی تعداد (یعنی چار بیویاں فی کس) سے ہٹ کر کنیز عورتوں کی معقول تعداد زنان خانے میں ہوتی ہے۔ مگر ان سے پیدا ہونے والے بچوں کو مار ہی دیا جاتا ہے۔ تاکہ اعلیٰ نسبی میں رکاوٹ نہ آئے اور ناجائز اولاد کی تعداد کم سے کم رہے۔ امیروں کی اپنی شادیاں ہم پلہ بلوچی خاندانوں میں ہوتی ہیں اسی طرح وہ اپنی لڑکیوں کی بھی شادی کرتے ہیں۔ ہم پلہ بلوچی خاندانوں میں مری قبیلہ اور دیگر قبیلے شامل ہیں ان قبیلوں کو دیگر قبائل کے درمیان منفرد مقام حاصل ہے۔ لڑکوں کو حرم میں تربیت دی جاتی ہے اور حرم سے وہ لڑکے تب ہی فارغ ہوتے ہیں کہ جب ایک خاص عمر تک پہنچ جائیں یا دربار میں آنا جانا شروع کر دیں۔ تعلیم میں قرآن کی تعلیم اور محدود طور پر دربار میں بولنے لائق فارسی کی تعلیم کے علاوہ چند عام نظموں کا یاد کرنا پڑھنا شامل ہے مثلاً حافظ یا سعدی کے دیوان۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھی سردار بالکل اَن پڑھ ہیں اور اپنے ملک کے بارے معلومات بھی نہیں ہیں، اس ضمن میں تالپور خاندان کی اگلی نسلیں بھی اپنے اجداد سے بالکل مختلف نہ تھیں اور نہ انہوں نے کسی اصلاح کی کوشش کی۔ خاص

طور پر حیدرآباد میں ان لوگوں کا سخت رویہ ان کو اپنے آباء سے وراثت میں ملا ہے۔ ان کے ذوق میں تبدیلی لانے کے لئے کئی کوششیں کی گئیں جن میں یورپ کی آسائشی اشیاء اور گھریلو فرنیچر میں زیبائش کا استعمال وغیرہ شامل ہے۔ مگر سب ناکام رہیں۔ ہماری مصنوعات جو مختلف اوقات میں ان کو تحفے میں دی گئیں تھیں۔ وہ تعداد میں کبھی ایک سے زیادہ منگوائی ہی نہ گئیں اور نہ ہی کبھی کاٹھ کباڑ کے طور پر رکھنے کی اجازت دی گئی۔ انہوں نے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے لئے کسی قدر چستی دکھائی مگر اس معاملے میں بھی فارس، ترکی اور دیگر ممالک سے تلواریں اور بارود خریدنے پر اکتفا کیا۔ ان چیزوں کا ان کے پاس بہت بڑا خزانہ ہے۔ گو کہ اس ملک کا کوئی بھی فرد واحد اپنے قبضے میں تلوار یا توڑے دار بندوق نہیں رکھ سکتا لیکن وہ یہ چیزیں امیروں کو فروخت کر سکتا ہے۔ خراسان اور قلات سے بہترین گھوڑے یہاں آتے ہیں، اور اچھی نسل کے جانوروں کی اچھی قیمت ادا کی جاتی ہے۔ مکران کے سواری والے اونٹ یا پھر مارواڑ کے اونٹ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 20-218)

(14)

سندھ کے امیروں کا لباس بلوچی ہونے کی وجہ سے کافی امتیازی معلوم ہوتا ہے جبکہ ان کے عوام یہ چیزیں مہنگی ہونے کی وجہ سے خرید ہی نہیں سکتے۔ سندھی امیروں کے لباس جن چیزوں پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ حیثیت والی چیزیں مہنگی لنگی، کشمیری چادر اور وہ پٹکا ہے جو کمر پر باندھا جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر ان کے سامان میں ٹوپی کو بڑا مقام حاصل ہے جس کو امیر سونے اور چاندی کے اجزاء سے سجا کر پہنا کرتے ہیں۔ تیسرے نمبر پر تلوار اور نیام ہیں۔ یہ سونے سے پُر ہوتی ہیں اور ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ڈھالیں بھی اسی دھات کی بنی ہوتی ہیں۔ امیر انگوٹھی کے علاوہ اور کوئی زیور استعمال نہیں کرتے۔ مسلمان عام طور پر ان چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ فوجی لوگوں کے لئے ہتھیار ہی اس کا ذاتی زیور خیال کیا جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں اس لباس میں ذرا موٹے سے بڑے کوٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کوٹ ہمیشہ رنگین قسم کا ہوتا ہے یا پھر چوڑے کپڑے کا جیکٹ بنایا جاتا ہے۔ جنگل میں کھیل کے لئے جاتے وقت گہرے ہرے رنگ کی ٹوپیاں تن زیب کی جاتی ہیں تاکہ جنگل کے رنگ سے مشابہت رہے۔ سفر کے دوران، کوتا پاچا (Kotah-Pacha) کی کھال کے بڑے بڑے جوتے

پہنے جاتے ہیں۔ایسا ایرانی زیبائش میں شامل ہے۔

سندھی امیروں کے نزدیک معیشت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔طلوع آفتاب سے (یعنی مشرق میں یہ روایت ہے کہ دن میں تمام دنیاوی امور سرانجام دے دیئے جائیں) چاشت کے وقت تک جو ہمارے ناشتے کا وقت ہے۔ریاست کے مختلف امور سرانجام دیئے جاتے ہیں مثلاً خفیہ امور طے کرنا، درخواستوں کو وصول کرنا اوران کے جوابات تیار کرنا، مالیات کی رپورٹیں تیار کرنا اور خط وکتابت کرنا۔ دن کا گرم حصہ گھر کے اندرونی حصے میں بسر کیا جاتا ہے اور کم از کم تین یا چار گھنٹے سونے میں لگائے جاتے ہیں۔غروب آفتاب کے وقت نماز کے بعد ہرامیر کھلا دربار منعقد کرتا ہے۔اس کو مجلس یا تقریب خیال کرتے ہوئے ریاست کے تمام افسران، تمام سرداراوران کے ساتھی وغیرہ دربار میں آتے ہیں یہ امیر کی کھلے بندوں تعظیم کرنے کا اچھا موقع ہوتا ہے۔اس دوران اس سے درخواستیں کی جاتی ہیں اور کسی بھی عوامی یا ذاتی مسئلے کی زبانی اطلاع دی جاتی ہے۔تقریباً سات یا آٹھ بجے دربار ختم ہوجاتا ہے اوراس وقت امیر پھر سے اندر چلا جاتا ہے۔یا پھر بعض موقعوں پر قصہ گویوں یا شاعروں سے ان کی باتیں سنتا ہے یا پھر عورتوں کا ناچ دیکھتا ہے۔جسمانی ورزش کو کبھی صحت کے لئے ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔نیز ماسوائے شکار کے یا پھر بزرگوں کے مزارات پر جانے یا اپنے اجداد کی قبروں پر جانے کے علاوہ سندھ کے امیر اپنے قلعے سے کبھی نہیں نکلتے۔ ہمہ وقت ان کی رسائی ہوسکتی ہے۔ شکایت پر تحقیق کرا کر فوراً اس پر کارروائی کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حکمران کے فرض کے لازمی جزو سے دور رہتے ہیں۔یعنی ذاتی طور پر کبھی تفتیش نہیں کرتے اور نہ کبھی ملک کا دورہ کرتے ہیں یوں وہ اپنے عوام کی حوصلہ افزائی نہیں کر پاتے۔(ٹی۔پوسٹن، صفحات 35-223)

(15)

ان تین اہم مقامات، حیدرآباد، خیرپور اور میرپور سے ہی سندھ کے امیر پورے ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔جن میں سے ہر خاندان کے سب سے بڑے رکن کو امیر کہلانے کا حق حاصل ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ میر فتح علی اوراس کے دو بھائی سُنّی تھے جبکہ میر مراد اپنے ایک ایرانی وزیر اسمٰعیل خان کے زیراثر کٹر شیعہ ثابت ہوا ہے۔میر مراد 1834ء میں فوت ہوگیا۔اس کی وفات کے بعد ایک سہ رکنی ٹولی نے حکومت سنبھالی جو میر نور محمد، نصیر خان اور صفدر پر مشتمل تھی، اوران میں سے اول الذکر کی

1839ء میں وفات کے بعد ہمیں حیدرآباد میں پانچ امیر نظر آئے جن میں سے سب سے بڑے میر نصیر خان کو خاندان کا سربراہ تسلیم کیا گیا۔(ایل۔اورلچ۔I،صفحات 91-90)

(16)

عزت مآب میر علی مراد خان بہادر جو تالپور قبیلے کا سردار ہے اور شمالی سندھ کا رئیس ہے اس کے پہلی بیوی سے دو بیٹے ہیں۔ میر شاہ نواز خان اور میر فیض محمد خان ہیں ان کی عمریں بالترتیب 25 اور 23 سال ہیں۔اسی ماں سے تین لڑکیاں شادی کے قابل بھی ہیں۔ان کی یہ ماں بلوچوں کے مری قبیلے سے ہے۔ایک دوسری بیوی سے جو کنچنی (Kunchunnee) یا رقاصہ ہے اور بعدازاں جس کی بہن سے بھی اس نے شادی کر لی تھی۔اس کے بطن سے میر کی اولاد میں میر جہاں محمد عمر 18 سال اور میر خان محمد عمر 16 سال موجود ہیں۔میر علی مراد کی ایک چوتھی بیوی بھی تھی۔اس کی ماں بھی تاحال زندہ ہے اور آج بھی اس کی ابتدائی خوبصورتی کے آثار نمایاں ہیں۔ بڑے تینوں لڑکوں کی شادیاں ہوگئیں ہیں اور اولادیں بھی ہیں۔میر شاہ نواز اور میر فیض محمد کے خاندان دیجی میں رہتے ہیں۔وہیں پر ان کی والدہ اور دادی بھی رہتی ہیں۔لیکن میر جہاں محمد کا گھرانہ اپنی ماں کے ساتھ خیر پور کے محل میں رہائش پذیر ہے جسے ڈیوڑھی کہتے ہیں۔چھوٹے والے شہزادے مشکل سے ہی اپنے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں کیونکہ میر اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ وہ شکار کے وقت اس کے ساتھ ساتھ رہیں۔اس طرح سے انہیں خیموں کے قیام کا تجربہ حاصل ہے۔Sindh Blue Book کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے فاربس (Forbes) کی رپورٹ میں کچھ شدید غلط اور بے بنیاد بیانات ملے کہ مردوں کو بیگم صاحبہ کی رہائش گاہ میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔اگر کوئی کام پڑے تو صرف ایک یا دو بڑے خدمت گار ہی اندر جا سکتے تھے۔اس موقع پر بھی وہ پردہ کیا کرتی تھیں۔میر علی مراد زنان خانے کی خواتین کے لئے اپنے ساتھ بہت سے آلات موسیقی اور ساز ندے لے گیا تھا۔ان سے وہ پہلے تو بہت محظوظ ہوئیں مگر پھر ان چیزوں سے کھیلتے کھیلتے تنگ آئیں اور ان سب کو توڑ ڈالا۔(ای۔اے۔لانگلے۔I،صفحات 4-242)

(17)

میر اور اس کے لڑکے بڑے وقار کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں،اور ان کے ساتھی ان کے ساتھ

ساتھ لگے رہتے ہیں۔ یہ ان کے وقار میں اضافہ کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ دیجی میں ایک شام مکان کی آڑ کے سائے میں ایک چارپائی ڈال دی گئی اور اس کے آگے قالین ڈال دیا گیا۔ چھوٹے شہزادے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ان کے ملازمین سامنے قالین پر بیٹھ گئے اور بغیر کسی تقریب کے ہی آپس میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اسی وقت بغیر کسی ہتک یا بےعزتی کا احساس کئے ہوئے اس خاندان کی عورتیں بھی سیر کرنے باہر نکل آئیں، اور اونٹوں پر مخملوں میں لپٹی ہوئی باغات کی سیر کرنے لگیں۔ ان کے پردے باریک کپڑوں کے بنے ہوئے تھے اور بڑے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ میر کی اپنی اور اس کے لڑکوں کی بھی بیویاں اور بیٹیاں سفر کے لئے کبھی امیر کے ساتھ گھر سے نہیں نکلتیں البتہ جب وہ عورتوں کے لئے الگ سے انتظام کر لے تو نکلتیں ہیں۔ تینوں بہنیں بہت پسند کی جاتی تھیں اور ان کو ''اعلیٰ سرکار'' کہا جاتا ہے۔ البتہ ان میں سے سب سے بڑی بہن حسد اور رقابت کا نشانہ بن کر اس وقت اپنے وقار سے محروم کر دی گئی کہ جب میر انگلینڈ میں تھا۔ بیگم غلام نے مجھے بتایا ہے کہ کیونکہ وہ اکثر ان سے ملنے جاتی تھی، وہ تینوں دیکھنے میں تو اچھی نہیں ہیں مگر فطرت ان سب کی اچھی ہے۔ (ای۔اے۔لانگلے۔II، صفحات 137-136)

دربار

(1)

دریا کے مشرق کی طرف کا صوبہ سندھ اپنی شمالی ترین حد سے ساحل سمندر تک ایک مکمل میدان ہے سوائے دو تین چھوٹی پہاڑیوں کے جو گنجہ پہاڑیاں کہلاتی ہیں اور اس جزیرے پر واقع ہیں جس پر حیدرآباد ہے۔ دریا کے مغربی کنارے پر سہوان کے عرض بلد 26.6 سے سطح زمین متنوع ہے۔ کچھ علاقے پہاڑی ہیں، کچھ ہموار اور کچھ میں چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں حتیٰ کہ ہم سمندر تک پہنچ جاتے ہیں۔

سہوان کے شمال میں میدان سیوستان کی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سندھ کے موجودہ حکمران شکار کے شوقین ہونے کی وجہ سے اپنے اس جذبے کی تسکین کے لئے اپنی مملکت کی رونق اور اپنی رعایا کے مفادات کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے اور انہوں نے دریائی کناروں کے ساتھ ساتھ بہترین علاقے شکار کے لئے محفوظ کر رکھے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیس سال پہلے جو علاقے کاشت کے لحاظ سے

سرفہرست تھے اب بیکار درختوں اور جھاڑیوں کے نا قابل عبور جنگلات بنے ہوئے ہیں۔

سفیر کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد صبح کو ہر امیر نے ایک ایک رسمی وفد ہمارے پڑاؤ میں بھیجا جو قلعہ سے کوئی ایک میل جنوب مشرق میں دریائے پھلیلی پر لگایا گیا تھا۔ مقصد آمد پر مبارک باد اور مزاج پرسی تھا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وفد کے سب ارکان (جو سلام و پیام بھی لائے تھے اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں بھی) خدمتگاروں (ذاتی ملازمین، ادنیٰ دیوان جیسے ایران کے پیش خدمت) سے بڑے درجے کے نہ تھے تو یہ مناسب نہ سمجھا گیا کہ مسٹر سمتھ بذات خود ان کا استقبال کریں چنانچہ مسٹر ایلس نے یہ فرض انجام دیا۔ اس پر انہیں مایوسی تو بہت ہوئی لیکن ہر ایک اپنا اپنا تحفہ لے کر مطمئن ہو گیا اور خوشی خوشی واپس گیا۔ لیکن امیروں نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ایک دیوان مشتاق رام نامی کے ذریعے ایک طویل خطبہ دلوایا کہ سفیر کا رویہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس سے ظواہر احترام بخوبی واضح ہوں جس پر امیر اتنے بضد تھے اور یہ کہ سفیر نے جواباً مزاج پرسی کیوں نہ کی؟ اسے جواب دیا گیا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن جو منشی سلام و پیام لے کر گیا اسے کسی نے قلعہ میں ہی داخل نہ ہونے دیا گیا اور مجبوراً اس نے ایک آدمی مسٹر سمتھ کے پاس بھیجا کہ وہ سلام پہنچانے کے لئے کیا اقدامات کرے۔ اس پر اس شریف انسان نے تکلف برطرف رکھتے ہوئے یہ کہلا بھیجا کہ وہ حکومت کے کسی بھی عامل کو یہ پیغام پہنچا دے جو اسے امیروں تک پہنچا دے۔

دیوان کو مزید بتایا گیا کہ سفیر کے حیدرآباد آنے سے قبل مسٹر ایلس نے کئی بار سرکاری موضوعات پر امیروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن منشی کو قلعہ میں داخل نہ ہونے دیا گیا اور اسے جواب کے لئے بازار میں ٹھہرنا پڑا لہٰذا اگر کوئی غفلت ہوئی تھی تو وہ حکومت سندھ کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ اگر بڑے درجے اور مقام کا منشی ان کے حضور میں نہایت اہم زبانی پیغامات کے باوجود نہ پہنچ سکتا تھا تو سفیر کے روبرو خدمتگاروں کی عدم باریابی پر امیروں کے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

ایک سخت لڑائی ہمارے آدمیوں اور سندھیوں کے درمیان ہوتے ہوتے رہ گئی جب ایک سندھی نے ایک سنتری کے پاس سے زبردستی گزرنے کی کوشش کی اور روکنے پر اسے مارا اور اس کی ٹوپی گرا دی۔ مجرم کو پکڑنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ مجمع میں گم ہو گیا اور سفیر نے اس واقعہ کے دوبارہ ہونے کو روکنے کے لئے (جس کے نتائج بیحد خطرناک ہو سکتے تھے اگر سپاہی نے تحمل سے کام نہ لیا ہوتا) محض یہ اقدام کیا کہ آئندہ سنتری قناتوں کے اندر ہی متعین ہوں اس وقت ہمارا پڑاؤ کسی میلہ کے وسط میں

معلوم ہوتا تھا کیونکہ ہر پیشہ وقماش کے بیشمار لوگ دن رات اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے اور بھانڈ، مداری، ریچھ والے اور فقیر ہمیں اپنی اپنی راگنیاں سناتے رہتے تھے۔ فقیر تو نرسنگھے اور ڈھول بھی بجاتے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے پیشہ میں بیحد ثابت قدم تھے اور سفیر کے خیمے سے قریب ترین فاصلے پر اپنے اڈے جماتے تھے جہاں وہ کئی کئی دن تک اپنے تقاضوں کے ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور مایوس ہو کر کبھی کبھار مشن کو پیغمبر کے انتقام اور امیروں کے غضب سے بھی ڈراتے تھے تاکہ ہم ان کی جھولی بھر دیں۔ دوسرے اس وقت حملہ کرتے جب ہم عموماً صاف موسم میں سوار ہو کر باہر نکلتے۔ پھر وہ سفیر کے گھوڑے کے آگے دوڑتے جاتے اور قسمیں کھاتے جاتے کہ اگر ہم انہیں نہال کر دیں تو وہ امیروں سے ہماری سفارش کریں گے لیکن اگر ہم ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیں تو ہمیں فوراً ہندوستان چلے جانا چاہئے کیونکہ ان کی خوشنودی کے بغیر یہاں کچھ ممکن نہ تھا۔ پہلے پہل تو یہ چھوٹ بھیئے (جن میں ایشیا کی ہر قوم کے لوگ تھے) ہمیں اپنے شور سے سخت پریشان کرتے تھے لیکن ہم جلد ہی اس کے عادی ہو گئے اور ان کے نعرے اور بددعائیں ہمارے لئے دل لگی کا ایک ذریعہ بن گئیں۔

سفیر کے حیدرآباد پہنچنے کے دوسرے دن اس کی پہلی باریابی کی رسمی تقریبات کا تعارف کرایا گیا اور جیسا کہ ہمیں ڈر تھا امیروں کی تجاویز نے ایسے مذاکرات کا دروازہ کھول دیا جس سے آخری انتظامات میں قریباً ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی اور ایک دو دفعہ تو ہمیں شرف ملاقات کے بغیر ہی سندھ چھوڑ دینے کا سوچنے پر مجبور کر دیا۔

یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ مسند زمین سے کافی اونچی تھی لہٰذا سفیر نے مطالبہ کیا کہ اسے بیٹھنے کے لئے کرسی دی جائے اور مشن کے داخلہ پر تینوں امیر اُٹھ کھڑے ہوں لیکن امیر نہ صرف کھڑے ہونے سے انکار کرتے تھے بلکہ الٹا یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہم دربار میں داخل ہونے سے پہلے غیر مسلح ہوں اور اس بلاجواز تجویز کی دلیل یہ تھی کہ راجہ جے پور کے دو وکیلوں نے ایک ایسے ہی موقع پر ایک امیر پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی تھی جو پہلی سے بھی بڑی توہین تھی۔

مسٹر سمتھ نے کھلے لفظوں میں یہ مطالبہ لانے والے شخص کو بتا دیا کہ وہ یہ توہین آمیز مطالبہ ماننے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن اگر بفرض محال وہ یہ مان لے تو بھی وہ اپنے عملہ کو اس پر مجبور نہ کر سکتا تھا لہٰذا وہ ایسی صورت میں اپنی حکومت کا وقار خطرے میں ڈالنے کی بجائے فوراً سندھی مملکت سے رخصت ہونا بہتر سمجھے گا۔

بالآخر ولی محمد خان (جو ٹھٹھہ میں ہم سے ملا تھا) کو بیچ میں ڈالا گیا اور اسے ہم سے ہر قسم کی شرائط طے کرنے کا مکمل اختیار دے دیا گیا لیکن مذکورہ موضوع کا ذکر چھڑتے ہی اس نے سفیر کو اتنا مضبوط پایا کہ وہ یہ بات ہی ترک کر گیا اور دیگر امور پر متوجہ ہو گیا۔

جب خان مشن کی آمد پر امیروں کے قیام کے خلاف اپنے دلائل کا سارا اسلحہ ختم کر چکا تو وہ نہایت ہوشیاری سے اپنے اس خود ساختہ مینار عظمت سے زینہ بہ زینہ نیچے اُترنے لگا۔ وہ یہاں سے شروع ہوا کہ امیر ایسی حرکت کریں گے گویا وہ اُٹھنے والے ہوں لیکن بالآخر یہ فیصلہ ہو گیا کہ وہ سفیر کے نمودار ہونے پر کھڑے ہوں گے اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک وہ ان کے دائیں طرف آ کر بیٹھ نہ جائے اور ہمارے رخصت ہونے پر بھی وہ ایسی ہی تعظیم کریں گے۔

اس مباحثے کا نتیجہ حکومت سندھ پر ایک صحیح ترین تبصرہ ہے بلکہ ان تمام ایشیائی حکومتوں پر جو اپنی پالیسی کی کامیابی انہی پابندیوں میں سمجھتے ہیں جو وہ خود پرستانہ تقریبات کے سلسلے میں غیر ملکیوں پر عائد کر سکتے ہیں حالانکہ ہر صاحب مرتبہ کا مقصد تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ انہیں واضح ترین اور اٹل اقدامات کے ذریعے انہیں ختم کر دے ورنہ اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ نہ صرف ان کی وجہ سے اپنے ہی دربار میں نشانہ تضحیک بن جائے گا بلکہ اس کے آئندہ مذاکرات بھی اس طرح کی چالاکیوں سے کامیاب نہ ہوں گے جو اس کے لئے بے سود اور توہین آمیز ثابت ہوں گے۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

(2)

جس شام ہمارے طریقہ استقبال پر فیصلہ ہو گیا ہمیں اخوند محمد بقا خان نے امیروں سے متعارف کرایا۔ وہ ہمیں دربار میں لے جانے کے لئے ہمارے پڑاؤ میں آیا اور کئی دفعہ سفیر اور اس کے عملہ کے مرتبہ و مقام کو فرداً فرداً دہرایا۔ ڈھلان جس کے مشرقی پہلو پر قلعہ حیدرآباد بنا ہے۔ مکانوں کی چھتوں بلکہ قلعہ بندیوں پر مردوں عورتوں کی بڑی تعداد موجود تھی جو تالیاں بجا بجا کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ قلعہ کے پہلے دروازے سے ہم داخل ہوئے تو راستہ ایک ڈھلوان چڑھائی تھی جس کے دو رویہ تفنگچی کھڑے ہوئے تھے حتیٰ کہ ہم دوسرے مینار کے پاس آ گئے جس کے نیچے ایک پیچ دار راستہ تھا۔ محل تک گلیاں مسلح آدمیوں سے ایسے بھری ہوئی تھیں کہ ہم بڑی مشکل سے اپنے گھوڑوں تلے مسلنے سے بچے۔ آخر کار وہ جگہ آ گئی جہاں ہمیں اُترنا تھا اور وہاں ولی محمد خان اور دیگر ارکان دولت نے ہمیں خوش

آمدید کہا اور ہمارے آگے آگے ایک بڑے کشادہ چبوترے کی طرف چلے جس کے آخری کونے پر تینوں امیر نشست پر بیٹھے تھے۔ چبوترے پر خوبصورت ترین ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے لہٰذا ہم نے اپنے جوتے اُتارے اور جونہی سفیر نے امیروں کی طرف پہلا قدم اُٹھایا تو وہ سب کے سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے حتیٰ کہ سفیر اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا جو دوسری نشستوں سے اپنے کڑھے ہوئے کپڑے کی وجہ سے ممتاز تھی۔

جونہی ہم بیٹھ گئے تو ایسی افراتفری پھیلی کہ نا قابل بیان ہے۔ اس کی وجہ شاید ہمارے عزائم پر بے اعتمادی تھی کیونکہ خدمت گار لفنگچی اور شمشیر باز سب یہاں گھس آئے اور ہمیں قریباً محصور کر لیا، ان میں سے جو آگے تھے انہوں نے تو اپنے پاؤں بھی ہماری تلواروں کی نیاموں اور ہمارے کوٹوں کے لہنگوں پر رکھ دیئے جو ہمارے بیٹھنے کے انداز کی وجہ سے قالینوں پر رکھے ہوئے تھے لیکن آیا یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا یا محض اتفاق، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن بعد کی ملاقاتیں مجھے اول الذکر توجیہہ کی طرف زیادہ کھینچتی ہیں۔ حکمرانوں نے فرداً فرداً مزاج پرسی کی کیونکہ یہ صرف رسمی باریابی تھی۔ ہمیں آئے ہوئے آدھ گھنٹہ گزر چکا تو امیر کلاں نے ہمیں رخصت کا اشارہ دیا۔ ہندوستانی درباروں میں پان سپاری اور عطر کے ذریعے اشارہ رخصت دیا جاتا ہے اور ایران میں قلیان اور قہوہ کے ذریعے لیکن یہاں کوئی ایسی رسم نہ تھی۔

امیروں کی تلواریں اور خنجر مرصع تھے۔ ان کی کمر کی پیٹیوں پر بھی غیر معمولی جسامت کے ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے اور وہ خود بھی بیشمار جواہرات پہنے ہوئے تھے۔ وہ عمر کے مطابق نشست پر بیٹھے تھے۔ بڑا وسط میں تھا، منجھلا دائیں طرف اور چھوٹا بائیں طرف۔ وہ ایک گدے پر بیٹھے تھے جو پورے دائرے میں پھیلا ہوا تھا، اور اس کے اوپر ان کے لئے ایک ریشمی گدا رکھا ہوا تھا جو کوئی ایک انچ موٹا تھا اور جس کے اوپر سونے اور چاندی کے پھولوں سے کڑھی ہوئی ململ پڑی تھی۔ ان کی پشت پر ایسے ہی کاڑھے ہوئے تین تکیے تھے جو اپنے جواہرات کی چمک دمک سے دربار کو منور و موثر بنا رہے تھے۔ اکثر امراء وزراء بھی اپنے بہترین رنگ ڈھنگ میں تھے اور پورا منظر اتنا شاندار اور نظر فریب تھا کہ ہمیں حیدرآباد کے دربار سے اس کی قطعاً توقع نہ تھی۔

ذاتی طور پر امیر موٹے، متوسط قد کے انسان ہیں۔ بڑا امیر غلام علی پینتالیس سال سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا اور اس کے دونوں بھائی، میر مراد علی اور میر کرم علی اس سے کئی کئی سال چھوٹے ہیں۔

چھوٹا میر اکرم علی ایک دل خوش کن کشادہ چہرے مہرے کا مالک ہے، ہنس مکھ ہے اور حسن طبیعت کا آئینہ دار ہے جو اس کے بڑے بھائیوں کو نصیب نہیں ہیں جو سرد مزاج اور سخت دل بتائے جاتے ہیں لیکن ظالم نہیں ہیں۔

لباس کے آرائشی حصوں کے سوا تینوں بھائی ایک ہی طرح ملبوس تھے اور نفیس ململیں چوغے پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد نہایت بیش قیمت لنگیاں باندھے ہوئے تھے۔ ان کی پگڑیاں باریک شفاف جالی کی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے اتنا طویل سرپوش کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ قطر میں دو سے ڈھائی فٹ ہوں گی لیکن یہ اس خوبصورتی سے باندھی گئی تھیں کہ بھاری یا ناموزوں معلوم نہ دیتی تھیں۔

قیام حیدرآباد کے دوران موسلا دھار بارشیں ہوئیں۔ دریائے پھلیلی میں طغیانی آ گئی اور اگر ہم نے خندقیں نہ کھودی ہوتیں تو ہمارا پڑاؤ ڈوب گیا ہوتا۔ ان کی وجہ سے پانی نہروں میں جا گرا۔ ان کے بعد بے پناہ حبس ہوا اور ہمارے کئی آدمی بیمار پڑ گئے۔ لیکن ورزش اور دیگر حفاظتی اقدامات نے افسروں کو عموماً اچھی صحت میں رکھا گو بے پناہ گرمی پریشان کرتی رہی۔ درجہ حرارت شاذ و نادر ہی 1.2 سے نیچے گرا اور راتوں کا جان لیوا حبس تو میں نے ہندوستان بھر میں نہ دیکھا تھا۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

(3)

میں دس نومبر کی صبح حیدرآباد میں داخل ہوا۔ میں پورے یقین کے ساتھ نہیں بتلا سکتا کہ اس وقت مجھے کتنا مصروف مگر مختلف سا منظر نظر آیا۔ تقریباً دس یا بارہ ہزار افراد جمع ہو چکے تھے اور سب ہی مجھے عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شریف ہندو عورتوں کی عادت کے برخلاف وہاں پر موجود عورتوں نے بھی خود کو میری سواری کے قریب کر لیا۔ اتنی بھیڑ ہو گئی کہ آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ سندھی پولیس کے پاس تو کوئی تلوار یا بندوق بھی نہ تھی کہ میرے لئے راستہ صاف کیا جا سکے۔ شہر کے اندر ایک میل تک میں ایک اونچے کالے گھوڑے پر چڑھا رہا جو بہت خوبصورت تھا۔ یہ گھوڑا ولی محمد خان لایا تھا اور بڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے گاڑی بان نے مجمع سے بچنے کے لئے مجھے نصیحت کی کہ میں پالکی کے اندر بیٹھا رہوں تاکہ دکھائی نہ دوں اور یوں مجمع کا زور ختم ہو جائے۔

وہ دن بڑا گرم تھا۔ ایسے میں میں بڑی مشکل سے حیدرآباد کے قلعہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ یہ صرف امیروں اور ان کے گھرانوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہے۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ مجھے سندھ

کے امیروں سے فوراً ہی تعارف کرانا ہے۔ قلعہ کے اندر جو خاموشی تھی وہ باہر کے شور شرابے سے بالکل مختلف تھی۔ دربار کے ملازمین کی رہائش چند تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنے کے بعد میں غیر متوقع طور پر خوش لباس سندھیوں کے ایک مجمع میں پہنچ گیا، یہ بہت بڑا اور کھلا علاقہ تھا جس کی دیواریں ہر جانب سے مصوری سے مزین تھیں اور فرش قالینوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کے ایک سرے پر تین بڑے بڑے محرابی دروازے تھے کہ جن پر سبز بانات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے وزیر اور ایک دوسرا افسر ایک جانب مجھے لے گیا، اور قبل اس کے کہ میں کسی ہنگامی نوعیت کو سمجھ پاتا، میرے جوتے بھی اُتار دیئے گئے۔ میں اب امیروں کے سامنے کھڑا تھا۔

اب میں ایک ہی نظر میں پورے حکمران خاندان کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ہاں بچپن میں مشرق کی کہانیوں اور قصوں میں ضرور پڑھا ہوا تھا۔ یہ گروہ جزوی دائرے کی شکل میں نظر آتا تھا۔ بیچ میں دو بڑے امیر اپنے مسند پر بیٹھے جو سفید فرانسیسی کپڑے سے تیار کیا گیا تھا، اور اس پر بڑی خوبصورتی سے زری کا کام ہوا تھا۔ اس کے چاروں کونوں پر سونے کے جواہرات گڑھے ہوئے تھے جن کی مشابہت اناناس کے پھل (pine-apples) کی سی تھی۔ ان کے عقب میں مخمل لگا ہوا تھا جو بہت قیمتی سوزن کاری سے ڈھکا ہوا تھا۔ امیروں کے ہر جانب ان کے گھرانے کے افراد موجود تھے۔ جن میں ان کے بھتیجے میر صفدر اور محمد اور بیٹے مراد علی، میر نور محمد اور نصیر خان شامل تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ان کے ذرا دور کے رشتے دار بیٹھے تھے جن میں میر محمد، ان کا چچا اور اس کے بیٹے احمد خان اور جہاں خان شامل تھے۔ ان سب کے پیچھے خوش لباس ملازمین اور امیروں کے اسلحہ برداروں کا مجمع لگا ہوا تھا۔

کسی یورپی کے لئے نیز خاص کر ایسے شخص کے لئے جس نے مقامی تقریب کا بڑا اعلیٰ اور معیاری تصور قائم کر لیا ہو، اس کے لئے ان درباریوں کے ملبوسات کا ذوق بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ میرے سامنے موجود ماحول کی صفائی بھی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ یہاں پر بھڑکیلے یا قرمزی رنگ کا نام و نشان تک نہ تھا، اور نہ ہی وہ دھول یا گندگی تھی جو ہندو اور امیروں کے ہاں نظر آتی تھی اس کے برعکس بڑی سادگی تھی۔ تمام امیر اور ان کے معاونین تقریباً ایک جیسے لباسوں میں ہی ملبوس نظر آرہے تھے۔ انہوں نے عمدہ سفید ململ پہنی ہوئی تھی جو بڑی عمدگی سے تیار کی گئی تھی۔ اس کے کناروں پر زری کا کام ہوا تھا۔ ریشم کے چوڑے ترکی پاجامے تھے جو ٹخنوں پر سے تنگ تھے اور قدرے گہرے نیلے تھے۔

سندھی ٹوپیاں کہ جن کی میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں وہ سنہری زربفت یا پھر مخمل کی بنی ہوئی تھیں۔ کشمیری شالوں کا ایک جوڑا جو عموماً سفید نظر آتا تھا اور بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا، وہ ان لوگوں نے کندھوں پر اور ایرانی خنجر و پیٹی جو ہیروں سے یا پھر قیمتی پتھروں سے سجائی گئی تھی، ان پر ڈالا ہوا تھا۔ ان چیزوں سے امیر کا لباس اور اس کی آرائش مکمل ہو جاتی تھی۔

سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد میں اس سے زیادہ کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ ان کے اطوار اور اخلاق بہت اچھے ہیں اور یہ بھی ماننا پڑا کہ کم از کم ظاہری طور پر ان کو جو عروج حاصل ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ چھوٹے امیر اپنی طبع میں ذرا آزاد نظر آتے ہیں اور کبھی کبھار کسی مقامی یا یورپی اثر سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ بڑا امیر اس گروہ میں بظاہر کہ قابل تعظیم دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا اپنی ابتدائی زندگی میں سخت محنت و مشقت اور مصائب برداشت کرنا ہے۔ حقیقت میں وہ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن اگر ان کی داڑھی اور بالوں کا محتاط طریقے سے معائنہ کیا جائے تو وہ پچاس سال سے زیادہ عمر کے معلوم نہیں ہوتے۔ البتہ ان میں ایک اختلاف ضرور ہے۔ وہ یہ کہ بڑے امیروں اور چھوٹے امیروں میں خاندانی مشابہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹے امیروں نے اپنی ماؤں کی جانب سے صاف رنگت وراثت میں پائی ہے اور ان کے بال کالے ہیں۔ ان کی ابروویں لمبی ہیں اور آنکھوں میں چمک ہے۔ خاص طور پر میر نصیر خان مجھے بہت خوبصورت آدمی نظر آیا ہے۔

دربار سندھ کا عمومی انداز اور امیروں کی وضع قطع سے متاثر ہونے سے میں انکار نہیں کر سکتا۔ اس اجلاس میں تمام افسران کا اندازہ ان کے لباس اور اطوار سے لگایا جا سکتا تھا، اور وہ سب ہی اعلیٰ درجے کے دکھائی پڑتے تھے یہاں پر عوام کا رش نہ تھا۔ ہجوم کو مکمل طور پر دروازے کے باہر بند کر دیا گیا تھا، اور ہر طرف خاموشی تھی، اور ہر شخص منظم اور صاحب وضع و قطع نظر آتا تھا۔ اس چیز نے ان کی عزت اور وقار کے حوالے سے مجھے اور بھی متاثر کیا۔ جو کچھ میں نے بیان کر دیا ہے اس کے بعد یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ عزت مآب امیر نے سرکاری دربار میں مجھے مدعو کیا تھا۔ ہمارا مقامی نمائندہ تو ہماری حکومت کی جانب سے آنے والی و دیگر سفارتوں کے بھی ساتھ رہا تھا وہ بھی یہاں پر موجود تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اس موقع پر ہونے والے انتظامات اور میرے استقبال کی نوعیت کافی مختلف انداز میں ہوئے ہیں جو ان عام تقریبات میں ہونے والے انتظامات سے کہیں بڑھ کر ہیں جو اس نے سندھ میں اپنے بیس سالہ قیام کے دوران دیکھیں۔

چونکہ میرے جوتے دروازے پر ہی اُتار لئے گئے تھے لہٰذا میں نے اپنی ٹوپی اُتارنا مناسب نہیں سمجھا اور ٹوپی سر پر پہنے ہوئے ہی اس ہال کے وسط میں جانے لگا۔اس پر پورے خاندان نے مجھے سلام کیا اور مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں اس کرسی پر براجمان ہوجاؤں جو بڑے امیروں اوران کے مسند کے روبرو ہے۔فوراً ہی فارسی زبان میں گفتگو شروع کردی گئی اور ایک ہی سانس میں مجھ سے پچاس سوالات پوچھ لئے گئے۔آپ ٹھیک ہیں؟ آپ خوش ہیں؟ آپ اچھے ہیں؟ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ۔ان سوالات کے جواب میں جتنا مجھ سے ہوسکا میں نے اتنا اچھا ہی جواب دیا کہ ''جب سے میں سندھ میں آیا ہوں،تو مجھے علاوہ مہربانی اورعزت افزائی کے کسی چیز سے واسطہ نہیں پڑا، اور میں ان کی اس توجہ دینے کا بھی شکرگزار ہوں۔'' میر کرم علی نے سوچا کہ میں ایک ایسا مہمان ہوں جو دعوت پر آیا ہے۔اس نے وزیراعظم کو میرا مہمان دار مقرر کردیا۔جس نے ہر حوالے سے میری تمام خواہشات کو ان کے احکامات کے مطابق فوراً پورا کرنا تھا۔پھر شہر سے کچھ فاصلے پر موجود ایک باغ میرے استقبال کے لئے تیار کیا گیا۔مجھے اختیار تھا کہ میں چاہون تو وہیں رہوں اور چاہوں تو حیدرآباد کے قلعے میں ان کے ساتھ ہی رہائش اختیار کرلوں۔(جے۔برنس،صفحات 49-42)

(4)

امیر دن شروع ہونے سے دو گھنٹے قبل ہی اپنا کام شروع کردیتے ہیں۔اس وقت ہر کوئی الگ الگ معاملات سنتا ہے اور اپنے مخصوص علاقوں سے متعلق امور نمٹا تا ہے۔وہ لوگ صرف اسی موقع پر صافہ پہنتے ہیں۔تقریباً طلوع آفتاب کے وقت وہ لوگ اپنے اپنے حقے تیار کرتے ہیں اور دربار میں آجاتے ہیں۔یہاں پر سارا خاندان باقاعدگی سے جمع ہوتا ہے اور تمام ریاستی امور طے پاتے ہیں۔ گزشتہ دن یا رات کو آنے والے تمام خطوط ان کے سامنے طشت میں پیش کئے جاتے ہیں،اوران کے بارے میں احکامات جاری کرتے ہوئے وقت گزرتا جاتا تھا۔اس کے علاوہ باہمی گفتگو بھی ہوتی ہے جو دس یا گیارہ بجے تک چلتی ہے۔اس کے بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔دو بجے کے قریب وہ لوگ پھر سے آتے ہیں اور رات تک سب اکٹھے بیٹھے رہتے ہیں۔اس وقت وہ لوگ سونے کے لئے الگ الگ چلے جاتے ہیں۔میں نے ہمیشہ کھلے دربار میں دورے کئے تھے اور مجھے ان بڑے سرداروں میں سے کسی ایک سے بھی تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا۔اپنے اپنے گھروں

میں چلے جانے کے بعد ہر سردار اپنا اپنا الگ دربار لگاتا ہے جہاں پر ہر بات بڑے امیروں کے روایتی ریاستی امور سے مختلف نظر آتی ہے۔ یہاں پر تمام پابندیاں ختم کر دی جاتی ہیں اور ہم کشتی، گیندوں کے کھیل، تیغ زنی اور دیگر تماشے دیکھتے ہیں۔

میر فتح علی کی زندگی میں کہ جس نے اس خاندان کو عروج پر پہنچایا تھا۔ تب گروہ بندی کے تمام تر ذرائع یا راستے معدوم کر دیئے گئے تھے۔ چاروں بھائی اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ اس کے صرف دروازے پر روشنی ہوتی تھی اور بڑی تعداد میں زین والے گھوڑوں اور ملازمین کو ہر قسم کی ہنگامی صورت حال سے نبٹنے کے لئے تیار رکھا جاتا تھا۔ تیس برسوں سے چل رہے امن وسکون نے حکمرانوں کے درمیان باہمی اعتماد پیدا کر رکھا ہے۔ مگر اب وہ لوگ پہلے کی طرح نہ تو ایک ساتھ کھاتے ہیں اور نہ ہی ایک ساتھ سوتے ہیں۔ بلکہ وہ سب کے سب اپنے کمروں کے باہر الگ الگ ہالوں میں اپنی رات بسر کرتے ہیں، اور اپنے اپنے ہتھیار ساتھ رکھتے ہیں۔ اس وقت نگرانی پر ان کے اپنے پہرے دار موجود ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے پر اعتبار نہ کرنا ان کے کردار کی خاصیت سی بن گئی ہے۔ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ مراد علی کی بیماری نے ان سب کو کئی ماہ تک حیدر آباد کے قلعہ میں قید کر کے رکھ دیا تھا، اور جب وہ لوگ شکار کے لئے روانہ ہوتے تھے ہر کسی نے اپنے پیچھے اپنے ساتھیوں کی معقول تعداد چھوڑی تھی۔ اس وقت میر صفدر نے چند میل ساتھ چلنے کے بعد راستہ بدل کر اسلام کوٹ روانہ ہو گیا اور وہاں پر بغاوت شروع کر دی تھی۔ اس طرح کے مشکوک حالات میں ان کی متحدہ طاقت بمشکل ہی قابل رشک تھی۔ میں مراد علی کو اس جذبہ سے انصاف کرنے کا اعزاز بخشتا ہوں کہ جب اس نے جذباتی طور پر کسی فارسی مصنف کے بیان کو نقل کرتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ امیروں کے سروں پر بہت بھاری بوجھ ہے اور اس بوجھ کی مصیبت کو امیروں ہی کے علاوہ اور کوئی نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ تو صاف اقبال جرم تھا کہ وہ حکمرانی کے علاوہ ہر چیز کا مالک ہے۔

دربار میں اپنے اطوار میں سارے امیر بڑے نرم مزاج تھے لیکن زیادہ تر وہ بڑے رکھ رکھاؤ سے رہا کرتے تھے۔ ان کے اور ان کے مخلص ملازمین کے درمیان کسی قسم کی مماثلت نہ تھی۔ جب میرے لئے ایک کرسی لائی گئی تھی تو دو نشست گاہیں ایک ساتھ متعارف کرا دی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑے سرداروں میں سے ایک تھی اور دوسری نوجوان شہزادے کی تھی۔ تمام درباری یا ملازمین باعزت

طور پر یا تو بیٹھے ہوئے تھے یا دربار سے باہر کھڑے ہوئے تھے، اور میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ کسی بڑے سے بڑے افسر کو ان کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی گئی ہو، ہاں البتہ میر اسماعیل شاہ اور کچھ دیگر برگزیدہ پیرزادوں یا صوفیوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھ سکیں۔ حیدرآباد میں میری موجودگی کے دوران میر مرادعلی کی بیماری کی وجہ سے تمام درباری اجلاس اسی کے کمرے میں ہوا کرتے تھے، البتہ ان کے ہاں یہ بھی رواج ہے کہ وہ متبادل طور پر ایک دوسرے کی رہائش گاہ میں بھی اجلاس کرلیا کریں۔

میں نے اپنے اول تذکرے میں ان کے ملبوسات اور دربار کی حالت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے تمام تر ملبوسات انگریزی مصنوعات سے تیار کئے گئے ہوتے ہیں۔ ماسوائے کشمیری شالوں اور سوتی و سنہری لنگیوں کے جوٹھٹھہ میں بنتی ہیں۔ جب سردیاں آنے لگتی ہیں تو امیر موٹی موٹی شالیں بیچنا شروع کر دیتے ہیں جن میں سنہری تسمے لگے ہوتے ہیں اور کناروں پر قندھار کے کالے پوستین ہوتے ہیں۔ مختلف مواقع پر مختلف قسم کے ملبوسات بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے دربار میں سب سے زیادہ خوش لباس شخص ان کا چچا میر محمد ہے جو بہت خوبصورت مگر ضغیف شخص ہے۔ (جے۔ برنس، صفحات 93-89)

(5)

28- جنوری کو ہم سندھ کے حکمرانوں سے پہلی بار ملے ہم ایک ایسی تنگ گلی کے ذریعہ شہر میں داخل ہوئے جو بہت بدبودار تھی۔ دو یا تین تنگ سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد ہم نے پل عبور کیا اور تین مضبوط صدر دروازوں سے گزرے جس کے بعد ہمیں تقریباً 200 گز چلنا پڑا۔ پھر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں پر ایک لمبے سے برآمدے کے آگے بہت بڑا قالین پڑا ہوا تھا۔ قالین پر سے گزرنے کے لئے ہم نے اپنے جوتے اُتار دیئے۔ اس کے بعد سندھ کے حکمرانوں سے ہمارا تعارف کرایا گیا وہ لوگ مذکورہ برآمدے کے عین وسط میں قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میر مرادعلی خان سب سے زیادہ بیش قیمتی قالین پر بیٹھا ہوا تھا، اور دوسروں کی نسبت زیادہ آگے کی جانب تھا۔ وہ کم و بیش 60 برس کا لگتا تھا اور کافی ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بیٹے اور رشتہ دار اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کی تلواریں اور ڈھالیں جواہرات سے جڑی ہوئی تھیں۔ میر مرادعلی نے کرنل پوٹنگر سے کچھ دیگر بات چیت کی جس کے بعد کرنل نے عزت مآب گورنر جنرل کا خط پیش کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں نے واپس جانے کی اجازت مانگ لی۔

دربار میں ہر حیثیت کے لوگ تھے۔ وہ لوگ جگہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے اور اپنے ملک کے حکمرانوں کا بالکل لحاظ نہ کر رہے تھے۔ یہ بات ہمیں بہت عجیب سی لگی بلکہ ہم نے کئی بار دیکھا کہ ان امیروں کا اپنے بلوچی ساتھیوں پر بہت کم رعب ودبدبہ ہے۔ (ای۔ڈلہوسٹ۔سفرنامہ، صفحہ 202)

یکم مارچ 1832ء___ آج صبح 10 بجے، میں عالم خان (ایک اعلیٰ مرتبے والے بلوچی) کے ساتھ دربار میں گیا۔ ہمارے ساتھ سید رسول شاہ بھی تھا۔ شہر کی جن گلیوں سے ہم گزرے ان میں لوگ قطاریں لگائے کھڑے ہوئے، ہمیں سلام کر رہے تھے، اور جب ہم گزرتے تو ''بھلے کرے آیا'' اور دیگر استقبالیہ کلمات کہتے تھے۔ وہ جگہ جہاں پر دربار لگتا ہے وہ شہر کے وسط میں ہے اور حیدرآباد کے دربار سے کافی مشابہ ہے۔ یہاں پر بھی برآمدہ موجود ہے۔ اس جگہ کے دروازے اور صدر مقام پر پہنچ کر میں رک گیا۔ پھر دربار کی جانب بڑھا۔ فتح محمد خان غوری (میر رستم کا وزیر) میرے دائیں جانب تھا اور حسو وزیر میرے بائیں جانب تھا۔ یہ دونوں شریف لوگ مجھے حیدرآباد کی نسبت کہیں بڑے مجمع میں سے کھینچ کر لے گئے۔ برآمدے میں پہنچ کر میر رستم نے میرا استقبال کیا اور مجھ سے بیٹھنے کی التجا کی۔

میر کے اردگرد اس کے رشتہ دار تھے۔ یعنی علی مراد اس کے بائیں جانب بیٹھا تھا اور علی اکبر (میر رستم کا دوسرا لڑکا) اس کے دائیں جانب تھا۔ میر مبارک خان کے بھی تین لڑکے تھے اور بہت سے دیگر بھتیجے بھی موجود تھے___ میر رستم کے دور کے رشتے دار بھی موجود تھے۔ میں نے اپنے خطوط میر رستم کو دے دیئے، اور اسے بتایا کہ کرنل پوٹنگر خیر پور کی جانب بڑھنے کے لئے اپنی باتوں کا جواب چاہتا ہے۔ میر رستم نے کہا کہ وہ مجھ سے تنہائی میں پھر سے ملے گا۔ کیونکہ یہ تو میرے استقبال کے لئے عوامی دربار ہے اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ جلد ہی کرنل پوٹنگر کو بھی خوش آمدید کہے گا اس نے مجھ سے انگریزوں سے متعلق کچھ سوالات کئے جن کا میں نے جواب دیا اور کچھ دیر کے بعد دربار ختم ہو گیا میں گھر واپس آ گیا۔ میر رستم کی عمر تقریباً 70 سال ہے۔ وہ بہت توانا اور خوش اطوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے عوام بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ علی مراد خان کی عمر تقریباً پچیس سال ہے اور وہ میر سہراب خان کا سب سے چھوٹا لڑکا ہے (لیکن میر رستم کی سوتیلی ماں کے پیٹ سے ہے)۔ علی مراد کے تھوڑے چیچک کے داغ بھی ہیں اور اس کا قد درمیانہ ہے۔ میر مبارک خان کے تمام لڑکے جوان ہیں اور بہت اچھی شکل و

صورت کے حامل ہیں۔ میر علی مراد، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کے پاس بہت ساری دولت ہے۔ اس کے علاوہ خیر پور کی ریاست کا بڑا علاقہ بھی اس کے پاس ہی ہے۔ اس کے باپ میر سہراب نے اپنی موت سے قبل اس کو اپنا چہیتا اور سب سے چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے اراضی کا بڑا حصہ دے دیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے لئے علی مراد اتنا بے چین تھا کہ ایک بار تو اس کے اور میر مبارک خان کے درمیان تنازعہ شدید صورت اختیار کر گیا اور جنگ ہونے ہی والی تھی کہ خوش قسمتی سے ہمارے وفد کی سندھ میں آمد سے جنگ رک گئی۔ علی محمد برطانویوں کے ساتھ تھا اور اس نے رہائش کے لئے ہمیں اپنی کوٹھیاں دینے کی بھی پیش کش کی تھی۔ لیفٹیننٹ برنس نے اس سارے معاملے میں گفتگو کی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میر علی محمد اور اس شخص کے مابین کیا گفتگو ہوئی کہ جس کا نام میں بھول گیا ہوں مگر جو شاید مسٹر برنس کی یادداشت میں بیان کیا گیا ہو۔ میں نے طے یہ کیا کہ علی مراد کے ساتھ بڑا محتاط برتاؤ کیا جائے اور ساتھ ہی تب تک لوگوں سے اس کی ملاقات ختم کر دی اور اس کا شکار وغیرہ پر جانا بھی روک دیا___ جب تک کہ سفیر وہاں پہنچ نہ گیا۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفر نامہ، صفحات 18-216)

(7)

آج صبح میری میر رستم خان اور اس کے خاندان سے دوسری ملاقات ہوئی___ وہیں تمام لوگ اب بھی موجود تھے جو پچھلی بار تھے۔ البتہ جس جگہ پر میں پہلے ان سے ملا تھا۔ یہ جگہ اس کی نسبت زیادہ سکون بخش تھی۔ میر رستم نے مجھ سے انگلینڈ کے بارے میں متعدد سوالات کئے جن کا میں نے اسے جواب دیا___ پھر اس نے کہا کہ ''کیا تم کبھی ہسپانیہ (Spain) میں رہے ہو؟'' مجھے سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے___ آخر کار مجھے پتہ چل گیا کہ اس کی مراد اسپین سے ہے۔ میں نے کہا ''ہاں۔'' پھر اس نے مجھ سے اس ملک کے لوگوں کے بارے میں کچھ سوالات کئے جن کا میں نے اسے جواب دیا۔ پھر اس نے کہا کہ کرنل پوٹنگر سندھ میں کیوں آنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو اپنے وفد کے مقاصد کے بارے میں بتایا۔ اس پر وہ اپنے رشتے داروں سے مخاطب ہوا اور کہا ''دیکھا تم لوگوں نے۔'' میں نے اس بات سے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کے مابین کوئی اختلاف ہے___ غالباً شکار پور پر ہمارے مجوزہ منصوبے کے بارے میں میر مراد علی خان کے خیال کا ذکر

کیا گیا تھا۔ میر رستم نے مجھ سے کہا کہ تم لوگوں سے فتح محمد خان سے بات چیت کر لی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو وہ جلد ہی یہاں پر ہوگا۔ اب تم گھر جاؤ اور اس کی آمد تک یہیں پر قیام رکھو۔ اس کے بعد دربار ختم ہو گیا اور میں گھر لوٹ آیا۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفر نامہ، صفحات 19-218)

(8)

ہماری آمد کے فوراً بعد، میر مراد علی خان کی جانب سے مبارکباد دینے کے لئے چار وفود ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے سندھ کے دارالحکومت پہنچنے کے ساتھ ہی امیر کے خاندان نے مضبوط ترین دوستی اور احترام کے خیالات کا اظہار کیا۔ میں نے ان سب باتوں کا موزوں جواب دیا۔ شام کو ہمیں حیدرآباد لے جایا گیا اور وہاں پر نواب ولی محمد خان وزیر سندھ کے گھر میں ہمارے خیمے لگائے گئے۔ وہ وزیر تو موجود نہ تھا مگر اس کے بیٹے نے مہمانداری کی۔ ہمیں ہر بیان و توصیف کے امور سے آگاہ کر دیا گیا۔ مہمانوں کی تعظیم کے لئے، چھوٹے بڑے سب ہی ہمارے ساتھ موجود تھے کافی رات گئے تک خان وسید اور نوکر و چوبدار ہمارے لئے پیغامات اور اطلاعات لاتے رہے۔

جلد ہی ہمارے استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس استقبالیے میں سندھی ثقافت کی جھلکیاں لازماً بات تھی۔ باہمی رضامندی سے اگلے روز دوپہر کے لئے پروگرام طے کر لیا گیا۔ ہمارا مہماندار صبح ہوتے ہی آ گیا۔ اس نے درخواست کی کہ ہم اس کے ساتھ محل میں چلیں۔ میں نے انتظامات کے بارے پوچھا تو اس نے عجیب سی زبان میں بہت کچھ بتایا اور وضاحتیں بھی کیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا مالک اتنی جلدی ہم سے بات کیوں کرنا چاہتا ہے حالانکہ وکیل یا ریاست کے نمائندے تو ہفتوں انتظار کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس خان کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کیا جو اس اطلاع یابی کے بعد میرے اندر پیدا ہو گئے کہ اس کا مالک ہمارا بہت جلد استقبال کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ امیر برطانوی حکومت کے کسی بھی نمائندے سے ملاقات کو باعث فخر سمجھتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گیا اور چلا گیا۔ اس نے اپنے اس اصرار یا جلد بازی کے لئے معذرت بھیجی جو دراصل اس کی غلطی تھی۔ ''سندھیوں کے فخر کو بھی ان ہی ہتھیاروں کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ تمام باتیں گفت وشنید میں طے ہوں گئیں، اور ان کا نتیجہ بھی سامنے آتا رہے گا۔ متبادل امور بھی بڑی نرمی اور اچھے طریقے سے طے کر لئے جائیں گے اور تمام ناخوشگوار باتوں کو دفن کر دیا

جائے گا۔''

شام کو ہمیں امیر سندھ کے روبرو اس کا لڑکا نصیر خان لے گیا۔ اس سے قبل اس نے اپنے کمرے میں ہمارا استقبال کیا تھا اور برطانوی حکومت سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تھا۔ وہ سندھ کے ریاستی خفیہ رازوں کے لئے ہمارے بڑے اہم ذرائع میں سے ایک تھا۔ سندھی امیر کمرے کے وسط میں براجمان تھا۔ اس کے ساتھ اس کے مختلف رشتہ دار بھی تھے۔ وہ سب ہماری آمد پر کھڑے ہو گئے اور بڑی ملائمت کا اظہار کیا۔ عزت مآب نے مجھ سے میرا نام لے کر بات کی۔ اس نے کہا کہ تمام عوامی اور نجی امور میں میں اس کا دوست ہوں کیونکہ میرے بھائی (ڈاکٹر برنس) نے اسے ایک خطرناک بیماری سے نجات دلائی تھی۔ اسی وقت اس نے مجھے اپنی نشست پر اس کے ساتھ ہی بیٹھنے کو کہا۔ اس نے التجا کی کہ مجھے تمام مشکلات، خطرات اور مسائل کو بھول جانا چاہئے اور اسے برطانوی حکومت کا اتحادی مان لینا چاہئے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہماری ترقی میں جو رکاوٹ آئی تھی وہ دراصل اس کی سیاسی معاملات سے ناواقفیت کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ چیز دونوں ریاستوں کے مابین فسخ معاہدہ ہے۔ ایسا سب کچھ یوں ہوا کہ دراصل وہ ایک سپاہی ہے، اور اسے ان معاملات کا کم ہی پتہ ہے اور تین لاکھ بلوچیوں پر سردار ہے۔ اسے یہ حکمرانی خدا نے دی ہے۔ البتہ اب ہم لوگ اس دارالحکومت میں آ چکے ہیں۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ ہمارا استقبال کیا جائے گا۔ اس کے اپنے ریاستی کارندے ہمیں اس کی سرحدوں پر لے جائیں گے۔ اس کے آدمی ہمارے جہازوں کو دریائی بہاؤ کے خلاف کھینچیں گے۔ ہاتھی اور پالکیاں ہمارے لئے تیار تھیں بشرطیکہ ہم ان میں جانا قبول کر لیں۔ اس نے ہمیں عزت مآب شہنشاہ برطانیہ کے لئے تحائف بھی دیئے، اور اپنے علاقے کی حدود تک ان کی حفاظت کے لئے اپنے وزیر کے لڑکے کو بھی ہمارے ساتھ کیا۔ میں نے عزت مآب سے کسی بات کی وضاحت جاننے کو مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی بدلے میں اس کو ہماری اعلیٰ افواج کے نشانات عطا کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے ہماری حکومت کے اور خود ہماری جانب بھی اس کی توجہ دہی کے لئے شکریہ ادا کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ دونوں ریاستوں کے مابین یہ دوستی کبھی ختم نہ ہو کہ جس کے نتیجے میں مجھے اس کی ریاست سے گزرنے کی اجازت ملی ہے۔ کیونکہ دریائے سندھ کے راستے اکیلے سفر کرنا غیر محفوظ بات تھی۔ سابقہ پیش آنے والے خطرات اور مشکلات کے بارے میں میں نے اسے یقین دلایا کہ برطانوی حکومت کی نیک بختی ہمیشہ ہمارے

ساتھ موجود رہے گی اور گوکہ انسان سمندری مصائب سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا مگر خدا کے فضل سے وہ تمام ہی دور ہوگئیں۔ میں نے اس سے اُمید ظاہر کی کہ جس طرح سے ابھی ہمارے ساتھ تعاون ہوا ہے۔ اسی طرح سے آئندہ بھی ہوگا۔ گفتگو ختم ہوگئی۔ امیر نے اگلی صبح ہمارے ساتھ ایک اور ملاقات طے کی جس میں مجھے ان سیاسی امور پر اس سے بات کرنی تھی کہ جو برطانوی حکومت نے میرے ذمہ لگائے تھے۔

میں سندھ کے دربار کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا کیونکہ یہ چیزیں لیفٹیننٹ کرنل پوٹنگر کی کتاب میں آ چکی ہیں اور ایک دوسرے سفرنامے میں بھی جو بعد ازاں میرے بھائی نے شائع کیا۔ پھر اس محل یا دربار کی کوئی بات ہمیں متاثر بھی نہ کر سکی علاوہ امیروں کے ملبوسات کے کہ جن میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ایک ایسے گندے سے ہال میں ہوئی کہ جہاں پر قالین بھی نہ تھا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھے تھے کہ جہاں فوجی بڑی تعداد میں موجود تھے اور شور وغل کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ امیر نے گوکہ کئی بار شور کم کرنے کا حکم دیا مگر اس پر کسی نے توجہ نہ دی، اور وہ احکامات غیر مئوثر ہی رہے اور اسی وجہ سے کافی باتیں سنی نہ جا سکیں۔ بہرحال ہمیں بتایا گیا کہ یہ مجمع سندھ کے بڑے گروہ کی نمائندگی کے لئے اکٹھا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے فی الحقیقت ہر جگہ پر قبضہ کیا ہوا تھا، اور ہم چند امراء کی مدد کے بغیر قلعہ سے باہر نکل بھی نہ سکتے تھے۔ یہ امراء ہی ہمارے راہنما تھے۔

میں نے حکومت کے وہ تحائف دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی کہ جو میں امیر کے لئے لایا تھا۔ یہ تحائف مختلف یورپی مصنوعات پر مشتمل تھے ____ ایک بندوق، پستولوں کے غلاف، سنہری گھڑی، دو دوربینیں، ایک گھڑیال، کچھ انگریزی شالیں اور کپڑے، ان کے علاوہ شیشے کے شمع دان اور سرپوش کے دو جوڑے بھی تھے۔ بمبئی میں طبع شدہ کچھ فارسی کتب، ہندوستان اور دنیا کا فارسی حروف میں ایک نقشہ بھی ان تحائف میں شامل تھیں۔ بڑے امیر نے اس سے قبل ہی مجھے دو پیغامات ارسال کئے تھے کہ تمام تر چیزیں اس کے علاوہ اور کسی کو نہ دی جائیں۔ پندرہ لاکھ اسٹرلنگ کی رقم کے اس مالک نے بڑے یکطرفہ انداز میں وہ چیزیں اپنے اہل خانہ میں بانٹ دیں کہ جن کی قیمت چند سو پاؤنڈ سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے وزیر کے ذریعہ خفیہ طور پر مجھ سے یہ طے کیا تھا کہ میں گھڑیال اور شمع دانوں کو دیگر تحائف سے تبدیل کر دوں۔ بلاشبہ یہ چیزیں میں لایا ہی ان دیگر سرداروں کے لئے تھا جو سندھی دربار کا حصہ نہ تھے۔ میں نے وزیر سے کہا کہ تحائف کا عطا کیا جانا دراصل یورپی مصنوعات کی نمائش

ہے اور ہمارے ہاں رواج نہیں ہے کہ ایک شخص کے لئے لائی گئی چیز کسی دوسرے شخص کو دے دی جائے۔ اس انکار پر اس نے دوسرا پیغام بھجوایا اور پھر اسی طرح سے ہوا۔ 1809ء میں اس کے دربار میں جاتے ہوئے ہم لوگوں نے سوچا کہ حیدرآباد کے حکمرانوں کے احساسات اور ان کی روح کتنی چھوٹی اور چھچھوری ہے۔ اس روز سونے کے پراتوں میں کچھ پھلوں اور مٹھائیوں کی تواضع کے ساتھ دن کا اختتام ہوا۔ یہ چیزیں خاندان کے مختلف افراد نے بھیجی تھیں۔

صبح سویرے، ہمیں میر اسمٰعیل شاہ جو وزیروں میں سے ایک تھا اور ہمارا مہماندار بھی تھا، وہ ہمیں ساتھ لے چلا۔ راستے میں وزیر نے مجھے یقین دلایا کہ گھڑیال بدل دینے سے امیر بہت زیادہ خوش ہوگا۔ ہماری دوسری ملاقات میں اور زیادہ باقاعدگی اور نظم وضبط موجود تھا۔ یہ ملاقات زیادہ اطمینان بخش رہی۔ جب امیر کو ہماری حکومت کی خواہشات سے آگاہ کیا گیا تو اس نے فوراً ہی ان خواہشات کو منظور کرلیا۔ بات چیت بڑے دوستانہ انداز میں ہوئی۔ امیر نے میرے بھائی کے بارے میں خاص طور پر پوچھا اور میرے لباس پر بھی کافی توجہ دی۔ وہ میرے پہنے ہوئے ہیٹ (ٹوپی) کی ساخت اور خدوخال پر کافی حیران ہوا۔ اس نے متعدد بار بڑے واضح الفاظ میں گزشتہ روز کی باتوں کو دہرایا اور اپنے خلوص کا یقین دلایا، جو کچھ بھی ہمارے درمیان طے ہوا تھا میں اس پر مطمئن ہوکر واپس چل پڑا۔ کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ لاہور کی جانب ہماری پیش قدمی میں وہ اب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ امیر کے بیٹے میر نصیر خان نے مجھے خوبصورت دمشقی تلوار کا تحفہ دیا۔ جس پر مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا اور سونے سے مزین تھا۔ اس کے باپ نے مجھے پندرہ سو روپے کی تھیلی بھیجی اور ساتھ ہی معذرت کی کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق ثمر ادا نہیں کررہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے التجا کی کہ ان میں سے ایک کی قیمت وصول کرلوں۔ کچھ بھی ہو، جتنے مسائل ہمارے لئے پیدا ہوگئے تھے اس کے بعد ہم اتنے بڑے استقبال کی توقع ہی نہیں کرسکتے تھے جو حیدرآباد میں ہمارا ہوا۔ اگلے روز ہم شہر سے نکلے اور دریائے سندھ کے کنارے اپنی کشتیوں کے پاس خیمہ زن ہوگئے۔ (اے۔ برنس۔III، صفحات 48-41)

(9)

جو کچھ میں بیان کرچکا ہوں اس کے بعد میر رستم خان سے ہماری ہونے والی گفتگو کا اچھی طرح سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ امیر نے سوتی کپڑے کے بنے ہوئے سائبان تلے ہمارا استقبال کیا۔ وہ

سنہری کپڑے کی نشست گاہ پر براجمان تھا۔اس کے اردگرد اس کے خاندان کے افراد تھے جن میں سے چالیس مرد اس کے اپنے باپ کی ہی اولاد تھے اور تا حال زندہ تھے۔حیدر آباد کی نسبت یہاں پر زیادہ رونق تھی۔لیکن شور شرابہ بہت تھا۔ہم نے اس طرح کے مواقع پر پڑھی جانے والی تقریریں پڑھیں۔ میں نے امیر کی جانب سے توجہ دہی اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔میر رستم خان تقریباً پچاس سال کا آدمی ہے۔اس کی داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید ہو چکے ہیں۔وہ اور اس کے رشتے دار ہمارے لباسوں اور چہروں پر نظریں گاڑھے ہوئے تھے۔اس نے ہم سے شام کو ایک دوسری جگہ پر ملاقات کرنے کا کہا کہ جہاں پر یہاں کی نسبت شور شرابہ کم ہو۔میں نے واپس جانے سے قبل اسے اپنی گھڑی دی۔اس کے ساتھ ہی اسے پستولوں کے غلاف اور عکس بین بھی بھیج دیئے۔اس کے ساتھ ہی دیگر یورپی مصنوعات بھی دیں۔اس نے ان چیزوں کو بہت پسند کیا۔ہجوم ہماری جانب بہت متوجہ تھا البتہ نظم وضبط برابر برقرار رکھا ہوا تھا۔وہ زیادہ تر ہماری ٹوپیوں پر توجہ دے رہے تھے۔اس کے محل (اگر میں سندھ میں مٹی سے بنی ہوئی ان عمارتوں کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں حق بجانب ہوں) سے دوسو گز کے فاصلے پر ہم ایک گلی میں پہنچے جہاں پر مسلح فوجی کھڑے ہوئے تھے۔ان کے درمیان تیس یا چالیس افراد اسی گھرانے کے شکاری یا افسران جنگل بھی شامل تھے۔

شام کو ہم نے امیر سے پھر ملاقات کی اور اسے ایرانی قالینوں پر بیٹھے ہوئے پایا۔وہ اب بھی پہلے کی طرح سے اپنے رشتہ داروں میں گھرا ہوا تھا۔اس نے برطانوی حکومت کے لئے اپنی جانب سے عزت واحترام پر لمبی چوڑی تقریر کی۔ساتھ ہی اس نے کہا کہ میں یقیناً اس کے وزیر سے اس کے خیالات کے بارے میں سن چکا ہوں گا۔اس نے حیدر آباد سے آنے والے ہمارے مہماندار کی جانب دیکھا جس نے ہماری ملاقات کو روکنے کے لئے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔اس کے بعد اس نے باتوں کا رُخ بدل دیا۔امیر نے انگلینڈ اور اس ملک کی طاقت کے بارے میں کئی سوالات کئے اور پھر اس نے اشارہ کیا کہ ہم (انگریز) لوگ شروع سے فوجی قوم سے تعلق نہیں رکھتے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ چند سو برس قبل تک ہم (یعنی انگریز) ننگے پھرا کرتے تھے اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے قرآن پڑھ رکھا ہے تو اس نے مجھ سے عربی اور فارسی زبان میں کلمہ پڑھوا کر دیکھا۔اس نے کہا کہ ہماری عظمت دراصل بنی نوع انسان کے بارے میں علم حاصل کرنے سے شروع ہوئی ہے اور اس کی ایک وجہ دوسرے لوگوں کے معاملات پر توجہ دینا بھی ہے۔اس نے میری تلوار دیکھی اور کہا کہ اس سے کچھ خاص

نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ مگر میں نے اسے بتایا کہ ان ہتھیاروں سے لڑنے کا زمانہ گزر گیا ہے۔ امیر نے بہت سی ایسی باتیں کیں کہ جن سے میں نے یہ یقین ہی نہیں کرسکتا تھا کہ ہم (جاہل) بلوچیوں کے دربار میں موجود ہیں۔ اس نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہم لوگ اس کے ساتھ ایک ماہ تک قیام نہیں کرسکتے۔ اس نے کہا کہ اگر ہم آگے بڑھنا چاہیں تو وزیر کا لڑکا ہمارے ساتھ ساتھ سندھ کی سرحد تک جائے گا اور ایک بلوچ سپاہی کی معمولی سی مہمان نوازی کو قبول کرلے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست خیرپور کی سرحد تک وہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس کی مہمان نوازی میں 8 یا 10 بھیڑیں بھی شامل تھیں اس کے علاوہ 150 لوگوں کے لائق روزمرہ کی اشیاء خوردونوش وغیرہ بھی۔ نیز خیرپور میں ہمارے قیام کے دوران وہ روزانہ دو وقت ہمیں 72 مختلف چیزوں پر مشتمل کھانا بھی بھیجتا رہا۔ یہ کھانے بہت عمدہ اور شاندار مقامی اشیاء پر مشتمل ہوتے تھے۔ اپنے پکوان کی وجہ سے کھانا وافر اور لذیذ ہوتا تھا۔ کھانے چاندی کے برتنوں میں دیئے جاتے تھے۔ ہم پر جس طرح سے توجہ دی گئی تھی اس کی وجہ سے خیرپور چھوڑتے ہوئے ہمیں کافی دکھ ہوا۔ ہمارے جانے سے قبل امیر اور اس کے اہل خانہ نے ہمارے لئے دو عدد خنجر اور دو خوبصورت تلواریں بھیجیں جن کے نیام بے تحاشا سونے سے مزین تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی دھار کی مالیت 80 تھی۔ ان کے ساتھ بہت سے مقامی سوتی اور دیگر قسم کے کپڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ہزار روپے کی تھیلی بھی تھی جو کہ میں نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور معذرت کرلی۔ (اے۔ برنس۔ III، صفحات 70-67)

(10)

امیروں نے شروع سے ہی ہمارے نمائندوں سے کہا کہ وہ اپنے جوتے اُتار دیں۔ وہ ایک ایسی تقریب تھی جو یورپی معاشرے میں اپنے ہیٹ یعنی ٹوپیاں اُتارنے کے مترادف ہے۔ جب ہم اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو بڑے امیر صوفوں پر بیٹھ گئے اور ان کے تعلق دار قالین پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

میں ان تقریباً ایک سو بلوچی سرداروں کے بارے میں ذکر نہ کروں گا جنہوں نے گفتگو میں مداخلت شروع کردی اور وہ دونوں چھوٹے امیروں کے مطالبات پیش کررہے تھے۔ میرا کام ترجمہ کرکے سمجھانا تھا۔ میں اس بات کا ثبوت دیتا ہوں کہ احمد خان لغاری کافی اچھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ وہ

بولتا کم تھا اور سنتا زیادہ تھا۔نصیر خان، کہ جسے اب امیر اعلیٰ سمجھا جاتا ہے وہ شہداد خان کی طرف مائل معلوم ہوتا تھا۔ آخر کار نمائندے نے مداخلت کی اور تمام بھائیوں کو اس بات پر راضی کرلیا گیا کہ وہ سب قرآن پر حلف لیتے ہوئے دوستانہ طور پر رہیں گے، اور اپنے اپنے علاقوں سے متعلق جھگڑوں کو ثالثوں کے سپرد کردیا کریں گے۔ مجھے حسین علی کو لانے کے لئے کہا گیا اور ایک دوسرے افسر کو کہا گیا کہ وہ شہداد کو بلائے۔ پھر ان دونوں کو سرعام گلے ملوایا گیا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ مجھے موخرالذکر سردار سے کچھ سروکار نہ تھا کیونکہ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اچھا معلوم نہ ہوتا تھا۔ جبکہ میرا حمایتی شخص ایک خوبصورت نوجوان تھا جس کی آنکھیں کالی تھیں۔حسین علی مجھے اس کے چچا میر صفدر کے گھر پر مل گیا۔جس کا سب سے بڑا لڑکا فتح علی خان میرے ساتھ دربار واپس آ گیا۔ بڑا مجمع لگا ہوا تھا، اور اتنا زیادہ تھا کہ اگر ہم خود چل کر جاتے تو کسی تنگ راستے میں کچل دیئے جاتے۔اس لئے ہمیں اُٹھا کر لے جایا گیا۔

اس کے بعد کام پورا ہو گیا۔ اگلا مرحلہ شکار پور کے الحاق سے متعلق گفتگو کا تھا۔یعنی معاہدے کی رو سے ہماری حکومت کو جس امداد کی ضمانت دی گئی ہے اس سلسلے میں اس شہر کو دے دیا گیا۔تمام امیر اس الحاق کے مخالف تھے خاص طور پر ناصر خان جس نے کہا کہ ''صاحب: کسی بھی سردار کے لئے یہ بڑی بےعزتی کی بات ہے کہ وہ اپنی اراضی دوسرے کے سپرد کردے۔'' اس وقت اس نقطہ کو بغیر کسی فیصلے کے چھوڑ دیا گیا۔(ڈبلیو۔جے۔ایسٹ وک،صفحات 6-204)

(11)

امیروں نے جو استقبالیہ دیا تھا وہ ہمیں دربار کی عظمت یا کسی بھی دیگر طریقے سے متاثر کرنے کے لئے نہیں تھا جیسے درباریوں کی شان وشوکت وغیرہ قلعہ تک جانے کے لئے ایک طویل تنگ اور گندی گلی سے گزرنا پڑا جس میں تماش بینوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں بڑی تعداد میں سدی (Sidis) یا کالے لوگ یعنی حبشی بھی شامل تھے۔سامعین کا دربار یا ہال کافی چھوٹا تھا اور اس میں کوئی نمائش بھی نہ تھی۔امیروں نے اگرچہ اپنے شعور اور سادہ عادات کی بناء پر سجاوٹ کرنے سے پرہیز کیا تھا مگر ان سب ہی کے وہ ذاتی کمرے ضرور مزین تھے کہ جہاں پر ریذیڈنٹ نے ان کے ساتھ گفتگو کی۔ایک موقع پر نصیر خان نے انگریزی جماعت کو اپنی ذاتی رہائش گاہ دکھائی بھی

تھی۔ اس میں بہت سے اچھے کمرے بھی تھے اور ایک کمرہ تو بہت ہی شاندار تھا اور تمام کمروں سے اچھا تھا۔ اس میں خوبصورت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا، اور دیواروں پر ایران کے بادشاہوں کی تصاویر لٹکی ہوئی تھیں۔ تاہم اس موقع پر سادگی اختیار کرنا سخت غلطی شمار کی جاتی ہے۔ ہمارے استقبال میں نہ تو کوئی تقریب کی گئی اور نہ ہی کوئی حکم جاری کیا گیا۔ ہر شخص آتا جاتا تھا اور بات کرنے پر بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ (ای۔ جے۔ ایسٹ وک، صفحات 10-209)

(12)

کسی بھی ملنے والے کی آمد پر وہ اس سے کچھ فاصلے پر قلعہ میں ہی ملاقات کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ چالیس یا پچاس گھوڑوں اور پیادوں پر مشتمل ایک دستہ بھی ہوتا تھا جو پیش خدمت کہلاتا تھا اور پوری طرح سے مسلح ہوتا تھا۔ اس دستے کے سرکردہ افراد امیر کے ذاتی دوست یا مختلف امیروں کے ملازم ہوتے تھے جو اپنے مالک کا نام لے کر آنے والے کو خوش آمدید کہا کرتے تھے۔ کس مرتبہ کے شخص کو استقبال کے لئے مقرر کرنا ہے، یہ تو آنے والے شخص یا ملاقات کے مرتبے پر منحصر تھا۔ اگر کوئی شخص اچانک سے چلا آتا تھا تو گویا کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا تھا، اور سندھی لوگ اس کی جانب لپک پڑتے۔ ان کے بڑے عہدیدار اس ملاقاتی کے گرد چکر لگاتے اور اس کے ہاتھ اُٹھوا لیا کرتے۔ اس کے زین (Saddle) تک کی تلاشی ہوتی تھی گویا اسے برہنہ کر دیا جاتا تھا۔ اس دوران البتہ اس کی صحت کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا۔ ملاقاتی کے اعزاز میں سلامی بھی پیش کی جاتی تھی جو دراصل ابتدائی تقریب ہوتی تھی اور اس میں کافی وقت ضائع ہوتا تھا۔ یہ چیز سندھ میں آسانی سے ختم نہ ہوئی تھی۔ ان مواقع پر تقریباً نصف درجن دفعہ یہی ہوتا تھا۔ سب سے پہلے تو بڑا امیر بات کیا کرتا تھا۔ تمام سامعین اور اس کا دیوان بھی خاموش رہتے تھے۔

ہر امیر کا اپنا دیوان ہوا کرتا تھا اور سب کے الگ الگ ملازم ہوتے تھے۔ ماسوائے سینارٹی (Seniority) کا لحاظ قائم رکھنے کے تقریباً تمام امیروں کے ہاں تقاریب ایک جیسی ہی ہوتی تھیں۔ جب کوئی ایسا مسئلہ ہوتا کہ جس کا تعلق پوری قوم سے ہوتا تو تمام امیر دربار میں ملاقات کر کے اس پر غور کیا کرتے تھے۔ اس وقت ہر کوئی اپنے زیر قبضہ علاقے کی نمائندگی کیا کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر ہر ملاقاتی کو تھالوں میں مٹھائی رکھ کر دی جاتی تھی جو اس کے لئے اور اس کے ملازمین کے لئے ہوتی تھی۔

ان مواقع پر محبت سے بھرا استقبال اور سخت مہمانداری سندھی ثقافت کی خصوصیات تھیں، اس دربار میں ہم نے کوئی ایسی عمدگی نہ دیکھی تو مشرق میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ جنگلی بلوچیوں اور فوجی افسران کے گروہ جو کسی آنکھ کو ہر جانب نظر آتے تھے وہ اتنے اجنبی طریقے سے کھڑے رہا کرتے تھے کہ گویا آنے والا پرانے زمانے کے لوگوں کے درمیان ہے اور یہ سردار کسی فوجی جاگیردارانہ ریاست کا حکمران ہے۔ بلوچیوں کی بدتمیزیاں یا بے ضابطگیاں بعض اوقات ان کے امیر کی موجودگی میں بھی ظاہر ہو جایا کرتی تھیں۔گو کہ یہ لوگ اپنے سرداروں کے ساتھ وفادار تھے مگر ان میں ان کا صحیح طریقے سے احترام کرنے کا سلیقہ نہ تھا، دربار حیدرآباد اس وقت تو اور بھی بدمزگی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا کہ جب کوئی رقاصہ دربار میں ناچتی تھی اور یہ جنگلی لوگ بے قابو ہو جایا کرتے تھے اور ڈھول و تاپ پر مچلنے لگتے تھے۔ یہ رقاصائیں حبشی عورتیں ہوا کرتی تھیں۔(ٹی۔ پوسٹن، صفحات 205-200)

(13)

منشی نے آ کر بتایا کہ امیر مجھ سے آج چھ بجے ملاقات کرنے کے خواہش مند ہیں اس سے ایک گھنٹہ قبل امیر نے چار گھوڑے بھیجے تھے جو بڑے طریقے سے سجائے گئے تھے اور ان کی زین سونے چاندی سے مزین تھی۔ان کا تعلق غالباً دہلی سے تھا۔میں ڈاکٹر لیتھ(Dr. Leith) کے گھوڑے پر سوار ہو گیا جبکہ امیر کے بھیجے ہوئے گھوڑوں پر میرے ساتھی سوار ہو گئے۔اس کے بعد بے قاعدہ فوج کے ایک حفاظتی دستے کی مسافت میں ہم حیدرآباد کی جانب روانہ ہو گئے جو پانچ میل سے زیادہ فاصلے پر تھا۔سورج غروب ہونے والا تھا اور چاند نکلتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں شہر صاف نظر آنے لگا۔

ہم اس خستہ حال قلعہ پر پہنچے جو چھوٹا، چوکور اور مٹی سے بنا ہوا تھا۔اس کی برجیاں نیم دائرے کی شکل میں تھیں اور اس کی فصیل کے درمیان میں تھیں۔اس کے اردگرد آٹھ فٹ چوڑی خندق تھی۔ امیروں کے منشی میر نصیر خان نے ہمارا استقبال کیا۔اس کے علاوہ 16 بڑے سردار بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ بڑے خوبصورت تھے اور اپنے روایتی لباس میں موجود تھے۔ان کے پاس پستول، توڑے دار بندوقیں اور تلواروں نیز ڈھالوں پر مشتمل اسلحہ بھی تھا۔ ان لوگوں نے اپنے دائیں ہاتھوں سے پیشانیوں کو چھوتے ہوئے (یعنی آداب کرتے ہوئے) اپنے مالک کے نام پر مجھے سلام کیا۔انہوں

نے مجھے بتایا کہ انہیں اس بات کی ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ مجھے قلعہ میں لے جائیں۔ وہ سب باری باری میرے پاس آئے اور بڑی نرمی کے ساتھ مجھ سے بات کی۔ پھر حال احوال پوچھا۔ منشی خاص طور پر باتونی تھا اور بار بار اس بات پر اظہار افسوس کرتا تھا کہ مجھے فارسی زبان نہیں آتی۔

حیدرآباد میں تقریباً پینتیس ہزار افراد رہتے ہیں۔ یہ شہر تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس کی سطح بڑی ہموار، پتھریلی اور اونچی ہے۔ اس کے میدان کی بلندی وادی سندھ کو اس جانب سے ختم کر دیتی ہے۔ یہ سندھ کے دیگر تمام شہروں کی طرح مٹی، لکڑی اور اینٹوں سے بنا ہوا ہے۔ یہاں کی گلیاں تنگ اور گندی ہیں اور اس کے بازار بہت پُر ہجوم ہوتے ہیں۔ جس راستے سے ہم گزرے وہاں پر ہمیں دیکھنے کے لئے سینکڑوں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ قلعہ معلیٰ چوکور شکل میں تھا اور اس کے برج گول تھے۔ اس کی مٹی دیواریں چالیس فٹ اونچی تھیں اور اس کے گرد 8 فٹ چوڑی اور پانچ فٹ گہری خندق تھی۔ مگر وہ خشک ہو چکی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہمارا محافظ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ بڑے دروازوں پر لوگوں کا اتنا بڑا مجمع لگا ہوا تھا کہ جب دروازے کھولے گئے تو محافظین اور سرداروں کو راستہ بنانے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں قلعہ کے اندر کا جائزہ لینے کے بارے میں بہت آہستہ سے گھوڑے پر سوار ہوا لیکن مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ یہ بالکل ناممکن ہے کیونکہ سارا قلعہ جھونپڑوں اور چھوٹے چھوٹے گھروں پر مشتمل تھا، اور بڑا بے ترتیب نظر آ رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد ہم لوہے کے ایک جنگلے کے پاس آ کر رُک گئے۔ یہ امیر میر نصیر خان کے محل کا دروازہ تھا۔ یہ محل چوکور اینٹ سے بنی ہوئی عمارت ہے۔ اس کے اندر رنگین ٹائلیں استعمال ہوئی ہیں۔ یہ کافی اونچے چبوترے پر بنایا گیا تھا۔ اس پلیٹ فارم سے دریائے سندھ کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ جو 900 قدم چوڑا ہے اور جنگلوں اور باغات کے پیارے وطن سے بہتا ہوا گزر رہا ہے۔ اس کے ایک جانب کھیت اور دیہات ہیں جبکہ دوسری جانب حیدرآباد کا شہر ہے۔

جب ہم دروازے سے گزر کر پلیٹ فارم پر چڑھ گئے تو میر نصیر خان کی سربراہی میں سارے امیر ہم سے ملنے آئے۔ ان کے ساتھ بہت سے سردار بھی تھے۔ جب مسٹر مائلن (Mr. Mylne) نے مجھے ان سے ملایا تو ان سب نے مجھ سے ہاتھ ملائے اور نصیر خان نے مجھے ایک نشست پر بیٹھ جانے کی دعوت دی، جو اس کے مقابل رکھی گئی تھی۔ امیروں نے اپنے لئے مخصوص ایک لمبے دیوان پر اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں۔ جس کے گرد سارے سردار جمع ہوئے کھڑے تھے یا پھر قالین پر بیٹھے تھے۔ سب

کے پاس یا تو تلوار تھی یا پھر بندوق تھی۔ سب کی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ چاندنی اس منظر کو بڑا دلکش بنا رہی تھی اور ہر چیز بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی۔

میر نصیر خان جو امیروں میں سب سے بڑا تھا اور گیارہ لاکھ کے مالیے کا مختارِ کل تھا وہ اتنا زیادہ موٹا تھا کہ کسی بھی قسم کی جسمانی محنت نہ کر سکتا تھا۔ امیر کو اس کے تمام بلوچی لوگ ملک کا سب سے خوبصورت ترین شخص کہتے تھے۔ میر محمد بھی عمر دار شخص تھا۔ گو کہ وہ بھی پُر وقار لمبی ریش کا حامل تھا مگر کٹے ہوئے ہونٹ کی وجہ سے بدصورت ہو گیا تھا۔ وہ وہی شخص ہے کہ جس نے سر الیگزینڈر برنس (Sir Alexander Burns) سے شیخی ماری تھی کہ اس نے سندھ سے اس کے گزر سکنے کی منظوری دلوا دی ہے۔ نیز وہ انگریزوں کا سب سے بڑا ساتھی ہونے پر فخر کیا کرتے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی شاندار تلوار تھی جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میر شہداد اور میر حسین علی دونوں بھائی ہیں۔ اول الذکر اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے اور بڑے اچھے اطوار کا حامل ہے۔ جب اس نے بڑی احتیاط سے اپنی کالی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اپنی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں اُٹھائیں تو میں بے ساختہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کا سترہ سالہ چھوٹا بھائی بدصورت اور ناقابل اعتماد شخص ہے۔ میر صفدر موجود نہ تھا۔ اس کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھے تعلقات نہ تھے۔ ان لوگوں کے ملبوسات میں سوتی کپڑے، پتلون، لال جوتے، ہار اور انگوٹھیاں شامل تھیں۔

ہم لوگوں نے کچھ منٹوں تک ملاقات کے حوالے سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ امیر نے میرا نام پوچھا۔ میں نے ادب سے انہیں بتایا اور کئی بار دہرایا بھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے میرے ملک اور بادشاہ کے بارے میں دریافت کیا۔ نصیر خان نے اعتراف کیا کہ اس نے اس ملک کے بارے میں پہلے نہ سنا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس نے کہا کہ اسے پوری امید ہے کہ یہ ملک اگر انگلینڈ کے ساتھ اتنے اچھے تعلقات رکھتا ہے تو ضرور بہت طاقتور ملک ہو گا۔ جب میر شہداد نے پوچھا کہ پرشین (یعنی جرمنی کی) فوج کی تعداد کتنی ہو گی تو پورا گروہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اس فوج کی کل تعداد تقریباً پانچ لاکھ مسلح و منظّم افراد پر مشتمل ہے۔

میری درخواست پر امیر نے اپنا اسلحہ منگوایا۔ یہ لمبی بندوقیں تھیں جن پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور قیمتی سونا بھی جڑا ہوا تھا۔ جب میں ان کا معائنہ کر رہا تھا تو میر اسد کے چہیتے بیٹے عباس علی سے میرا تعارف کرایا گیا۔ وہ سولہ سالہ خوبصورت نوجوان تھا۔ جب وہ آیا تو امیر نے اندازہ لگایا کہ وہ

انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہے اور میں اس سے انگریزی میں گفتگو کر سکتا تھا۔ مگر شہزادے نے مجھے کچھ اس غلط ملط بولی میں مخاطب کیا کہ جسے نہ تو میں سمجھ سکا اور نہ ہی مسٹر مائکلین سمجھ پائے۔ جب امیر نے مجھ سے پوچھا کہ میں شہزادے کے تلفظ کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں تو کسی شخص نے میری پریشانی کا اندازہ لگاتے ہوئے میری جانب سے جواب دیتے ہوئے امیر کو یقین دلایا کہ میں شہزادے کے انگریزی زبان سے اس قدر واقف ہونے پر سخت حیران ہوں۔ اس بات سے اس کے والد کو بہت خوشی ہوئی۔ یوں لگتا ہے کہ اس شہزادے کا استاد کوئی صحرائی لیفٹیننٹ افسر ہے جواب امیروں کے توپ خانے کا سپہ سالار ہو گیا ہے۔

تقریباً نصف گھنٹے تک گفتگو کرنے کے بعد ہم نے امیر سے اجازت لی۔ ان سے ہاتھ ملایا اور بغل گیر ہوئے۔ پھر چند قدم کے فاصلے پر موجود صفدر خان کی رہائش گاہ تک جانے کے لئے سواری پر بیٹھ گئے۔ اس کے محل کے صدر دروازے پر ہمیں کیچڑ سے گزرنا پڑا۔ مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کیونکہ یہاں پر تو ہاتھوں تک میں دھول آتی جاتی رہتی ہے۔ امیر نے برآمدے میں ہمارا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ اس کے دولڑکے اور تقریباً بیس سوار تھے۔ میر صفدر کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ وہ بہت خوش اطوار ہے اور اس کے اندر جنگ وجدل کا جذبہ موجود ہے۔ امیروں میں وہ واحد شخص ہے کہ جسے فوجی پیشے سے محبت ہے اور وہ خود کو اس میں مزید ماہر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں پر پھر سے وہی سلام دعا اور دریافت احوال ہوئے۔ البتہ میں امیر سے اس قدر متاثر نہ تھا جس قدر اس کے دونوں لڑکوں کے عمدہ خدوخال سے متاثر تھا۔ اس کا بڑا لڑکا فتح علی بہت جاذب النظر تھا اور ہماری واپسی پر وہ متعدد بار مجھ سے گلے ملا۔

جب ہم واپس ہوئے تو پھر سے ہم سرداروں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم اپنے محافظ کے پاس پہنچے تو میں نے ساتھ دینے پر ان میں سے ہر ایک کا شکریہ ادا کیا، اور ان سے التجا کی کہ امیر کی جانب سے میری توثیق کئے جانے کی حمایت کی جائے۔ جب ہم ڈاکٹر لیتھ (Dr. Leith) کی رہائش گاہ پر پہنچے تو آٹھ بج چکے تھے۔ ہم عشائیہ کرنے بیٹھے ہی تھے کہ امیر میر محمد کا منشی آیا اور میرے لئے اپنے مالک کی جانب سے کھانے کی کئی ڈشیں اور پھل لایا۔ اس کے علاوہ کچھ سادہ کشمیری چادریں اور ٹھٹھہ کا سوتی کپڑا بھی تھا۔ ساتھ ہی اس نے درخواست کی کہ امیر کی نشانی کے طور پر ان چیزوں کو قبول کر لیا جائے۔ چونکہ میں انگریزی افسران کے درمیان ان کے استحقاقات میں

رہتے ہوئے سفر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں تو میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں ان تحائف کو قبول کرنے سے معذرت کرلوں کیونکہ انگریز لوگ ہندوستانی شہزادوں کی جانب سے کوئی تحفہ قبول نہ کرتے تھے۔مسٹر مائلن کا بھی یہی خیال تھااوراس نے یہ بات منشی کو باور کرانے کی بھی کوشش کی مگر منشی مطمئن نہ ہوااوراس نے ساری چیزیں میرے قدموں میں رکھ دیں۔ مجھے بتایا گیا کہ دیگر امیروں کی مہربانی کو نظرانداز کرنے کے لئے ہرایک امیر کی جانب سے اسی طرح کے تحائف آرہے ہیں۔اس پر میں نے جلدی سے ڈاکٹر لیتھ اوران کی بیگم سے اجازت لی اوراپنے اسٹیمر یعنی (Steamboat) کی جانب روانہ ہوگیا جو دریا کے دوسرے کنارے پر لنگرانداز تھا۔(ایل۔اورلچ۔I،صفحات 14-108)

دربار میں ہمارے استقبال سے اگلی صبح امیروں کے لئے ہندوستان سے لائے گئے تحائف چوبداروں کی نگرانی میں ان کے محلات میں بھیج دیئے گئے۔ یہ آئینوں، سونے کی گھڑیوں، کلاکوں، شکار کے طپنچوں، پستولوں، مخمل اور چھینٹ پر مشتمل تھے جو کافی قیمتی تھے۔انہوں نے سب تحائف بخوشی قبول کئے سوائے چھینٹ کے جسے اپنی شان کے خلاف سمجھ کر واپس کرنے کی دھمکی دی۔ وہ اسے زیادہ قیمتی نہ سمجھتے تھے اور دھمکی سے کوئی زیادہ قیمتی چیز ہتھیانا چاہتے تھے لیکن چونکہ ان کا واپس کرنا احترام کے خلاف تھا لہٰذا سفیر نے سرکاری معترض کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ چھینٹیں بھی دیگر تحائف کی طرح اس کی حکومت کی طرف سے دوستی کی علامت اور مختلف انگلستانی مصنوعات کے نمونے تھے نہ کہ تحائف لہٰذا ان کی قیمت امیران سندھ کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی ۔لیکن اگر ایسا تھا تو وہ سارے تحائف واپس لینے پر تیار تھا اور پھر امیران سندھ کو خود ہی گورنر جنرل کے حضور اس عمل کا جواب دینا ہوگا۔ تیر نشانے پر بیٹھا، ان کی لالچ ناکام ہوئی اور حکومت برطانیہ کی ناراضی کے احساس سے امیروں کو سانپ سونگھ گیا اور حسب رواج ہمارے پڑاؤ میں فوراً تحائف بھیجے گئے حکومت عالیہ کے لئے صرف آٹھ گھوڑے آئے اور سفیر کو ایک خوبصورت تلوار اور تینوں بھائیوں کی طرف سے ایک ایک گھوڑا ملا اور ہم باقی لوگوں کو معمولی قیمت کی سندھی مصنوعات ملیں۔

تعارفی باریابی کے چند روز بعد ہمیں دوبارہ شرف باریابی ملا جس میں ساری کارروائی بے حد احتیاط اور با قاعدگی سے ہوئی۔ وہ ہمیں اسی چبوترے پر اسی التفات سے ملے لیکن اس دفعہ محافظوں اور خدمتگاروں کے شور شرابے کی بجائے صرف چند خدمتگار آئے اور وہ بھی کافی فاصلے

پر دیواروں کے پاس خاموش کھڑے رہے۔اس موقع پر تینوں نے خوب کھل کر باتیں کیں۔ میرے خیال میں وہ پہلی ملاقات میں جان کی امان کے خطرے پر اب قابو پا چکے تھے اور نہ صرف ہماری تلواروں سے گھبرائے نہیں بلکہ بار بار انہیں بے نیام کرواتے رہے تاکہ ان کی دھات اور صناعی کا معیار دیکھ سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں اور خنجر دکھائے جو بہترین فولاد کے تھے اور جنہیں خریدنے کے لئے بقول ان کے وہ ہر سال اپنے مختار کار ایران اور ایشیائے کوچک بھیجتے تھے کہ وہ قیمت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بہترین قسم کی چیزیں خریدیں۔ ان کی گفتگو سے جلد ہی ثابت ہو گیا کہ صرف تلواروں اور دیگر اسلحہ جات کا جنون ہی ان کو دولت اکٹھی کرنے پر مجبور کرتا تھا اور اس میں تو وہ تینوں ایک دوسرے کے مقابلے پر قیمتی سے قیمتی اشیاء خریدنے پر فخر کرتے تھے۔ اس جنون کے کچھ مخصوص فوائد بھی ہیں کیونکہ جب امراء وزراء اپنے حکمرانوں کا ذوق سبقت دیکھتے ہیں تو وہ بھی انہی کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ جذبہ آبادی کے نچلے طبقوں میں بھی سرایت کر گیا ہے اسی لئے حیدر آباد بے شمار اسلحہ سازوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور اسی لئے ان کی کاریگری اتنی عمدہ و افضل ہے۔

اس دربار میں امیر پہلے سے بھی زیادہ شاندار طریقے سے ملبوس تھے۔ گو کوئی خاص قابل ذکر بات نہ تھی۔ بڑا بھائی اپنے گلے میں خوبصورت موتیوں کے لمبے لمبے ہار پہنے ہوئے تھا اور ایک ہار بطور تسبیح اپنے ہاتھ میں بھی لئے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے پہلے اتنی بڑی تسبیح کا کبھی یقین نہ کیا ہوتا۔ چھوٹوں میں سے ایک کے کمر بند میں ایک خنجر تھا جس کے دستے سے ایک زمرد لگا تھا جو کبوتر کے انڈے سے کافی بڑا تھا۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

خطابات

(1)

سندھ کے شہزادوں میں سے ہر ایک کے الگ الگ خطابات تھے۔ مثلاً میر نصیر خان کو ''سرکار فیض آثار'' ___ یعنی ''فائدہ پہنچانے والا مالک'' کہا جاتا تھا۔ دوران گفتگو انہیں ''میر صاحب'' یا ''میر سائیں'' کہا جاتا تھا۔ جب ان کی بیگمات کا ذکر ہوتا تھا تو دیریہہ کلاں کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی اور کنیزوں کے لئے دیریہہ خورد کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ (آر۔ برٹن۔ نسلیں، صفحہ 166)

شاہی خاندان

(1)

میر سلطان علی جو ''محمد خان کا ٹنڈہ'' (ٹنڈو محمد خان) میں رہتا ہے وہ ان امیروں کا قریبی رشتہ دار ہے۔اس کے قبضے میں کچھ خوشحال اور کثیر آبادی والے اضلاع ہیں۔مگر چونکہ اس سردار کے پاس کوئی فوجی دستہ نہیں ہے اس لئے یہ زیادہ اہم سیاسی شخصیت خیال نہیں کیا جاتا اس کی شادی میر ٹھارا کی ایک بہن سے ہوئی ہے، اور وہ میر غلام علی سے بہت بددل ہے کیونکہ وہ اپنے اور اس کے قابض علاقوں پر دخل اندازی کرتا ہے۔افغان تاجر جو گھوڑوں، قالینوں اور تلواروں کی تجارت کرتے ہیں وہ سب میر سلطان علی کے زیر تحفظ محمد خان کے ٹنڈہ میں رہتے ہیں۔

میر بھاگہ کی حیثیت بھی بالکل میر سلطان علی کی سی ہے اور اس کی امیروں سے رشتہ داری بھی اس کے مساوی درجے کی ہی ہے۔اس کے قبضے میں جو ضلع ہے وہ حیدرآباد کے شمال میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

میر بہجور (Meer Bihjur) جو موجودہ امیروں کا چچا اور میر فتح علی کا جد امجد تھا، اس کا ایک لڑکا میر غلام حسین، حیدرآباد کے پاس رہتا ہے۔

میر فتح علی کا لڑکا میر صفدر اس وقت بچہ ہے اور اسے معمولی سا وظیفہ ملتا ہے (جو یقیناً اس کے معیار کے مطابق نہیں ہے) یہ وظیفہ اسے میر غلام علی سے ملتا ہے جس کے ساتھ یہ بچہ رہتا ہے۔(ایس۔ایلس، صفحہ 10)

امراء

(1)

وہ سردار کہ جو سندھی وزارت میں بڑے اثر ورسوخ کے مالک ہیں وہ وزیر اعظم اسمٰعیل کوہ تن، مخدوم علی اور ولی محمد خان ہیں۔موخرالذکر دو شخص صوبوں کے عمومی انتظام اور مالیہ کی وصولی کے کام سرانجام دیتے ہیں۔

اسمٰعیل کوہ تن بہادر سپاہی تصور کیا جاتا ہے۔اس کی عزت وتوقیر میں تالپور خاندان کی حکمران

شاخ کی نسبت کبھی کمی نہیں آئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے امیروں کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔ مخدوم علی نے دربار سندھ میں ہونے والی تازہ ترین بات چیت میں بالکل حصہ نہ لیا۔ اسے ولی محمد خان کا بدترین دشمن خیال کیا جاتا ہے۔

کردار اور صلاحیت کے حوالے سے پوری مملکت سندھ میں ولی محمد خان لغاری جیسا کوئی اور نہیں ہے۔ اس نے کئی مواقع پر خود کو قابل اور کامیاب مقرر ثابت کیا ہے۔ وہ ایک ماہر معیشت دان ہونے کے علاوہ اپنے آقاؤں کا وفادار اور بہادر خادم بھی ہے۔ وہ بہت مخلص ہونے کے علاوہ بددیانتی اور غلط بیانی سے دور ہے۔ اس کے کئی دوست واحباب کافی طاقتور ہیں۔

ولی محمد کو اب میر غلام کا اعتماد حاصل نہ رہا ہے حالانکہ وہ اسی کے عہد میں ملازمت پر رکھا گیا تھا۔ البتہ میر مراد علی نے ولی محمد کو کئی بار دوستی اور اپنی جانب سے تحفظ کی فراہمی کی پیش کش کی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی یہ نیت ہی میر غلام علی اور ولی محمد کے درمیان تنازعے کا سبب بنی۔

ولی محمد خان ایک طاقتور بلوچی قبیلے ''لغاری'' کا سردار ہے اور اپنی انفرادی صلاحیتوں اور کثیر خاندانی روابط کی وجہ سے بہت خطرناک ہوگیا ہے۔

اخوند محمد بوکا (Buka) جو بمبئی میں سندھ کی جانب سے مقرر کیا گیا سابقہ نمائندہ تھا وہ میر غلام علی کا ملازم تھا اور اب اس سے ناراض ہے اس امیر نے چند برس قبل اس کی پوری جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا جو تقریباً ایک لاکھ کی مالیت کی تھی اور اس کے بدلے میں اسے 400 روپے فی موسم کے حساب سے وظیفہ جاری کر دیا تھا۔ اخوند کئی ڈپلومیٹک وفود میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ خوش اخلاق اور بزدل کردار کا مالک تھا۔ انگریزوں کے ساتھ اس کی وابستگی اور موجودہ سندھی حکومت سے نفرت شاید کبھی بھی عملی شکل میں سامنے نہ آسکے۔ (ایچ۔ ایلس، صفحات 13-12)

(2)

ریاست حیدرآباد کے بڑے سرداروں کی تعداد کبھی بھی اٹھارہ یا بیس سے تجاوز نہیں کرتی اور جو مالیہ وہ مختلف جاگیروں سے حاصل کرتے ہیں وہ ان کی خدمات کے عوض انہیں کو دے دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ریاستی امور کو نمٹانے کے لئے معقول تعداد میں ملازمین بھی رکھتے ہیں۔ اس مالیہ کی مقدار سالانہ ایک لاکھ روپیہ کے چوتھائی یا تہائی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ان تمام سرداروں میں سب سے زیادہ

سرمایہ داراور غالباً سب سے زیادہ طاقتور بھی مرحوم نواب ولی محمد خان لغاری تھااوراس کے بڑے لڑکے احمد خان لغاری نے اس کے پورے مالیہ پر موروثی شکل میں قبضہ کرلیا جس کی کل شش ماہی مقدار چالیس ہزار روپیہ تھی۔ احمد خان سندھ کے سب سے زیادہ بہادر اور باصلاحیت لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ نیز فوج میں اس درجہ سب سے پہلے یا دوسرے عہدے پر تصور کیا جاتا ہے۔ بہادر خان کا کڑ (جس نے نواب کا عہدہ حاصل کرلیا ہےاورنواب ولی محمد کی وفات کے بعد سے لاڑکانہ اور سرحدی علاقے بھی اس کے انتظام میں آ گئے ہیں)، خیر محمد خان، اسمٰعیل کھٹانی، محمد خان لغاری، غلام اللہ لغاری، محمد خان طاہر وغیرہ، بالترتیب مختلف عہدوں پر ہیں اور سب کا اپنا اپنا اثر ورسوخ ہے۔ ان سرداروں کو اپنی اپنی جاگیروں پر پورا پورا اختیار رہے یہاں تک کہ زندگی اور موت کا بھی۔ مگر میں نے کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا کہ جس میں موت کی سزا دی گئی ہو ماسوائے اس کے کہ جب عورت کی عصمت دری کے واقعات ہوں اور اس میں بھی کافی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک واقعہ مسٹر الفنسٹن (Mr. Elphinstone) نے اپنی کتاب ''تاریخ کابل'' (History of Cabool) میں بھی تحریر کیا ہے۔

سید اسمٰعیل شاہ اور اس کے بیٹے، خوشی رام منشی اور دیگر لوگ کہ جن کا تذکرہ برطانوی عہدیداروں نے بھی کیا ہے، وہ سب قابل اعتماد اور کارآمد ملازمین ہیں۔ لیکن ملک میں نہ تو ان کی کوئی وقعت ہے نہ ہی کوئی اثر ورسوخ ہیں۔ سید ذوالفقار شاہ کہ جس نے وفد کے ساتھ ساری گفتگو چلائی تھی وہ مراد علی خان کا بہت قابل اعتبار شخص ہے۔ سید کی ماہانہ تنخواہ دو مدروپیہ تھی جو بڑی بے قاعدگی سے ملتی تھی۔ اس سے سندھ میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے عمومی پیمانے کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحہ 15)

(3)

تمام مشرقی ممالک کی طرح سے سندھ میں بھی درباری ہمیشہ شہزادے کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں۔ نیز امیروں پر انحصار ہونے کی وجہ سے ہی سماج میں ان کے درجے متعین ہوتے ہیں اور ان کی حالت اچھی بنتی ہے۔ وہ اپنے گھروں کو جاتے ہوئے اپنے ساتھ صاف ستھرے لباس اور شعبے کا وقار نہیں لے جاسکتے جو ان کے ساتھ صرف دربار کی حد تک وابستہ ہوتا ہے، اور

چونکہ وہ بہت غریب ہوتے ہیں (کیونکہ تمام تر دولت حکمرانوں کے ہاتھ میں رہتی ہے) اس لئے وہ نمودونمائش بھی کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ امیروں کے چہیتے درباری اپنی طلائی تلواروں سے شناخت کئے جا سکتے ہیں جو حیدرآباد کے دربار میں سب سے اعلیٰ اعزازی امتیازات تصور کی جاتی ہیں۔ یہ بات دربار کی روایت کے خلاف ہے کہ اپنے ہتھیاروں کو امیروں کی جانب سے عطا کئے بغیر ہی کسی قیمتی دھات کے ساتھ ملا کر پہنا جائے۔ ان اعزازات کی وجہ سے عزت میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات میر بہت اعلیٰ خدمات کے عوض اور وہ بھی کبھی کبھار کسی کو اپنی قیمتی ہیروں سے مزین تلوار بھی عطا کر دیتے ہیں۔

جہاں پر سب لوگ امیروں پر اتنا انحصار کرتے ہوں وہاں پر جذبات کے اظہار کی آزادی کی توقع کرنا ہی بے کار ہے۔ سندھ کے درباری اپنے عہدوں پر ہمیشہ اپنی تابعداری کی وجہ سے قائم رہتے ہیں۔ نیز انہیں اپنے سے برتر لوگوں کی زیادتی بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اجنبی خوشامدی لوگوں سے ان کی رغبت (بلکہ ان کی باہمی رغبت بھی) کسی بھی یورپی شخص کے لئے مضحکہ خیز ہے۔ شاید ہی دو اعلیٰ رتبے کے درباری مجھے ایک ساتھ ملے ہوں۔ ان دونوں نے بھی بڑی خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا اور مجھے آسمان پر اُٹھا دیا۔ فی الحقیقت تقریب میں ہونے والی ان کی باتیں بہت رنجیدہ ہوتی ہیں۔ جب ملاقات ہو تو صحت اور مزاج کے بارے میں چار پانچ دفعہ سے کم شاید ہی کبھی دریافت کیا گیا ہو۔ جب بھی میں کرسی سے اُٹھا تو جس شخص سے میں محو گفتگو ہوتا یا جس کے ساتھ ہوتا تھا وہ شخص بھی کرسی سے اُٹھ جاتا تھا اور تب تک کھڑا رہتا تھا جب تک کہ میں دوبارہ نہ بیٹھ جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں وہ لوگ کابل اور فارس کے درباروں کی پیروی کرتے ہیں۔ (جے۔ برنس، صفحات 6-104)

(4)

جو کچھ میں نے میر مراد علی کے کردار کے بارے میں بتایا ہے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا امیر ہے جو دوسروں کے مشوروں کی پرواہ نہیں کرتا۔ نہ ہی اس جیسے سرد مزاج اور غیر سماجی شخصیت کے حامل شخص کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ فی الحقیقت اس شخص پر اعتبار کر لے جو اس کی حمایت کرتا ہو۔ کسی کو بھی اس کے دل کی بات کا پتہ نہیں، اور شاید ہی کوئی شخص اس کا بااعتماد ساتھی ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔ البتہ دو شخص ایسے ہیں کہ جو مختلف وجوہات کی بناء پر دربار سندھ میں بڑے اثر و رسوخ

کے حامل ہیں اور جن کا اس سفرنامے میں خصوصی ذکر کرنا ضروری ہے۔ میں ولی محمد خان اور سید اسمٰعیل شاہ کی بات کر رہا ہوں جو امیر کے وزرائے اعلیٰ ہیں۔ میں ان کے کرداروں کا بھی تھوڑا سا بیان کرنا چاہوں گا۔ ان دونوں کو حکومت کی جانب سے بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ ان کے پاس پالکیاں اور سارتھی (جو پالکی اُٹھاتے ہیں) بھی ہیں۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس سے وہ دونوں پورے ملک میں بلاشرکت غیرے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

نواب ولی محمد خان لغاری کو خود امیروں نے سندھ کے وزیر کا خطاب دیا ہے۔ تالپور خاندان کے بڑے اراکین کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے۔ وہ ان کی حکومت کی سب سے اہم شخصیت ہے۔ ایک ایسے طاقتور بلوچی قبیلے کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے کہ جس نے موجودہ حکمرانوں کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے، وہ برابر ان کا وفادار اور اچھا ملازم رہا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے مالکوں کا اعتماد حاصل کیا ہوا ہے بلکہ اس طرح کی استبدادی حکومت میں وہ عوامی عزت و وقار کا بھی حامل ہے۔ وہ ریاست کے اندرونی معاملات کے انتظام میں امیروں کا مشیر ہے۔

اپنے مالکان کے مفاد کی جانب مخلص ہونے کی وجہ سے اس ضعیف اور قابل احترام شخص کو برطانوی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی اہمیت معلوم ہے۔ اسی کے مشورے پر میں نے نہ صرف سندھ کا دورہ کیا بلکہ امیروں کی خواہش پر مجھے روکا بھی گیا۔ ولی محمد خان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اسی لئے اس بات کا ڈر بھی ہے کہ اس کی موت امیروں کو اپنے بہترین خادم اور سندھی عوام کو اپنے مہربان ترین محافظ سے محروم کر دے گی۔ اس کا بیٹا احمد خان تقریباً تیس سال کا ہے۔ اس میں اپنے باپ کی کوئی خوبی موجود نہیں۔ نواب اچھا شاعر ثابت نہ ہو سکا ہے۔ گو کہ اس کے اشعار میں پختگی ہے مگر اسے کسی فارسی مصنف کی پیروی کرنے والا کہہ دینا بھی اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس نے طب کے موضوع پر بھی کافی رسائل تحریر کئے ہیں جن میں سے اکثر قدیم نظریات پر مبنی ہیں لیکن جن کو اس کی اصلی تصانیف خیال کر کے اسے سندھ میں کسی حکیم کے کردار کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس کے کاموں میں سے میں ایک چھوٹی سی کتاب کا تذکرہ کئے بغیر میں ہرگز نہیں رہ سکتا جو بیماریوں سے متعلق ہے اور اسے میر مراد علی سے منسوب کیا گیا ہے۔

جس طرح سے نواب ولی محمد خان داخلی امور میں مشیر ہے اسی طرح سے میر اسمٰعیل شاہ خارجہ معاملات میں حکومت کا مشیر ہے۔ امیروں کے بعد جب مقتدر شخصیات کا شمار کیا جائے تو وہ مذکورہ ولی

محمد خان کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ نبی کریمؐ کی نسل سے ہونے کی وجہ سے مذہبی طور پر بھی اس کے فیصلے اور تجربے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے ایرانی شخص کا بیٹا ہے جو چالیس برس قبل ہجرت کر کے سندھ میں آ گیا۔ جہاں پر وہ آخری کلہوڑہ حکمران کا سرکاری طبیب بن گیا۔ بعدازاں تالپوروں کی حمایت کی وجہ سے ان کی ملازمت میں آ گیا۔ 1820ء میں بمبئی کی سفارت پر متعین ہونے کی وجہ سے اسے کافی شہرت ملی ہے کیونکہ پوری توقع تھی کہ دونوں حکومتوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے گی۔ اس وقت اسے جس مہمانداری کا تجربہ ہوا نیز مسٹر الفنسٹن کی فیاضی کی وجہ سے بھی میرے ساتھ اس کی بات چیت کے بڑے موضوعات طے ہو پائے۔ لیکن یہ بات بھی مشہور ہے کہ وہ بہت ناقابل اعتبار شخص ہے اور برطانوی مفادات کی بالکل حمایت نہیں کرتا۔ میر اسمٰعیل باوقار شخصیت کا حامل ہے اور اچھی گفتگو کر لیتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔ سندھ کی عوامی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہے، اور فارسی زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں بات بھی نہیں کر سکتا۔ ایک بار وہ دربار کابل میں بھی رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہاں پر وہ مسٹر الفنسٹن کے وفد کے زمانے میں نمائندہ بن کر گیا تھا۔ اس کے کئی لڑکے ہیں جو حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ ان میں سے ایک بعدازاں بمبئی میں وکیل بن کر بھی آیا تھا، اور ایک اور لڑکا شکارپور میں امیروں کا نمائندہ ہے۔ طبیب کی حیثیت سے اس کی ماہانہ تنخواہ گیارہ سو روپے ہے جو کہ حیدرآباد میں سب سے بہترین تنخواہ خیال کی جاتی ہے۔ لیکن امیر اس کے تجویز کئے ہوئے نسخوں پر کم ہی توجہ دیتے ہیں۔

دربار سندھ کے ان دونوں اعلیٰ عہدیداروں کے درمیان رقابت فطری بات ہے، اور یہ رقابت اپنے مالک کی خوشامد کر کے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے تک ہی محدود نہ ہے بلکہ یہ تو ان خاص امور تک بھی پھیل گئی ہے کہ جس سے یورپی سیاست دانوں کے لبوں پر تبسم آ جاتا ہے۔ صاحب علم ہونے کی وجہ سے، خصوصاً طبیب ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کی شہرت سے حسد کرتے ہیں۔ وہ دونوں مصنف بھی ہیں اور اپنی اپنی ایجادات پر گھمنڈی بھی ہیں۔ میں ان دونوں کی ان خصوصیات پر کوئی فیصلہ دیئے بغیر ہی کہ جو میں بیان کر چکا ہوں، یہ مشاہدہ کر سکتا ہوں کہ امیروں نے اسمٰعیل شاہ کو تنخواہ دے کر اور نواب کو شہرت دے کے دونوں کے درمیان بالکل صحیح امتیازی کردار دکھایا ہے۔ ان دونوں کی اخلاقی خصوصیات کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ولی محمد پر امیر بے دھڑک اعتماد کر سکتے ہیں لیکن وہ اس کے مخالف (یعنی اسمٰعیل شاہ) پر شک کرنے میں بالکل انصاف پر ہوں گے۔ اول الذکر نیک اور

خداترس ہے جبکہ موخرالذکر مغرور اور کنجوس ہے۔ ایک سمجھدار ہے دوسرا بزدل ہے۔ سید کی اہمیت زیادہ تر اپنے اعلیٰ نسل ہونے اور مشہور عام تعصب کرنے پر ہے، اور خان کی اہمیت اس کی وفاداری اور نیک نیتی پر مبنی طویل زندگی کی وجہ سے ہے۔

ان افسران کے بعد چند اور درباری ایسے ہیں جن کا ذاتی اثر ورسوخ ہے، اور اس کی وجہ ان کی بلوچی قبائل کی سرداری ہے یا پھر امیروں کی راز داری ہے۔ اس گروہ میں سب سے پہلا قابل ذکر شخص مرزا خسرو ہے جو جارجیا کا غلام ہے۔ اسے اٹھارہ سال قبل کرم علی نے خریدا تھا۔ اب کرم علی اس کے ساتھ اپنے متبنّی بیٹے کا سا سلوک کرتا ہے۔ مراد علی اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہے۔ حالانکہ 1823ء میں اسے بمبئی میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ وہ بڑے ہی الگ کردار کا حامل ہے اور سندھ میں فارسی شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے۔ اس خاصیت کی وجہ سے اس نے کرم علی کے قریب جگہ حاصل کر لی ہے۔ کیونکہ وہ بھی شاعری کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ ایک روز میں نے امیر سے درخواست کی کہ ایک تلوار پر وہ اپنا کوئی شعر کندہ کر دے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے فوراً مرزا خسرو کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کچھ سرگوشی کے بعد ایک شعر کو اپنا کہہ کر بیان کر دیا۔

مرزا باقر بھی جارجیا کا نوجوان ہے، اس پر مراد علی کافی مہربان نظر آتا ہے۔ بہادر خان کا کڑا اور خیر محمد تورا (Tora) دو ایسے شخص ہیں جو اس امیر سے رتبے میں زیادہ اوپر نظر آتے ہیں۔ امیر نے مجھے بتایا کہ ان میں سے اول الذکر اسے بہادر ترین اور نمایاں ترین ساتھیوں میں سے ہے۔ وہ دونوں ہی طاقتور بلوچی قبائل کے سردار ہیں۔ ہمیشہ دربار میں رہتے ہیں۔ یہاں پر وہ ذمہ داری اور تنخواہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خیر محمد، مراد علی کے ذاتی معاملات کا نگران یا مختار کار بھی ہے۔

نواب کے بھائی غلام علی لغاری کے پاس محمد کوٹ کے اہم قلعہ کی عملداری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں پر امیروں کا خزانہ محفوظ ہے جو کروڑوں روپے کی مالیت کا ہے۔ فتح علی نے اس کی اطلاع ملتے ہی کلہوڑوں کے اس بیش بہاء سرمایہ پر فوراً قبضہ کر لیا تھا۔ پھر چونکہ اس میں اضافے بھی ہوتے رہے ہیں اس لئے اب تو یہ بہت زیادہ ہو گیا ہو گا۔ سرمایہ کا تحفظ ہی جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں، ان کا سب سے بڑا تحفظ ہے۔ لیکن اس بات کا قوی امکان ہے تاریخ کے دیگر واقعات کی طرح کسی واقعہ میں یہ خزانہ بھی ختم ہو جائے گا اور ان کا یہ ان کے خاندان کا کوئی مہم جو دشمن اسے لے اُڑے گا۔ ہیوم (Hume) کہتا ہے کہ ''ایک ایسا واقعہ جو فطرتاً تمام خزانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

منشی خوشی رام ایک ہندو ہے جسے چیف سیکرٹری کے طور پر سو روپیہ ماہانہ ملتے ہیں۔اس کا کوئی اثر ورسوخ نہیں ہے۔البتہ تمام خطوط وہی تحریر کرتا ہے،اوران خطوط کے طرز تحریر کو جزواًاس کی جانب منسوب بھی کیا جاسکتا ہے۔کیونکہ میں نے اس بات کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا ہے کہ جب کبھی یہ منشی غائب ہوتا تھا اس وقت مجھے امیروں کی جانب سے جو پیغامات بھیجے جاتے تھے وہ ان الفاظ کی نسبت زیادہ نرم الفاظ میں ہوتے تھے جو وہ اس منشی کو املاء کرایا کرتا تھا۔(جے۔برنس،صفحات 13-106)

(5)

میرا میر اسمٰعیل شاہ سے تعارف کرایا گیا جو شیعہ سید ہے اور شیراز کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ حیدر آباد میں رہتا ہے۔چونکہ مراد علی اور اس کے لڑکوں کو اس پر پورا بھروسہ تھا لہٰذا اسے کئی بار اہم سفارتوں پر روانہ کیا گیا۔ایک بار خراسان میں اسے وزیر فتح خان کا نائب بھی مقرر کیا گیا تھا۔نیز بمبئی کی سفارت پر بھی آ چکا تھا۔اس کی قابلیت کا بہت چرچا تھا۔اس کی تیز فہمی کے ثبوت کے طور پر میرے ایک ملنے والے نے مجھے اس کا وہ واقعہ بتلایا کہ جس میں اس نے ٹھٹھہ شہر میں مسٹر ہینکی اسمتھ (Mr. Hankey Smith) کی زیر قیادت آنے والے برطانوی وفد کی توہین کی تھی۔میر اسمٰعیل شاہ بمبئی میں سفیر بن کر آیا تھا اور وہاں اسے پانچ ہزار روپے ماہانہ کے علاوہ ایک خوبصورت گھر اور سواری بھی دی گئی تھی۔جب اس کا کام ختم ہو جاتا تو اس کی بڑی عزت وتوقیر کی جاتی۔مگر اس نے کئی بار چاہا کہ برطانوی افسران اسے واپس بھیج دیں۔(سی۔میسن۔I،صفحات 5-264)

(6)

مجھے یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ بھکر پہنچنے سے قبل ہماری ملاقات نواب ولی محمد خان لغاری سے ہوئی جو سندھ کے وزراء میں شامل تھا۔اس نے ہم سے ملاقات کرنے کی غرض سے شکار پور سے یہاں تک کا سفر طے کیا تھا۔اس کی عمر تقریباً بہتر (72) سال تھی اور وہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔اس نے ہمارے ساتھ بڑی محبت کا سلوک کیا اور اپنی توجہ سے ہمارے دل جیت لئے۔اس نے مجھے ایک گھوڑا اور عمدہ لنگی دی۔اس نے ہمیں واضح الفاظ میں سمجھایا کہ امیر کو کسی نے یہ غلط مشورہ دیا ہے کہ جب تک ہم لوگ سندھ میں ہیں ہمیں قید رکھا جائے۔مگر اس نے ایک فوری خط تحریر کر کے امیر کو ایسا قدم اُٹھانے سے باز

رکھا۔تب ہمیں کسی بلوچی سردار کو اس کی اپنی سرزمین پر دیکھنے کا موقع ملا۔اس کے ساتھ خیموں، قالینوں اور تین پالکیوں کے علاوہ 400 افراد بھی تھے۔اس کے ساتھیوں میں کچھ رقاصائیں بھی شامل تھیں۔ شام کے وقت ہمارے انکار کے باوجود ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم ان رقاصاؤں کے گیت سنیں۔ہمیں دو گھنٹے تک ایسا ہی کرنا پڑا۔اس محفل کے وقفے کے دوران رقاصاؤں نے اپنے گلے صاف کرنے کی غرض سے تیز تیز شرابیں پئیں۔اس کی وجہ سے ان پر نشہ بھی طاری ہو گیا۔اس مجلس میں کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ ہونا ناممکن تھا کیونکہ ہماری خوشی کی خاطر ان کے گلے بھی بیٹھ گئے تھے۔ہمارے ساتھ جو 150 لوگ تھے وہ سب کے سب نواب کی ضیافت سے محظوظ ہوئے اور اس نے دو روز تک ہمیں اپنے پاس روکے رکھا۔(اے۔برنس۔III،صفحات 66-65)

(7)

صبح کو ہم علی پور نامی چھوٹے سے دیہات پر پہنچے۔وہاں پر میر خان کے وزیر نے ہمارا استقبال کیا جو خیر پور سے یہاں تک صرف ہمارے استقبال کی غرض سے آیا تھا۔اس کا نام فتح علی خان غوری تھا۔وہ بوڑھا شخص تھا اور درمیانے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔اس کے بال سرخ اور داڑھی سفید تھی۔ہمارا شاندار استقبال کیا گیا۔اس نے ہمیں باور کرایا کہ اس کا آقا ہماری آمد کی اطلاع ملتے ہی بہت مطمئن ہوا ہے کیونکہ اسے عرصہ دراز سے برطانوی حکومت سے رابطہ بڑھانے کی خواہش تھی، اور تاحال اسے کسی برطانوی نمائندے سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔اس نے کہا میر رستم خان خود کو اتنی طاقتور اور عظیم قوم کے ہم پلہ نہیں سمجھتا مگر وہ یہ ضرور خیال کرتا ہے کہ اسے اس قوم کے خیر خواہوں میں شامل کر لیا جائے گا۔کیونکہ وہ ہر موقع پر اپنی خدمت بجا لانے کو تیار ہے۔فتح خان نے مزید کہا کہ خیر پور، حیدر آباد سے ہٹ کر سندھ کا ایک الگ حصہ ہے اور مجھ پر زور دیا کہ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں۔میں ان سب باتوں کے لئے پہلے سے ہی تیار تھا۔ کیونکہ میں اس کی پچھلی کوششوں سے ہی یہ جان گیا تھا کہ یہاں کے حاکم کا کوئی ایسا مقصد ہے جو وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔میں نے وزیر کو یقین دلایا کہ مجھے اس کے آقا کی توجہ کا پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے ہماری گفت وشنید کے بعد وہ مجھ سے اس مسئلے پر بات چیت ضرور کرے گا۔وہ مجھے خیر پور تک لے جانے کی غرض سے ایک پالکی بھی لایا تھا۔ہم اسی دن شہر جانے کے لئے چودہ میل کا سفر

طے کرنا شروع ہو گئے۔(اے۔برنس۔III،صفحات 67-66)

(8)

میں نے ولی محمد لغاری کے بارے میں بہت سنا ہوا تھا اور سندھ کے تمام طبقات اسے بڑی محبت سے یاد کرتے تھے۔ جب میں لاڑکانے میں تھا تو میں نے اس جگہ جانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کہ جہاں پر وہ کافی عرصہ صوبیدار رہا تھا۔ یہ شہر عمدہ دریا کے کنارے آباد تھا۔ یہاں پر کھجوروں کے جھنڈ تھے۔روزمرہ زندگی میں زیر استعمال اشیاء یہاں پر بہت سستی تھیں۔ پانی بہت عمدہ تھا۔آم کے درختوں نے تپتی گرمی کو یہاں کے باشندوں کے لئے ٹھنڈے ماحول میں بدل رکھا تھا۔اسی وجہ سے یہ لوگ ابھی تک یہاں آباد تھے۔سندھ میں ایک محاورہ مشہور ہے کہ

''Hoard abroad, but squander in Larkhanah''

یعنی خزانہ تو باہر ہے لیکن گنوانا لاڑکانہ میں ہے۔

سندھیوں کے درمیان نواب کے کردار کے بارے میں بعض مشہور باتیں قابل ذکر تھیں۔امیر اور کسان سب ایک ہی طرح سے اس کی خوبیاں کرتے تھے اور سندھ کے امیروں نے کبھی اس کے مشوروں اور اس کی اصلاح سے فائدہ اٹھانے میں سُستی نہ کی۔اس سردار کے بہت سے قصے مجھے ان لوگوں سے ملے جو اسے جانتے تھے۔ان کے خیال میں وہ بہت انصاف پسند اور عالم و فاضل شخص تھا۔ مندرجہ ذیل قصہ اس کے دوررَس سیاستدان ہونے کی دلیل ہے:

''جب محمد اعظم خان نے کابل میں اقتدار حاصل کیا تو اس نے بیس ہزار فوج مدد خان کی زیر قیادت سندھ کی جانب بھیجی تا کہ خراج کی بقایا رقم وصول کی جائے۔سردار نے شکار پور کے پاس ڈیرہ لگایا اور اپنا ایک آفیسر رقم کے مطالبہ کے لئے آگے روانہ کیا۔رقم کی ادائیگی سے انکار کر دیا گیا اور دربار حیدرآباد نے قوت کے بل بوتے پر افغان فوج کو واپس دھکیلنے کا منصوبہ بنایا۔آخری فیصلہ کرنے سے قبل امیروں نے لاڑکانہ سے ولی محمد خان کو بلایا۔اس نے رائے طلب کرنے پر امن کی تجویز پیش کی۔اس پر دربار میں سرداروں نے اسے ''سلام'' پیش کیا اور ولی رام یا ہندو کے خطاب نوازا۔کوئی بھی اس سے مرغوب نہ ہوا۔نواب نے اردگرد دیکھا اور امیروں سے پوچھا کہ ان کے نزدیک ایک تالپور شخص کے خون کی کیا قیمت ہے۔جواب ملا کہ ''بیش بہاء'' تجربہ کار ولی محمد نے جواب دیا کہ ''بہت خوب،

فتح تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔لیکن کیا تم میدان جنگ میں قسمت آزمانا چاہتے ہوں۔خواہ فتح ہو یا شکست ہو، یاد رہے کہ ہمارے بہت سے عزیز اگلے درباری اجلاس میں موجود نہ ہوں گے۔'' اس جواز کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ولی محمد کو امیروں نے فوراً ہی افغانوں کے پاس معاملات طے کرنے بھیج دیا۔نواب نے مدد خان سے مختلف انداز میں بات کی: ''کیا تمہارے لوگ پاگل ہیں جو ایک ایسے ملک میں داخل ہونا چاہتے ہیں کہ جہاں پر ستر ہزار تلواروں سے لیس بلوچ تمہارا استقبال کرنے کے لئے تیار ہیں۔تم چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو لیکن پہلے تم اپنے ہم وطن کی یہ نصیحت سن لو۔بے شک تم جانتے ہو کہ کابل کی طاقت ختم ہو چکی ہے اور وزیر پوری قوت کے ساتھ قبائل کو کچل رہا ہے۔تم ایک ایسے ملک میں ہو کہ جہاں پر تمہارا کوئی دوست نہیں ہے، اور اگر تم ہار گئے، جیسا کہ مجھے یقین ہے، تو پھر تم کبھی بھی کابل نہ دیکھ پاؤ گے۔تمہاری عزت قائم رکھنے کی غرض سے میں امیروں کی جانب سے تمہیں خرچہ آمدورفت مبلغ دو لاکھ روپیہ دلوائے دیتا ہوں۔'' مدد خان نے بات مان لی۔ایک لاکھ روپیہ موقع پر وصول کر لیا اور باقی رقم کے لئے رسید تیار کر کے کابل لے گیا۔(جے۔ووڈ، صفحات 6-25)

(9)

حسین علی کو چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنے ہواخواہوں کی ہدایات ماننی پڑتی تھیں۔البتہ وہ اپنے ولی کی قابل قدر معاونت کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔احمد خان سردار قبیلہ لغاری (ایک جاٹ قبیلہ) جو میر محمد کی وفات کے وقت اس کا وزیر اعظم تھا، وہ بہت اچھا شخص اور اپنی خاصیتوں کی وجہ سے ہندوستان کے سب سے زیادہ شان و شوکت والے دربار کا ہیرا کہلاتا تھا: بعد ازاں تالپور مجالس میں اس سردار اور اس کے پاس ولی محمد مرحوم کا اثر و رسوخ آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا اور اس نے دربار میں آنا ہی چھوڑ دیا پھر وہ زیادہ تر اپنی جاگیروں تک ہی محدود ہو گیا۔یہ جاگیریں بہت بڑی ہیں اور لاڑکانہ میں ہیں۔جب تالپوروں کا برا وقت تھا تب بھی اس کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔اس نے اس موقع پر بھی اپنی قربانی کو استعمال نہ کیا جب اس کے خاندان کے افراد نے اپنے دفاع کے لئے ہتھیار اُٹھا لئے تھے۔ شہزادہ حسین علی، احمد خان کی جانب بہت جارحانہ رویہ رکھتا تھا اور اس بات کا ذرا بھی احساس نہ کرتا تھا کہ یہ عمر رسیدہ شخص اس کے مرحوم باپ کا دوست ہے۔اس کے باپ ولی محمد کی سندھ میں بڑی شہرت تھی اور سارے ہی طبقات اسے اتنے اچھے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے کہ سندھ کے اس خاندان کے

ڈرامائی عروج وزوال میں آنے والے امیروں میں سے کسی کو بھی یاد نہ کیا گیا ہوگا۔ احمد خان کا ذاتی دوست ہونے کی حیثیت سے یہ مصنف ان شاندار لمحات کو یاد کرتا ہے جو اس نے حیدرآباد کے اپنے آخری دورے کے وقت اس کے ساتھ گزارے تھے، اور اس کی مہربانی ومہمانداری کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ اس کی عوامی خصوصیات اتنی زیادہ مشہور ہیں کہ اسے سندھی حکومت کے تمام کردہ حضرات میں سب سے اونچا مقام دیا جاتا ہے۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 8-207)

(10)

امیروں کے وزراء ولی محمد خان، اخوند بقا خان اور ایک ہندو مشتک رام تھے جو مسلمہ قابلیت کے لوگ تھے اور اپنے آقاؤں کے ماننے والے لیکن مذاکرات کا دورانیہ لمبا ہوگا، غیر دلچسپ اور بے سود بھی۔ باقی ماندہ قیام حیدرآباد کے دوران سفیر تو انہی کا ہو کر رہ گیا۔ ان کی نوعیت انتہائی نازک اور پیچیدہ تھی اور ان میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہ تھا اور چونکہ اب امیران سندھ اپنے ابتدائی احساس برتری سے باز آ گئے تھے لہٰذا مذاکرات محض سیاسی نوعیت کے رہ گئے تھے اور میرے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ ان کے نتائج حکومت ہند کو بے حد پسند آئے اور سفیر کو اپنے افسران بالا کی طرف سے اپنی مضبوطی، وقار اور صحیح قوت فیصلہ کے لئے خوب داد ملی جن کا اظہار ومظاہرہ اس نے احکامات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کیا تھا۔ ایک سندھی سفیر بھی مشن کے ساتھ آیا تا کہ معاہدے کی مصدقہ نقل حاصل کر سکے۔ (ایچ۔ پوٹنگر)

شکارگاہ

(1)

موجودہ شہزادے نے اپنے دو سے تین لاکھ کے درمیانی سالانہ مالیہ کے نقصان کو برداشت کرتے ہوئے حیدرآباد کے نواح میں سب سے زیادہ زرخیز علاقوں کو غیر آباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے وہاں پر اکثر پائے جانے والے ایک قسم کے جانوروں کے شکار میں بڑی دلچسپی تھی جسے کوساپاچا (Kosapacha) کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی اس کے سب سے چھوٹے بھائی نے اکیلے ہی قدیم ترین دیہات کے باشندوں کو وہاں سے نکال دیا اور گاؤں تباہ کر دیا

کیونکہ مرغوں کی بانگیں اور مویشیوں کا سبزہ چرنا اس کے بھائی کی جاگیر میں اس کے کھیل کو بہت خراب کرتے تھے۔(این۔کرو،صفحہ 22)

(2)

سردارنور محمد خان یہ چاہتا تھا کہ ہمارے وفد کے استقبال اوراس کی جانب سے حکومت برطانیہ کی تواضع کا کوئی خاص اثر قائم رہنا چاہئے۔ جب ہم اس کے دارالحکومت میں مہمان تھے تو ہماری بڑی خاطر تواضع کی گئی۔اس کے بعد جنوب کی جانب ہمارے سفر کا آغاز کیا گیا۔اس کی جانب سے ہمیں اس کی اوراس کے بھائی میر ناصر خان کی ہمراہی کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ سفر ہم کسی شکارگاہ کی جانب کر رہے تھے جو لکاٹ (Lakkat) میں تھی،اور حیدرآباد کے شمال میں ہمارے راستے میں آتی تھی۔

سندھ کے امیروں کی کھیلوں سے دلچسپی مشہور عام ہے۔اس ذوق کو پورا کرنے کی غرض سے دریا کے کناروں پر لمبے لمبے قطعات مخصوص کئے گئے تھے۔ جو اپنی فطری حالت میں آج بھی ہیں۔ایسا کرنے کے لئے امیروں نے کافی سختی کی ہوگی مگر میرا خیال نہیں کہ اس ضمن میں کافی ظلم سے کام لیا گیا۔اگر سندھ کی آبادی اپنی موجودہ تعداد سے دگنی بھی ہوتی تب بھی امیروں کے استحقاقات کو متاثر کئے بغیر ہی اس کی آبادکاری کے لئے کافی بڑی زمین موجود تھی۔ امیر جو استحقاقات رکھتے ہیں وہ صرف سندھ کے لئے ہی نہیں ہیں بلکہ اس طرح کے حامل معاشروں والی اکثر ریاستوں میں ایسا ہی ہے۔ ہمارے اپنے ملک کی تاریخ میں اس طرح کے جنگلات کے دشمن قوانین کی بڑی مثالیں ملتی ہیں۔ ہیوم ہمیں بتاتا ہے کہ شاہ انگلینڈ کے قبضے میں ارسٹھ جنگلات، تیرہ شکارگاہیں (Chases) اور سات سو کیاسی باغات تھے۔ یادرہے کہ سندھ کا کوئی امیر عوام کی زندگی سے کبھی نہیں کھیلتا۔

لکاٹ (Lakkat) کے اردگرد سارا علاقہ جنگل سے گھرا ہوا ہے جو کھیل کے لئے مخصوص ہے گاؤں پہنچنے پر امیروں نے ہم سب کو سبز رنگ کے جوڑے دیئے۔ان کے ملنے کے بعد ہمیں صبح کے لئے تیار ہو جانے کا کہا گیا۔اگلے روز صبح سویرے ہم میدان میں پہنچ گئے۔شکارگاہیں تکونی طرز پر بنی ہوئی ہیں اوراس طرح سے جڑی ہوئی ہیں کہ ایک قطع سے فرار ہو کے دوسرے میں پناہ لی جاسکتی ہے۔ اس طرح سے:___ خانہ نمبر 1 میں داخل ہو کر ہم نے اس کے نوک یا پتلے آخری کنارے میں بنی ہوئی سادہ سی قیام گاہ پر آرام کیا اور شکار شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ شکارگاہ کشادہ درختوں کا گھنا

جنگل تھی۔ ہمارے سامنے تقریباً 10 مربع گز کی کشادہ جگہ تھی، اور اس سے دو گنے فاصلے پر تنگ راستہ جنگل میں جاتا تھا۔ اس قطعہ کے مخالف سرے پر کچھ کتے بندھے ہوئے تھے۔ اگر ہم ان کی آوازیں سن لیتے تو پھر ہمیں زیادہ دیر بیٹھنا نہیں پڑتا تھا۔ جلد ہی بھیڑیئے نے خطرے کی گھنٹی بجائی لیکن اس سے صرف کتے ہی خوفزدہ ہوئے اور چالاک جانور بھاگ کر اگلی شکارگاہ میں چلا گیا۔ میر نور محمد دو بندوقیں لئے اس کے آگے بیٹھا ہوا تھا، اور بڑی بے تابی سے سامنے جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں ایک جنگلی سوءر موجود تھا۔ وہ چھپا ہوا ضرور تھا مگر اس کے دانت نظر آرہے تھے۔ امیر نے سر سے اشارہ کیا اور ایک بندوق کیپٹن برنس کو دے دی۔ ہمارے اس کمانڈر نے سو گز کے فاصلے پر ایک بوتل توڑی، نشانہ باز کی حیثیت سے اس کی مہارت اتنی نہ تھی کہ ایک بازو کے فاصلے پر اس جنگلی سوءر کو مار سکے۔ چند منٹ گزرنے کے بعد جھاڑیاں ہلنے لگیں، اور ایک ہرن باہر آیا۔ مگر فرار ہونے سے قبل ہی وہ نور محمد کی بندوق کی ایک گولی کا نشانہ بن گیا۔ یہ نشانہ بہت ہی اچھا تھا۔ (جے۔ ووڈ، صفحات 17-15)

(3)

مہینے میں ایک یا دو بار جب وہ سب صحت مند ہوتے ہیں تو وہ اپنی مختلف شکارگاہوں پر چلے جاتے ہیں جو کھیل کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ اس موقع پر کافی لوگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور پہلے سے یہ اعلان نہیں کیا جاتا کہ انہیں کس سمت میں جانا ہے۔ وہ اکٹھے ہو کر منصوبہ بناتے ہیں تاکہ ان کے علاقوں کی نگرانی بھی ہو جائے اور شکار بھی کھیل لیں۔ میدان میں ان کے ساتھ بھیڑیے، کتے اور دیگر جانور ہوتے ہیں۔ لیکن جس طریقے سے وہ لوگ کھیل کھیلتے ہیں وہ کبھی یورپی کھلاڑیوں کو راس نہیں آتا۔ وہ لوگ دھوپ میں کبھی باہر نہیں آتے بلکہ ہمیشہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے ہیں اور کسی ہرن یا خصی سؤر کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے سامنے آئے یا پھر وہ پانی پینے نکل آتا ہے تو اس وقت وہ اسے قصداً مار دیتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کی مبارک بادیں وصول کرتے ہیں۔

شکارگاہیں جنگل کے بڑے بڑے قطعات پر مشتمل ہوتے ہیں اور بڑی احتیاط سے ان کی حد بندی کی جاتی ہے۔ جب امیران کی جانب بڑھتے ہیں تو تمام کنویں جو ان کے خیموں یا بنگلوں کے سامنے ہوتے ہیں وہ بند کر دیئے جاتے ہیں ماسوائے ایک کنویں کے، کھیل اس وقت ہوتا ہے کہ جب

کوئی پیاسا جانور اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر باہر نکل آتا ہے۔بعض اوقات وہ دو شکارگاہوں کے ملاپ پر عارضی عمارتوں میں رہتے ہیں اور ملازمین جانور کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی جانب چلے جائیں۔یوں ان کو امیر شکار کر لیتا ہے۔

وہ لوگ گھوڑے پر سوار ہو کر شکار نہیں کرتے، ہاں کبھی کبھار اونٹ پر سوار ہو کر ہرن کا شکار کر لیتے ہیں۔ان کے علاوہ کسی اور شکار میں گولی چلانے کی اجازت نہیں ہوتی۔شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ دوران شکار ان کے عوام میں سے کوئی شخص مارا جائے۔خواہ وہ ان کی اپنی گولی کا نشانہ بنا ہو یا پھر جنگلی سؤر کے طیش کا۔ یہاں پر ایسے پرندوں کا بھی شکار ہوتا ہے جو زیادہ تر ترکستان یا کابل کے شمالی علاقہ جات سے لائے جاتے ہیں۔(جے۔ووڈ، صفحات 4-103)

(4)

امیر اپنے عوام کی طرح ہی جاہل ہیں۔ان کا زیادہ وقت شکار میں گزرتا ہے۔عوام اس کام سے اتنے متاثر ہو رہے ہیں کہ ملک کی آبادی روز بروز کم تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔میر فتح علی نے حیدرآباد کے قریب دریائے سندھ کے سب سے زرخیز اضلاع سے وہاں کے لوگوں کو نکال دیا۔ یہاں سے تقریباً دو لاکھ کا مالیہ وصول ہوتا تھا۔جبکہ میر مراد علی نے ایک بڑے دیہات کو بالکل تباہ کر دیا کیونکہ مرغوں کی بانگوں اور مویشیوں کے چرنے کی وجہ سے اس دیہات کے نواح میں واقع شکارگاہ میں شکار کے لئے بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ یہ دیہات اس کے بھائی کی ملکیت تھا۔اس شکارگاہ کے وسط میں ایک تالاب ہے۔ یہاں پر امیر ہمیشہ دیوار کے عقب سے شکار کرتے ہیں۔ جب لارڈ کین (Lord Keane) اس علاقے میں اپنی فوج کے ساتھ داخل ہوا تو اس کے تین افسران نے اسی طرح کی ایک عمارت پر قبضہ کر لیا جو درختوں کی شاخوں سے گھری ہوئی تھی۔ان تینوں نے یہاں پر رات گزارنے اور اگلی صبح شکار سے لطف اندوز ہونے کا منصوبہ بنایا۔لیکن دھوپ سے خشک ہونے والی اس کی لکڑی میں غالباً کسی منصوبے کے تحت آگ لگا دی گئی اور وہ تینوں شعلوں میں جل کر ختم ہو گئے۔

ہر امیر کی اپنی شکارگاہ ہے جس کا وہ بڑی شان سے دورہ کرتے ہیں۔ان کے ساتھ ان کے سردار اور ملازموں کی معقول تعداد کے علاوہ کتے اور عقاب بھی ہوتے ہیں۔وہ لوگ یا تو اونٹوں یا گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں یا پھر اپنی سرکاری کشتی میں دریا کے ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔راستے میں رہنے والے

لوگوں کو اشیاء کی فراہمی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ بعض لوگ شکار کے دوران گولی کا نشانہ بھی بن جاتے ہیں۔ یا پھر جانور انہیں چیر پھاڑتا ہے۔ شکار کے لئے امیر لمبی بندوقیں استعمال کرتے ہیں جن میں ہیرے جواہرات جڑے ہوتے ہیں، ان میں انگریزوں کے دیئے گئے تالے بھی لگے ہوتے ہیں۔ اگر کسی اجنبی کو ان کی شکاری ٹولی میں شرکت کی دعوت دے دی جائے تو یہ اس کے لئے بڑی عزت کی بات ہوتی ہے۔ (ایل۔ اور لچ۔ I، صفحات 7-96)

پانچواں باب

حکومت اور انتظامیہ

حکومت

(1)

تینوں ریاستوں کی حکومتیں دراصل فوجی استبدادی حکومتیں ہیں جس میں کوئی دوسرا عنصر شامل نہیں یہ متشددانہ ظالمانہ نوعیت کی ہیں۔ خیر پور اور میر پور میں یہ استبدادی حکومتیں اپنے اثر ورسوخ میں بہت وسیع ہیں۔ لیکن ریاست حیدرآباد میں بڑے سرداروں کی طاقت کافی حد تک قائم ہے۔ وہ اپنے مفادات اور جذبات کا تحفظ کر سکتے ہیں علاوہ ازیں امیر کی طاقت پر قابو رکھتے ہیں۔ البتہ سندھ میں قومیت کا کوئی جذبہ یا تصور موجود نہ ہے عوام میں بھی لوگوں کے کسی گروہ کے حوالے سے کوئی شدت نہیں پائی جاتی اور جب تک کہ کوئی ان کے مفادات کے خلاف کام نہ کرے، تب تک اعلیٰ طبقے کسی بھی ایسی کارروائی میں کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے جس سے ادنیٰ طبقات متاثر ہوتے ہوں۔ (ڈبلیو۔ پوٹنگر، صفحہ 17)

(2)

سندھی طرزِ حکومت کو جاگیردارانہ اصولوں پر قائم خالصتاً فوجی استبدادی حکومت قرار دیا جا سکتا ہے۔ امیر زمین کے مالک کی حیثیت سے پورے نظام کے سربراہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہر بلوچی یا پھر فوجی سردار کو جاگیر یا قطع اراضی ملا ہوا ہے اور اس کے عوض میں وہ خدمات سرانجام دینے کا پابند ہوتا ہے۔ جس میں حسب ضرورت ریاست کو مسلح افواج کی فراہمی شامل ہے۔ اس طرح سے ملک کا ایک بڑا حصہ بانٹ دیا گیا ہے اور یوں حکومت کی حمایت میں ہی جاگیرداروں کے مفادات شامل ہیں۔ جو خود کو امیروں سے الگ

نہیں کر سکتے۔اس طرز حکومت میں فوجی جاگیرداروں کو اول ترجیح دی جاتی ہےاور دیگر طبقات کو ثانوی درجہ یا حیثیت دی جاتی ہے۔امیر اپنے بھائی سرداروں کی منظوری کے بغیر بہت کم اختیارات استعمال کرتے ہیں،اور جب سرداروں کے مفاد کا تعلق ہوتو وہ کسی بھی وقت معاملات اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں،اور سندھ کے شہزادوں کو جنگ یا امن کی جانب دھکیل سکتے ہیں۔یعنی جو بھی ان کے عوام کے لئے مناسب ہو۔ تالپور اس سرزمین کے فاتح ہونے کی وجہ سے بڑے خطہ پر قابض ہیں۔ان کو سب سے پہلے جس کی طرف سے بھی امداد مل جائے وہ سختی سے اس کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں،اور اس کے بعد اپنی حیثیت برقرار رکھتے ہیں۔اگر وہ اس معاملے میں غلطی کریں تو جلد ہی ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ان سرداروں کی حیثیت یوں اختیاری بن جاتی ہے کہ اپنی جاگیروں کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا۔وہ اپنے اتفاق واتحاد پر انحصار کرتے ہیں۔(ٹی۔پوسٹن،صفحات 2-231)

مالیہ

(1)

تینوں اعلیٰ سرداروں کا حصہ ملا کر پورے سندھ کا مالیہ چالیس لاکھ روپیہ بنتا ہے جس میں سے میر فتح علی خان کا حصہ پچیس فیصد کے لگ بھگ ہے۔شاہ کابل کو دیا جانے والا سالانہ خراج دس لاکھ روپیہ ہے۔اس میں سے ساڑھے چھ لاکھ اسی کے ذمے ہوتے ہیں،اور باقی رہے میر سہراب اور میر ٹھارا تو میر سہراب کے مالیہ کا اندازہ گیارہ لاکھ لگایا گیا ہے اور میر ٹھارا کا چار لاکھ لگایا گیا ہے۔میر فتح علی اور اس کے بھائی کے خزانوں کا اندازہ بہت زیادہ لگایا گیا ہے۔ریاست کی حقیقی جائیداد اور کلہوڑہ خاندان کی جائیداد (جو ساری ہی ان کے ہاتھوں میں آ گئی) اس کے علاوہ بھی وہ اٹھارہ برس میں معاشی طور پر بہت زیادہ مضبوط ہو گئے ہیں۔لیکن جو کچھ وہ دولت کی شکل میں حاصل کرتے ہیں وہی کچھ انہیں عوام سے جذبے اور احساسات کی شکل میں نہیں ملتا۔جو ملک کا اصل سرمایہ اور حکومت کی قوت ہوتے ہیں۔ امیروں کے خزانے ان قلعوں میں محفوظ ہیں جو ریگستان یا صحرا میں قائم ہیں جہاں پر بہت سے زرخیز خطے ہیں اور بادشاہ کے سامنے شکست کی صورت میں یہ لوگ وہاں پر بھاگ کر پناہ لے سکتے ہیں یا پھر کسی اور ہنگامی حالت میں بھی وہاں جا سکتے ہیں۔امیر پیداوار کے ایک ثلث کی شکل میں دہقانوں سے مالیہ وصول کرتا ہے اور تاجروں و شہر کے پرچون فروشوں سے وہ الگ الگ قسم اور مقدار میں ٹیکس وصول

کرتا ہے یعنی جو بھی اسے اچھا لگے۔محصولات نفع بخش تو ضرور ہیں لیکن حکمرانوں کے مظالم اور ہنگامہ خیز حالات تجارت کو بہت تیزی سے تباہ کرر ہے ہیں۔ یہ بات سمجھنا حکمرانوں کے لئے بہت اہم ہے مگر حکمران اپنے دور سے ہٹ کر آگے کا کچھ نہیں سوچتے۔شہر کے ٹیکسوں کے علاوہ کراچی کے مالیہ کا تخمینہ اَسّی ہزار روپیہ لگایا گیا ہے۔ٹھٹھہ اور شاہ بندر جو کہ ایک ہی شمار ہوتے ہیں ان کا اندازاً مالیہ ایک لاکھ بیس ہزار اور حیدر آباد کا تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگایا گیا ہے۔امیر کا سب سے اہم حصہ دس لاکھ روپیہ کی رقم میں سے خراج کی شکل میں ادا کی جانے والی وہ رقم ہے جو وہ بادشاہ کو دیتا ہے اور جو ساڑھے چھ لاکھ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے۔ یہ ساری رقم وہ اجناس کی شکل میں نہیں دیتا بلکہ اس کا بڑا حصہ وہ ٹھٹھہ کی مصنوعات کی شکل میں دیتا ہے جس کو پہلے وہ خریدتا ہے اور اس کے بعد اپنی متعین شدہ قیمت پر فروخت کرتا ہے۔اکثر مشرقی ممالک کی طرح سے یہاں پر انصاف کی فراہمی اخراجات کی جگہ تنخواہ کا ذریعہ بن گئی ہے۔ مالیہ وصولی کی فیس مالیہ کا تقریباً ایک بٹہ پانچ حصہ ہے۔جس میں امیروں کے گھریلو اخراجات بھی شامل ہوتے ہیں۔(این۔کرو،صفحات 25-24)

(2)

سندھ کا مالیاتی نظام مجموعی طور پر تو سادہ اور آسان ہے مگر تفصیلی طور پر بہت پیچیدہ ہے۔اس کی سرکردہ خاصیت یہ تھی کہ زمینداری یا کھیتی باڑی یعنی جس کے تحت کوئی شخص زمین کے ایک خاص حصے کو کاشت کرنے کے لئے امیروں سے پٹے یا معاہدہ پر حاصل کرتا ہے تو مقررہ مدت کے لئے وہ ان شرائط کو طے کرتا ہے جن پر وہ کاشتکاری کے لئے زمین حاصل کرتا ہے۔ پیداوار کا شاہی حصہ (کیونکہ مالیہ کا بہت بڑا حصہ اسی جنس میں اکٹھا کیا جاتا ہے) یا تو ایک تہائی ہوتا ہے یا دو بٹہ پانچ یا ایک بٹہ پانچ ہوتا ہے۔اس حصے کی مقدار کا تعین کاشت شدہ زمین کی نوعیت کے حوالے سے ہوتا ہے۔ یوں زمین کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔پہلی زمین وہ کہ جن میں دریا کے ذریعہ کاشت کی جاتی ہے اس میں صرف چند ایک مصنوعی ذرائع کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوسری وہ جو دریا سے کچھ فاصلے پر ہوتی ہے اس کے لئے نہروں اور رہٹ کی ضرورت پڑتی ہے،اور تیسری بے کار زمین ہوتی ہے جس میں جنگل صاف کرنے یا زرخیزی کرنے کے لئے دیگر رکاوٹیں دور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس سے کم سے کم حد تک مالیہ لیا جاتا ہے تاکہ اسے قابل کاشت بنایا جاسکے۔اناج کی پیداوار سے ہٹ کر رہٹ پر الگ

صفیں عائد ہوتی ہیں کیونکہ اسے ایک یا دو بیلوں سے چلایا جاتا ہے یا پھر ہاتھ سے چلایا جاتا ہے۔ یہ بھی انفرادی کاشتکاروں پر خصوصی نوعیت کا ٹیکس ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیگر کوئی چھوٹے چھوٹے آئٹم بھی ہوتے ہیں جن کی وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ پٹے یا شرائط معاہدہ طے کرنے کے بعد جو کہ صرف سال پورا ہونے پر ختم ہوتی ہیں یا پھر دو فصلیں (بہار اور خزاں) مکمل ہونے کے بعد ختم ہوتی ہیں، تب زمیندار کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ زمین کے کسی حصے کو اپنے ہی زیر قبضہ کی اور فریقین کو زراعت کے لئے دے دے۔ لیکن وہ اکیلا ہی پورے مالیہ کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا۔ فصلوں کے اکٹھا کئے جانے کے بعد ایک حکومتی افسر اس کے تخمینہ کے لئے موجود رہتا ہے اور خرمان (Khirman) میں سے حکومت کا حصہ لیتا ہے۔ یہ اناج یا تو موقع پر ہی فروخت کر دیا جاتا ہے یا پھر اسے شاہی کوٹھیوں یا محلوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور ریاستی خزانہ میں رقم کی ادائیگی کے بعد اسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ اس کی قیمت ریاست کی جابرانہ خواہش کے مطابق ہوتی ہے۔ مگر پالیسی بنانے والا حکومتی اہلکار یہی کہتا ہے کہ منڈی کا جائز بھاؤ متعین کیا جا رہا ہے۔ اناج کی شمالی سندھ کے مقابلے میں جنوبی سندھ میں قیمت زیادہ ہے خاص طور پر خریف فصلوں کی، یوں اس کو کشتیوں کے ذریعہ دارالحکومت بھیج دیا جاتا ہے تا کہ مالکان کو بہت کم قیمت ادا کی جا سکے بلکہ بعض اوقات تو بالکل بھی ادا نہ کی جا سکے۔ زراعت کے اس نظام سے سندھ کی زمین دونوں طرح سے اچھی اور منافع بخش ثابت ہوتی ہے یعنی زمیندار کے لئے بھی اور مالیے کے لئے بھی۔ کم از کم مئوخر الذکر تو بہت کامیاب ہے اور اول الذکر بھی مطمئن رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ صرف محنت کشوں پر مشتمل نچلا طبقہ بمشکل اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ لیکن مشرق میں ان کی ضروریات اور خواہشات کی بھی حد ہوتی ہے۔ سندھ میں دیہاتی لوگوں کی اکثریت کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ ہے۔ جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

زمیندار کام کرنے والے لوگوں کو ہر معاوضہ ادا کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس آدمی کو بھی جو کہ اس کے اوزاروں کی مرمت کرتا ہے۔ یہ معاوضہ اناج کی شکل میں ملتا ہے جو ان کی پوری مدت ملازمت کے دوران ملتا جلتا ہے اور جب اس کا کھاتہ بند کیا جاتا ہے تو ریکارڈ پر سرکاری افسران کی جانب سے اس کے دستخط یا مہر لے لئے جاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اب وہ مطمئن ہے اور یوں آئندہ کے دفتری مسائل کا سدباب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ معاہدے کے دوبارہ اجراء کی اجازت کاردار (Kardar) یا پھر امیروں کا نائب دیتا ہے جو ضلع پر حکمرانی کر رہا ہوتا ہے۔

اگر زمین کا کوئی ٹکڑا بے کار یا بنجر ہو تو پہلے سال کے لئے بہت ہی کم ریٹ کا مالیہ مقرر کیا جاتا ہے جیسے ایک روپیہ فی جریب (Jurib) اور پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مالیہ بھی بڑھتا رہتا ہے۔ غیر اناجی پیداوار اراضی عام طور پر اس طرح سے کاشت کی جاتی تھیں جسے جمع یا لگان اراضی کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق کنوؤں سے کاشت ہونے والی موسم بہار کی فصلوں پر بھی ہوتا ہے، ان چیزوں کے استعمال کے لئے مخصوص فیس لی جاتی ہے جو کہ ان میں سے پانی کی مقدار نکلنے کے مطابق مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ خواہ کنواں عارضی ہو یا مستقل ہو۔فصلوں کو نقصان پہنچانے والے غیر مرئی اسباب کی صورت میں کرایہ خاص حد تک کم کر دیا جاتا ہے گو کہ یہ مالیہ کے افسران کی جانب سے سختی سے توثیق ہونے کی بناء پر ہی ہوتا ہے۔سندھ میں مزارع اور آزاد کسان کے مابین کاشتکاری کا پورا منصوبہ معمولی سا معلوم ہوتا ہے اور اسے کسی مضبوط حکومت کے قیام کے دوران ہی مساوی متوقع کیا جا سکتا ہے۔قلیل آبادی مقابلتاً قابل مالیہ زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا، کم ہوتی ہوئی امدادیں اور دیگر مسائل وغیرہ یہ سب اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ امیروں کی دولت کا یہ سب سے بڑا اور اہم ذریعہ جتنی جلدی ہو سکا تباہ ہو جائے گا بعض اوقات تو خراب حکومت اور لالچی نظریں ان لوگوں کو زمینداروں اور مزارعوں کے ساتھ ظلم روا رکھنے پر اُبھارتی ہیں۔اس صورت میں امیروں کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے خاص طور پر اول الذکر گروہ کی جانب سے کیونکہ ان کے اپنے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے، اور یوں ان کو قائم شدہ اقتدار کو ختم کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

باغات اور کھجور کے درخت بھی مالیہ کا ایک اور ذریعہ ہیں۔ جو مخصوص قیمت پر خاص موسم میں عائد کیا جاتا ہے یا پھر سالانہ ایک مخصوص رقم وصول کر لی جاتی ہے۔سندھ کے اکثر حصوں میں یہ چیزیں بہت پیسہ فراہم کرتی ہیں کیونکہ ان کی پیداواری قدر بہت زیادہ ہوتی ہے۔خاص طور پر جب یہ دریا کے قرب و جوار میں موجود ہوں۔مگر جب یہ کسی رقبہ یا کسی اہمیت کے شہر کے پاس موجود ہوں تو انہیں زرعی معاملات میں شامل کر لیا جاتا ہے۔(ٹی۔پوسٹن، صفحات 41-237)

محاصل

(1)

سندھ کے دیگر ذرائع آمدنی وہ ہیں جو تجارت یا صنعتوں، شہری یا سفری محاصل پر مشتمل ہیں۔اسی

طرح دوسرے ٹیکس بھی ہیں کہ جو چھوٹے چھوٹے عہدیداران وصول کرتے ہیں، اور محصول اراضی کی مانندان کی تفصیل بھی بہت پیچیدہ ہے لیکن مجموعی طور پران سب کا عمومی تذکرہ کرنا ہی کافی ہوگا۔ کراچی کی بندرگاہ پر تمام درآمد شدہ اشیاء کا چھ فیصد حصہ اور تمام برآمد شدہ اشیاء کا ڈھائی فیصد حصہ لیا جاتا ہے۔ شہر چھوڑنے پر مزید تین روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ اشیاء کا تذکرہ کئے بغیر ہی یہ بتادینا کافی ہوگا کہ ایک اونٹ پر لادے جانے والا تجارتی سامان، جیسے انگریزی ساخت کی اشیاء، ان پر جوادائیگی کرنی ہوگی اس میں سندھ کی زمین پر اُتارنے کے ساتھ سے لے کر سندھ کے شمال میں خشکی کے راستے آخری سرے تک پانچ روپیہ محصول یا 51.16s ادا کرنے ہوتے ہیں۔ جس میں اونٹ کرایہ پر لینے کے ضروری اخراجات، نگہبان کا معاوضہ اور سفر کے دیگر اخراجات شامل نہیں ہوتے ہیں۔ برطانوی حکومت کے ساتھ گزشتہ معاہدوں کے تحت دریائی راستوں پر تمام محاصل اور چونگیاں ختم کر دی گئی تھیں۔ خیال یہ تھا کہ بھاپ والی کشتی کے ذریعہ تجارت کا ایک راستہ کھل جائے گا۔ لیکن اسی طرح کی کوئی چیز سندھ کے کسی علاقے میں نہیں آئی۔ ان لوگوں کا مقصد ملک میں پہلے سے قائم شدہ محصولوں کے بارے میں تھا۔ شہری محاصل میں ہر شہر یا گاؤں کے دروازے پر، ہر قسم کی چیز پر ٹیکس وصول کرنا تھا۔ خواہ وہ خوراک کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں ہو۔ خواہ اونٹ پر ہو یا کسی اور جانور پر ہو۔ ہر قسم کی خرید وفروخت، یہاں تک کہ گندم اور بازاروں میں عام اشیائے خورد ونوش پر بھی محصول دینا ہوتا ہے جس کو ترازو یا پیمانے کا محصول کہتے ہیں۔ سفر کا محصول پورے سندھ میں طے شدہ مقامات پر ادا کرنا ہوتا تھا جو تجارت پر عائد شدہ محصول سے بھی زیادہ بھاری ہوتا تھا۔ اتنا کہ وہ تاجر جن کا سفر بہت بڑا ہوتا وہ ایک مخصوص شاخ تک چھوٹ کا خاص پروانہ حاصل کر لیتے تھے، بصورت دیگر ان کے لئے سفر جاری رکھنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ الکوحل اور نشہ آور اشیاء ریاستی معاہدوں یا اجازت ناموں کے تحت فروخت ہوتی تھیں۔ ہر کپڑا بننے کے آلہ سے مخصوص ٹیکس لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہر اس شے پر ہوتا تھا جو پیدا کی جائے یا محنت سے تیار کی جائے۔ نیز ہر قسم کے دوکانداروں اور کاریگروں پر بھی ٹیکس عائد تھا، مچھیرے اپنے جالوں میں آنے والی مچھلیوں کا ایک تہائی حکمران کو دینے کے پابند تھے، اور دریائے سندھ میں کرایہ پر حاصل کی جانے والی ہر کشتی پر بھی مخصوص ٹیکس تھا۔ فریقین کے مابین متنازعہ رقم کہ جس کا فیصلہ امیروں کے عدالتی افسران نے کیا ہو، اس رقم کا چوتھا یا ایک چوتھائی بھی آمدنی کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ نیز لٹیروں سے برآمد ہونے والی چوری کی ہوئی اشیاء میں

بھی اسی طرح کی حصہ داری کر لی جاتی تھی۔(ٹی۔ پوسٹن، صفحات 5-243)

فوج

(1)

سندھ کی مسلح افواج قبائل کے سرداروں اور جاگیرداروں کی زمینداری یا جاگیرداری کی وسعت کے مطابق تشکیل پاتی ہے۔فوج کو حکمران کی جانب سے صرف اس وقت تنخواہ دی جاتی ہے کہ جب اس سے باقاعدہ خدمات حاصل کی جاتیں۔تاہم حکمراں ان کی تعداد کو برقرار رکھنے اور خود کو ہنگامی حالت کے لئے تیار رکھنے کے لئے ماہانہ تنخواہ پر اپنے پاس فوج کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی مستقل رکھتا ہے۔اس کے علاوہ اس کے پاس تقریباً پانچ ہزار افراد، گھڑسوار اور پیادے بھی ہوتے ہیں جو غلاموں اور خدمت گزاروں میں سے ہوتے ہیں۔میرے لئے یہ بات کہنا بہت مشکل ہے کہ میر فتح علی خان تھوڑی سی دیر میں اور کسی بھی وقت پچیس ہزار جنگجو میدان میں لاسکتا ہے۔میں یہ بات البتہ صاف طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میر سہراب کی زیر کمان دس ہزار فوجی اور میر ٹھارا کے پاس ملک کے پانچ ہزار بہترین سپاہی ہیں۔ ویسے تالپور خاندان کے پاس پورے ملک میں چالیس ہزار سپاہی ہیں، اور عام جذبہ و جوش پیدا ہونے کی صورت میں یہ تعداد بہت زیادہ بھی بڑھ سکتی ہے کیونکہ ہر شخص مسلح ہوتا ہے۔لوگوں کے درمیان سب سے زیادہ مضبوط آدمی ایک بہترین سپاہی کو خیال کیا جاتا ہے۔کیونکہ ہمت تو ہر ایک کے پاس ہوتی ہے مگر حربے ہر کوئی استعمال نہیں کرسکتا۔ان لوگوں کے ہتھیار توڑے والی بندوقیں اور تلواریں ہیں۔ گھوڑے تھوڑے سے ہی ہوتے ہیں۔اب میں ملک کی مجتمع افواج کے بارے میں بتاتا ہوں۔یہ فوج پانچ ہزار کے قریب ہے اور ان میں سے زیادہ تر بہت کم تر اور حقیر ہیں۔لیکن پیش قدمی کرنے میں ان کے قدم پوری دنیا کی افواج کے مقابلے میں سب سے تیز چلتے ہیں۔میر فتح علی خان کے پاس منتخب شدہ توپ خانہ ہے جو زیادہ تر ان خریدی ہوئی یا تحفے میں ملی ہوئی اشیاء پر مشتمل ہے جو انگریزوں سے غلام شاہ کے ساتھ اپنے پرانے تعلقات کی بناء پر حاصل کی گئی تھیں (غلام شاہ بہت دوستانہ طبیعت کا مالک تھا)۔ان میں سے بہت سی پرتگیزی اور ڈچ طرز کی مصنوعات بھی ہیں۔اس کے پاس اس وقت اس اسلحہ کا استعمال کرنے والے ماہر لوگ تو نہیں ہیں البتہ ایک سرہنگ (Surhung)، ایک تندل (Tindal) اور کچھ مقامی ملاح (Lascars) ہیں۔کچھ انگریز بھگوڑے بھی ان میں شامل ہیں

بلکہ ایک یا دو یورپی بھی اس میں جلد ہی شامل ہو جائیں گے۔ کراچی، ٹھٹھہ اور حیدرآباد میں اچھی قسم کا بارود کافی مقدار میں بنایا جاتا ہے۔ (این۔ کرو، صفحات 26-25)

(2)

سندھی افواج زیادہ تر ان جنگجو قبائل کی فوجی بھرتی پر مشتمل ہوتی ہیں جو ملک کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں۔ بیالیس قبائل اپنے الگ الگ سرداروں کے ماتحت فوجی خدمات کے عوض زمینوں پر قابض ہیں اور ان زمینوں کے مالکان کی ضرورت کے وقت وہ جنگ میں فوجیوں کی ایک خاص تعداد فراہم کرتے ہیں۔

یہ تاریخ کی ایک انوکھی حقیقت ہے کہ اراضی کا یہی فوجی محصول اور اس کے نتیجے میں فوج کی تشکیل ہی سندھ کی مختلف فتوحات کے نتیجہ میں بہت وسیع ہوگئی ہے اور کچھ قبائل تو اب بھی انہی ناموں کے حامل ہیں جو نام ان کے سنہ 93ھ میں اسلامی فتوحات کے وقت تھے۔

مہم جوؤں کے بڑے بڑے گروہ جو مختلف ادوار میں بلوچستان کے پہاڑوں سے اُتر کر سندھ کی زیادہ زرخیز وادی میں چلے آئے (ان ہی میں سے ایک قبیلے سے سندھ کے موجودہ حکمران خاندان کا تعلق ہے) ان پر ہی جنگجو قبائل کا بہت بڑا حصہ شامل ہے۔ البتہ ان سے جٹ (Juth) اور جوکیا (Jokia) قبائل الگ ہیں جو ملک کے قدیمی باشندے ہیں اور نہ تو یہ مشہور ہیں اور نہ ہی قابل احترام سمجھے جاتے ہیں۔

اگر میر سہراب اور میر ٹھارا تعاون کریں تو سندھ کے امیر میدان جنگ میں چھتیس ہزار فوجی لانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ فوج بے قاعدہ رسالے (آٹھ سو سواروں کا دستہ) پر مشتمل ہے جو توڑے دار بندوقوں، تلواروں اور ڈھالوں سے مسلح ہوتی ہے اور جب کبھی بھی خطرناک حالات پیدا ہو جائیں تو وہ پیادہ فوج کا کام کرتی ہے۔ پوری سندھی فوج کے لئے یہ بات غیر معمولی نہیں ہے کہ وہ پیدل ہی دشمن کا سامنا کرے۔ بلوچیوں کو عام طور پر اچھا نشانہ باز سمجھا جاتا ہے لیکن ہمت اور نظم وضبط کے حوالے سے وہ دیگر اقوام کے مساوی اعلیٰ کردار سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ایک سپاہی کی تنخواہ بشمول اس کی دیگر ضروریات کے پانچ پیسہ یومیہ ہے۔ حالت امن میں اس کو روزانہ صرف ایک سیر چاول کا الاؤنس ملتا ہے۔

کلہوڑہ خاندان کی حکومت کے دوران سندھ کی آمدنی اَسّی لاکھ روپیہ تک پہنچ گئی تھی لیکن اب

موجودہ حکمرانوں کی سختی اور غفلت کی وجہ سے گھٹ کر بیالیس لاکھ اٹھتر ہزار یومیہ رہ گئی ہے۔ یہ رقم تالپور خاندان کے اراکین کے مابین تقسیم کردی جاتی ہے۔ اس رقم سے بارہ لاکھ کی وہ رقم نکال لی جاتی ہے جو کابل کے بادشاہ کو سالانہ خراج کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ (ایچ۔ ایلس، صفحات 7-8)

(3)

کسی بھی حوالے سے میری توقعات کے اتنا برعکس کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا جتنا کہ سندھ کی مسلح افواج کے بارے میں نکلا۔ کچھ عرصہ تک ''کچھ''(Cutch) کے علاقے میں قیام کے دوران ہونے والے حملوں اور فتوحات سے میں نے یہ خیال کیا تھا کہ حیدرآباد میں فوج کا بہت مضبوط دستہ موجود ہوگا۔ تاہم حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، اور ماسوائے بلوچیوں کے ایک چھوٹے سے دستے کے کہ جو اس قلعہ بند شہر میں فوجی قیام گاہ (Garrison) میں تعینات ہے۔ امیروں کے اسلحہ بردار تعداد میں بہت تھوڑے ہیں اور بظاہر حقیر نظر آتے ہیں۔ قبائل کے کئی سردار دربار میں ہی رہتے ہیں اور چند یوم کے اندر اندر ان سب کو اکٹھا کیا جاسکتا ہے اس طرح جس طرح کے ہمارے آباء واجداد اکٹھا کیا کرتے ہیں۔ نیز ان کے مختلف ملنے والے جو فارغ اوقات میں زراعت اور دیگر پُرامن پیشوں میں مصروف ہوتے ہیں، ان کو بھی اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت چالیس ہزار افراد کو مئوثر جنگی خدمات کے لئے اکٹھا کرسکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے کیپٹن سیٹون (Captain Seton) کی رپورٹ میں پڑھا ہے کہ ان کو یومیہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بات غلط ہے یا پھر گزرے وقتوں کی بات ہے کیونکہ میں نے گھڑسواروں کے بارے میں سنا ہے کہ انہیں ماہانہ کے حساب سے تیس روپے کی معقول تنخواہ ملتی ہے۔ کوئی ایسا موقع بھی تصور کیا جاسکتا ہے کہ جب پوری مسلمان آبادی اکٹھی اُٹھ کھڑی ہو۔ لیکن چونکہ دنیا کے اس خطے میں حب الوطنی کی کوئی پہچان نہیں اس لئے ماسوائے مذہب کے اور کوئی چیز اس خطے میں ایسی آگ نہیں لگاسکتی ہے۔ جو معمولی سے نتیجہ کے علاوہ بھی کچھ نتیجہ برپا کرسکے۔

اگرچہ امیروں کے آہنی احکامات نے ان کی عوام کے جنگجویانہ گروہوں کی آزاد طبیعت کو کچل دیا ہے اور اس صوبہ کے عمومی سکون وامن نے ان کی طاقتوں کو کچھ عرصہ کے لئے ماند کردیا ہے، لیکن پھر بھی وہ لوگ ایسے گروہ تصور کئے جاتے ہیں کہ جو کسی بھی ایسے مسئلہ پر ہتھیار اُٹھا سکتے ہیں جس سے انہیں کوئی

حمایت مل سکے یا پھر اس غارت گری سے کوئی فائدہ ہو سکے۔ جب بات چیت کا کوئی فائدہ نہ ہو سکے تو پھر جنگ ان کا نعرہ بن جاتی ہے اور یہ بات کہنا بے فائدہ ہی ہوگی کہ کتنی کم مدت میں وہ اپنی بربریت پر اُتر آتے ہیں۔ میدان جنگ میں سندھی سپاہی کسی نظم وضبط کا مظاہرہ نہیں کرتے، اور چونکہ اس کی تنخواہ بہت کم اور بعض اوقات تو غیر یقینی ہوتی ہے لہذا وہ فوج کی نقل وحرکت کے دوران راہ میں پڑنے والے دیہاتوں کے خرچہ پر اپنی اشیاء کی فراہمی کو اپنا استحقاق سمجھتا ہے۔ اسے بہادر اور محنتی تصور کیا جاتا ہے لیکن کسی اور علاقہ کی نسبت اپنے ہی ملک میں اس کی شہرت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سپاہی عوام کو یا پھر ایک دوسرے کو اپنی یا اپنے آباء واجداد کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ایک دوسرے کی کہانیاں بڑے صبر وتحمل سے سنتے ہیں۔ امیروں کی فوج جب اکٹھی ہوتی ہے تو تمام علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ایک گرد سے بھرا مجمع دکھائی دیتی ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ مہم جو شامل ہوتے ہیں کہ جو بلوچستان کے پہاڑوں سے اُتر کر آجاتے ہیں۔ ان قبائل میں سے ایک رندقبیلہ بھی ہے اور اسی سے حکمران خاندان اپنی اصل ونسل ملاتا ہے۔ (جے۔ برنس، صفحات 7-115)

(4)

لاہ (Lah) میں تعینات سپاہی ان اولین سندھیوں میں سے تھے جو میں نے کبھی دیکھے اور مجھے یہ ضرور بتا دینا چاہئے کہ میں ان کی شکل وصورت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بہت بے تکلف تھے اور آزادانہ طبیعت کے مالک تھے۔ یہ باتیں ہمیشہ یورپیوں کو خوش کر دیتی ہیں۔ ان کا کلاہ اور ٹوپیاں لحافی سوتی کپڑے کی بنی ہوئی تھیں۔ زیر جامہ نیلے رنگ کا تھا۔ ہر آدمی تلوار اور ڈھال اور توڑے دار بندوق سے مسلح تھا۔ (ای۔ ڈلہوسٹ۔ سفر نامہ، صفحہ 191)

پولیس

خیر پور کے علاقے میں پولیس بہت تیز ہے۔ ہر شہر کسی کوتوال کے زیر انتظام ہوتا ہے جس کے انتظام میں بیس چوکیدار اور دو منشی ہوتے ہیں ان کی تنخواہ بہت تھوڑی ہوتی ہے لیکن انہیں اناج کی ایک مناسب تعداد مل جاتی ہے اور کوتوال کو ہر گٹھے میں سے مٹھی بھر گھاس لینے کا بھی حق حاصل ہوتا ہے نیز ان تمام اشیاء کا بھی جو کہ اس کے بازار میں فروخت کے لئے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں (بازار

میں) موجود ہر دوکان سے ہر ماہ ایک پیسہ بھی وصول کرتا ہے۔ یہ وہ قانونی ذرائع آمدن ہیں کہ جن سے میر علی مراد کے دارالحکومت کا لارڈ میر فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے غیر قانونی ذرائع کی آمدنی اس آمدنی سے کہیں زیادہ ہوگی۔ (ای۔اے۔لانگلے۔II، صفحات 3-52)

تشدد

اکثر اوقات تشدد کا استعمال اس مقصد سے کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں سے کہ جنہوں نے اپنے بددیانت فوائد کی غرض سے رقم خورد برد کی ہو، رقم نکلوائی جائے اس کا استعمال فوجداری مقدمات میں اقبال جرم کرانے کی غرض سے بھی ہوتا ہے۔

ایک طریقہ کار یہ ہے کہ فریق کو چارپائی پر چت باندھ دیا جائے۔ پھر اس کے پیر نیچے کی جانب ایک رَسّی سے سختی سے باندھے جاتے ہیں۔ اس طرح سے شدید تکلیف دی جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ طریقہ بھی اقبال جرم کرانے کے لئے ناکافی ہو تو ان رَسیوں پر پانی پھینکا جاتا ہے۔ جو ان کو اتنا شدید سخت کر دیتا ہے کہ وہ اس بدقسمت متاثرہ شخص کی ہڈیوں تک کاٹتے چلے جاتے ہیں، اور اتنی تکلیف دیتے ہیں کہ وہ بیچارہ فوراً ہی اپنی رقم نکال دیتا ہے یا اس بات کا اقبال جرم کر لیتا ہے جو اس سے قبول کروانی ہو۔ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس نے اس جرم کا اقبال کیا ہے کہ جو اس نے کیا نہ ہو، اور یہ سب اس کی اس جسمانی طاقت کی بناء پر ہوتا ہے جو تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تشدد کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گرم کھولتے ہوئے لوہے کے سریئے کو آدمی کی رانوں کے بیچ میں لگایا جائے اور اسی دوران اسے ہاتھوں کے ذریعہ کسی اونچی جگہ سے باندھ کر رکھا جائے۔

البتہ سب سے عام طریقہ کار یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے کچھ بھنوروں (Beetles) کو ایک پیالی یا پرچ میں کر کے ملزم کی ناف پر رکھ دیا جائے اور اسے ایک کمر بند کی مدد سے سختی سے باندھ دیا جائے۔ بھنورے کوئی راہ نہ پا کر ناف میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے خوف اور دہشت سے ملزم فوراً ہی اقبال جرم کر لیتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹارچر کمشنروں کی رپورٹوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چند برس قبل تک اس انسانیت سوز ظلم کا استعمال کیا جاتا رہا تھا۔

ایک روز صبح جب میں اپنی سواری پر واپس آ رہا تھا تو میں نے خود اس بربریت کا نظارہ دیکھا جو مختیارکار (Mookhtyar Kar) کے کسی قابل عبرت بیچارے ہوتا سنگھ کو برداشت کرنی پڑی۔

خیر پور کے مین بازار میں میرے کوچوان نے مجھے کہا کہ ''دیکھو صاحب! یہاں ایک آدمی لٹکا ہوا ہے۔'' میں نے دیکھا تو وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ بظاہر شریف معلوم پڑنے والا ایک ہندو ایک ٹانگ سے لٹکا ہوا تھا۔ جس پر اس کے پورے جسم کا وزن تھا۔ اس کا سر نیچے کی جانب تھا، اور اس تکلیف دہ صورت حال میں امیر کے تین یا چار روہیلے پٹھانوں نے اسے اسی طرح سے رکھا ہوا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ تین دیگر اشخاص کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تھا یہاں تک کہ انہوں نے رقم ادا کر دی۔ تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ یہ لوگ عوامی ٹھیکیدار ہیں جو لگان کی پوری رقم ادا کرنے میں ناکام رہے کیونکہ اناج کا ایک بڑا حصہ جنگلی سؤروں نے تباہ کر دیا تھا اور ان کی یہ سزا تب تک چلتی رہے گی جب تک کہ وہ کیا ہوا معاہدہ پورا نہ کر دیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس نظارے نے مجھے کافی بددل کر دیا البتہ میں نے دیکھا کہ بازار میں چلنے والے لوگ اس جانب بہت کم توجہ دے رہے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد میں نے سنا کہ نادہندگان کی ہمت جواب دے گئی اور انہوں نے مطالبہ شدہ رقم کی ضمانت جمع کرادی یعنی بیس ہزار روپیہ جمع کرایا۔ (ای۔اے۔لانگلے۔II، صفحات 2-50)

کڑی آزمائش

امیر آگ اور پانی سے کڑی آزمائش کا طریقہ اکثر ثبوت نہ ملنے کی صورت میں استعمال کرتے ہیں۔ ''پانی کی آزمائش'' میں ملزم کو ایک کنویں میں لٹکایا جاتا ہے اور اس کا سر پانی میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی لمحے ایک مضبوط آدمی ایک کلہاڑا اتنی دور پھینکتا ہے کہ جتنی دور تک وہ گر سکے۔ اس کے بعد اس کو اُٹھانے کے لئے دوڑتا ہے۔ اگر ملزم تب تک پانی میں رہے کہ جب تک کلہاڑا اُٹھا کر واپس نہ لے آیا جائے جس کا پتہ ایک رسا لہرانے سے چلتا ہے۔ تو اس طرح ملزم بے قصور تصور کیا جاتا ہے، لیکن اگر وہ کلہاڑا واپس آنے سے ایک لمحہ پہلے بھی اپنا سر اُٹھا لے تو اس کو مجرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ میں نے خیر پور میں وہ کنواں دیکھا ہے کہ جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ زیادہ برس نہیں ہوئے یہاں پر یہ کارروائی کی جاتی تھی۔

آگ کی آزمائش میں ایک خندق کھودی جاتی تھی۔ جو سات مکعب لمبی اور لکڑی کی آگ سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں آگ جلائی جاتی ہے اور ملزم کو اپنی ٹانگوں پر سبز پتے لپیٹ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک شعلوں کے اوپر سے گزرنا ہوتا ہے۔ بغیر زخمی ہوئے اس کا گزر جانا اس کے بے گناہ ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔

سرخ کھولتے ہوئے لوہے کا اُٹھالینا بھی اسی طرح کے ثبوت کے لئے قابل قبول ہے۔

بالوں کو صاف کر کے مجرم کو گدھے پر بٹھا کر اس طرح گھمانا کہ اس کا منہ دم کی جانب ہو۔ یہ ہم جنسی پرستی کو دبانے کی ایک سزا ہے۔(ای۔اے۔لانگلے،صفحات 56-55)

عدلیہ

جرائم کا فیصلہ کاردار کرتے ہیں اور قرآن پاک و فاضل مفتیوں کی تشریحات پر مبنی قانون کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔لوگوں میں انصاف کے حوالے سے کافی خوف و ہراس پایا جاتا ہے کیونکہ سندھ میں قانون کے ذرائع واضح نہیں ہیں۔بعض اوقات کاردار بھی لاعلم اور متعصب شخص ہوتے ہیں، اور تنخواہ کی کمی لازمی طور پر ان کو بدعنوانی میں ملوث کر دیتی ہے۔امیر سخت سزاؤں کے لاگو کرنے پر متنفر ہیں۔ بہت زیادہ بدنام مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ جیسے بائیں ہاتھ کا کاٹ ڈالنا یا ناک اور کانوں کا کاٹنا۔بعض اوقات تو یہ سزائیں بھی عمر قید میں تبدیل کر دی جاتی ہیں اور اس منظر کی مثال ٹھٹھہ میں ایک بدقسمت مصیبت زدہ کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جو بیس برس سے لکڑی کے پنجرہ میں بند ہے۔ وہ بہت سفاک اور بے حس شخص تھا۔ درحقیقت تالپور حکمران ظلم کے الزام سے بری الذمہ ہیں، اور اس معاملے میں اپنے عوام پر حاکم مطلق اور غیر تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود تعریف کئے جانے کے حقدار ہیں۔حکمران جن لوگوں کو نیک سمجھتے ہیں دراصل وہ بھی بلوچیوں کی طرح ہیں یعنی ان کے عوام میں سب سے زیادہ بے چین اور آوارہ لوگ۔قرابت داری کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اگرچہ سزا دہی یا جزا دینے میں وہ لوگ کسی جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔اس طرح کی پالیسی قابل گرفت ہے۔ یہ محض غیض وغضب کا ہی نتیجہ ہے کہ سندھ میں جرائم دیگر علاقوں کی نسبت بہت کم ہوتے ہیں حالانکہ قانون کی حکمرانی بھی نہ ہے اور پولیس کا شعبہ بھی نہیں ہے اوپر سے حکمران بھی غافل ہیں۔عام طور پر علاقہ کی وسعت کے حوالے سے زندگی اور جائیداد کی حفاظت بہت کم ہو جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنا محافظ خود ہے۔ ہر شخص مسلح رہتا ہے اور تشدد سے نمٹنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ملک کے ان علاقوں میں کہ جہاں آبادی نہیں ہے یا خانہ بدوش قبائل آباد ہیں وہاں پر سندھ کے رہنے والوں کو تحفظ کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان پر ایک دم حملہ ہوسکتا ہے۔لیکن یہ بات بھی سب علاقوں میں نہیں ہے بلکہ صرف کچھ علاقوں تک محدود ہے۔امیر دارالحکومت میں عدالتیں لگاتے ہیں اور یہاں

پر بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ ماتحت فیصلے بدعنوانی پر مبنی ہیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ مدعی اور مدعاعلیہ دونوں نے ہی مقدمہ لڑنے کے لئے بھاری رقوم ادا کی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ میر غلام علی تالپور انصاف سے لگاؤ میں بہت مشہور ہے اوراس کا خوب انتظام کرتا ہے۔لیکن اپنے سے پہلے یا بعد میں وہ اپنے خاندان میں اس طرح کا واحد شخص ہے۔(ٹی۔پوسٹن،صفحات 3-251)

اوزان اور پیمانے

سندھ میں استعمال ہونے والے اوزان اور پیمانے خیرواہ(Khirwah) کے حساب سے ہوتے ہیں جو تقریباً 834lbs انگریزی وزن کے برابر ہے اوراناج تولنے کے لئے اس کو مقدار میں پھر سے دو دو ''کاسوں'' (Kasahs) اور توین (Toyans) میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ان کی حقیقی مقدار کا معلوم کرنا مشکل ہے اوراناج کی پیمائش کے حوالے سے بھی یہ کافی مختلف ہیں۔ مائع اشیاء کا اندازہ وزن کر کے کیا جاتا ہے اور یوں خیرواہ تقریباً 600lbs کم ہو جاتا ہے۔

زمین کی پیمائش مکعب(Cubit)، گندھا(Gandha) اور جریب(Jurib) سے کی جاتی ہے۔

5 مکعب (18 انچ)...... سے ایک گندھا بنتا ہے۔

20 گندھا...... ایک جریب۔

ایک جریب مساوی ہے...... 150 فٹ کے۔

جس سے 22,500 مربع فٹ بنتا ہے۔

کرنسی کے طور پر عموماً کمپنی کا رائج روپیہ ہی استعمال ہوتا ہے جس کو کلدار (Kuldar) کہا جاتا ہے۔شمالی سندھ میں سہراب اور شجاولی بھی رائج ہیں۔ کمپنی کے رائج روپیہ سے مقدار میں اول الذکر ایک فیصد کم ہے اور مؤخرالذکر ڈھائی فیصد کم ہے۔جنوبی سندھ میں کوراہ(Korah) اور کاسم (Kassam) رائج ہیں۔ان میں سے پہلا کمپنی کے رائج روپیہ سے 25 فیصد اور دوسرا تقریباً نصف روپیہ کم ہے۔(ٹی۔پوسٹن،صفحات 82-281)

انتظامی عہدیداران

امیروں نے اپنے مفادات کے بہتر تحفظ کی خاطر پورے ملک میں اور مختلف صوبوں اور اضلاع

میں نائب یا کاردار رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پاس ماتحت عہدہ داروں کی معقول تعداد ہے جو منشی کہلاتے ہیں اور جن کا کام ہر اس جگہ پر آمدنیوں کا معقول حساب کتاب رکھنا ہوتا ہے جہاں پر حساب کتاب نہ رکھا گیا ہو نیز وہ دیگر معاملات بھی طے کرتے ہیں۔ یہ منشی عام طور پر ہندو اور دیگر ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر امیر کے پاس اس قسم کا ایک خاص نمائندہ ہوتا ہے۔ امیروں کی تعداد کے مطابق ہر شہر کے عموماً سات یا چھ حصے ہوتے ہیں جن پر ہر ایک کا قبضہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے منافع جات اور شہری مالیہ میں ایک عجب پریشانی کھڑی ہو جاتی ہے لیکن چونکہ امیر اعلیٰ کے ملازم کو اس کا التواء یا اختلاف پیش کر دیا جاتا ہے یا پھر اگر اس شہر میں ہی اس کا حصہ سب سے بڑا ہوتا ہے تو اس طرح تنازعات طے کر لئے جاتے ہیں یا اس میں ناکامی کی صورت میں دربار کے فیصلے کی پابندی کی جاتی ہے۔ پولیس بھی ان افسران کے ماتحت ہوتی ہے۔ سندھ میں پولیس یقینی طور پر بہت محدود پیمانہ پر ہوتی ہے یعنی بڑے بڑے شہروں میں درجن بھر محدود طور پر مسلح اور گھڑ سوار افراد کا گروہ۔ تاہم ہر دیہات یا علاقہ میں چوری کئے ہوئے مال کی ذمہ داری کی کھوج لگا ہی لی جاتی ہے اور اس کا ثبوت حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ چوری کی ہوئی اشیاء کا کھوج لگانے کا یہ طریقہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں رائج ہے، اور سادہ ہونے کی وجہ سے بہت مؤثر ہے۔ البتہ اس کام کو تب ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے کہ جب قدموں کے نشان پر تلاش کرنے کی کارروائی اس طرح سے مکمل کی جائے جس طرح سے اس ملک میں ہوتی ہے۔ اگر کسی ڈاکے کی اطلاع اس کوتوال یا مجسٹریٹ کو معقول وقت کے اندر اندر دی جائے کہ جس کے علاقے میں وقوعہ ہوا ہو تو مجرم ناگزیر طور پر پکڑا ہی جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوتی ہے جو خود اپنے علاقے سے باہر راستوں میں تلاش نہیں کر سکتے ہیں۔

مشرقی ممالک میں غروب سورج کے ساتھ ہی تمام شہروں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ماسوائے کسی خاص ہنگامی حالت کے رات شروع ہونے کے بعد کوئی مسافر سفر نہیں کرتا اور نہ ہی شہر کے مقامی باشندوں میں سے کوئی اپنی رہائش سے باہر نکلتا ہے لہٰذا جو لوگ بھی باہر سڑک پر نظر آتے ہیں ان کو شک و شبہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس طرح ان کو ہی ذمہ دار تصور کیا جاتا ہے۔ ایک کوتوال یا چھوٹے درجہ کے مجسٹریٹ کو ہی ہر اہم مرتبہ و معیار کے جلسہ میں سب سے زیادہ حیثیت دی جاتی ہے۔ اس کے پاس پولیس کا انتظام ہوتا ہے۔ وہ ملزموں کو چھوٹی سزائیں دینے کے لئے چھوٹی عدالتیں لگانے کا انتظام بھی کرتا ہے۔ بلوچیوں اور مقامی باشندوں پر مشتمل سندھی لوگ بہت ماہر چور

ہیں اور اس بات کا تجربہ اس ملک میں گزرنے والے تقریباً ہر مسافر کو ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ڈاکوؤں کو تلاش کرنے میں بھی بہت ماہر ہیں۔ ایک اجنبی کسی شہر یا گاؤں میں آنے کے بعد کسی بھی چوکیدار کو ملازم رکھ سکتا ہے اور اگر اس حالت میں بھی اس کا مال چوری ہو جائے تو وہ گاؤں ذمہ دار تصور ہوتا ہے البتہ کسی اور کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ ہر گاؤں یا چھوٹی جگہ کا ایک نمبردار ہوتا ہے جو وہاں کا سب سے زیادہ صاحب اختیار شخص ہوتا ہے اور وہاں کے باشندے اس کی نگرانی بھی کرتے رہتے ہیں۔ (ٹی۔ پوسٹن، صفحات 50-48)

دیہی انتظام

مستقل دیہی اور ضلعی عہدیداران ارباب، مکھیا اور کولار (Kolar) ہیں۔ ارباب گاؤں کا موروثی نمبردار (Head-man) ہے۔ وہ اپنے دیہات کے کاشتکاروں سے پیداوار کی تقسیم کے موسم میں اناج میں سے کچھ حصہ وصول کرتا ہے۔ مکھیا سماج کے ہندو حصے کا سربراہ ہوتا ہے اور وہ عام طور پر ہندوؤں کے ہی گھر کے کام کاج کرتا ہے نیز وہ ان کے تجارتی امور کا مشیر بھی ہے۔

کولار موروثی افسران ہیں۔ وہ عام پیداوار میں سے اناج کا ایک چھوٹا سا حصہ وصول کرتے ہیں اور ان کی ذمہ داری شہری امور میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دیہات کی حدود سے آگاہ ہوتے ہیں اور جب کبھی بھی ضرورت پڑے تو وہ حدود کی نشاندہی کرتے ہیں۔

سندھ میں حکومت کی جانب سے جو اوزان اور پیمانے رائج ہیں ریاست خیر پور میں ان سے اختلاف کیا جاتا ہے۔ (ای۔ اے۔ لانگلے۔ II، صفحہ 39)